بلوچ قوم اور اس کی تاریخ

نور احمد خان فریدی

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

©جملہ حقوق بحق بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

(انٹرنیٹ ایڈیشن)

کتاب کا نام : بلوچ قوم اور اس کی تاریخ

مصنف : نور احمد خان فریدی

بار اوّل : 2014ء

پرنٹرز : یونائیٹڈ پرنٹرز کوئٹہ

قیمت : 300/-

ISBN: 978-969-9768-33-0

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ
لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ O

"لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے، تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو (اور) خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ بیشک خدا سب کچھ جاننے والا (اور) سب سے زیادہ خبردار ہے"۔

سردار کوڑا خاں جتوئی کے نام !

اے بلوچوں کی زمیں!

سید کامل القادری

اے بلوچوں کی زمیں، اے شیرنر کی چھاونی تختۂ گلزار جنت ، رزم گاہ زندگی !
تجھ سے میری آبرو ہے مجھ سے تیری آبرو شمع سے پروانہ ہے، پروانے سے ہے روشنی
اور ہی کچھ رنگ ہے تیرے قتیل ناز کا ورنہ اٹھ جاتی جہاں سے رسم و راہ عاشقی
دست ہمت لکھ رہا ہے آج اک ایک تاریخ نو وہ اٹھی شمشیر چاکر ، وہ چھٹی لو تیر گی
سرنگوں بیٹھے ہوئے کیا ہو قفس کو لے اُڑو اے اسیران چمن، پھولوں کے لب پر ہے ہنسی
بُعد منزل سے خطر کیوں، بُعد منزل کچھ نہیں شرط اوّل غیرت قوم و وطن، حفظ خودی
کیا یہ لازم ہے کہ تیری انجمن کا رخ کرے
کاملؔ صحرا نشیں ، نورِ نگاہ عاشقی!

لڑے

1۔ بلوچ قوم اور اس کی تاریخ 8
2۔ میر گوہرام لاشاری کی آخری آرام گاہ 9
3۔ عہد نامہ مابین رند و لاشار 17
4۔ عہدنامہ ——— میر چاکر اعظم رند 19
5۔ عہدنامہ ——— میر گوہرام 21
6۔ افتتاحیہ 28
7۔ تقریب 31
8۔ تعارف 50
9۔ بلوچی حسب نسب 53
10۔ اَلبلُوش وَالاکرَاد (عربوں کی نظر میں) 75
11۔ بلوچ اقوام کا تاریخی پس منظر 80
12۔ وادی البلوص 92
13۔ سندھی اقوام کا بلوچوں میں ادغام 104
14۔ بلوچ اسلامی لشکر میں 115
15۔ بلوچ کرمان کی وادیوں میں 123
16۔ منزل بہ منزل 165
17۔ میر قنبر بروہی 169

18۔ مکران 176
19۔ میر جلال خان 211
20۔ میر جلال خان کی اولاد 219
21۔ چاکر اعظم 237
22۔ بلوچوں کا پاک و ہند میں داخلہ 271
23۔ پنجاب میں بلوچی سلطنت کا قیام 286
24۔ ہمایوںؔ بلوچوں کی پناہ میں 313
25۔ چاکر اعظم کے لمحات آخر 321
26۔ خوشاب 333
27۔ فرخ نگر 347
28۔ بہادر گڑھ 364
29۔ ساہیوال 372
30۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان 383
31۔ ڈیرہ فتح خان 391
32۔ منکیرہ 395
33۔ ڈیرہ غازی خان 409
34۔ میر ہوت 429
35۔ کتابیات 439

بلوچ قوم اور اس کی تاریخ

برصغیر کے ممتاز مؤرخ و محقق مولانا نور احمد خان فریدی مرحوم نے تاریخ اور صوفیائے کرام سے متعلق متعدد کتب تصنیف کیں۔ جن میں مشائخ سہرورد ''حضرت بہاء الدین زکریا''، ''حضرت صدر الدین عارف'' اور ''حضرت شاہ رکن عالمؒ'' کی سیرت اور تعلیمات، حضرت خواجہ غلام فرید کی سرائیکی صوفیانہ شاعری کا اُردو ترجمہ و شرح (دو جلد) اسلامی افسانے (دو جلد) تاریخ ملتان (دو جلد) کے علاوہ ''بلوچ قوم اور اس کی تاریخ''، ''چاکر اعظم''، ''سندھ کے تالپور''، ''بلوچ فرما نروا'' ان کی قابل قدر تصانیف ہیں۔ جن کو پاک و ہند کے علمی و ادبی حلقوں میں زبردست پذیرائی حاصل ہوئی۔ انہوں نے 1957ء میں ماہنامہ ''بلوچی دُنیا'' کا اجراء کیا جو گزشتہ نصف صدی سے بلوچوں کی علمی ادبی اور سیاسی و سماجی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔

مولانا نور احمد خان فریدی مرحوم نے بلوچ تاریخ پر نہایت عالمانہ بحث اور تحقیق کی ہے۔ ان کی تصنیف ''بلوچ قوم اور اسکی تاریخ'' بلاشبہ بلوچ قوم کے لئے بیش بہا عطیہ اور تحفہ ہے۔ جسے بلوچ حلقوں میں بے حد پسند کیا گیا۔ ''بلوچ قوم اور اس کی تاریخ'' ایک عرصہ سے نایاب ہو گئی تھی۔ اس کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر ''بلوچی اکیڈمی کوئٹہ'' نے اسے شائع کرنے کا اہتمام کیا جو بلوچوں کی تاریخ پر تحقیق کرنے والوں کیلئے رہنمائی کا ذریعہ رکھتی ہے۔

میر گوہرام لاشاری کی آخری آرام گاہ

"ملک کے ممتاز مؤرخ و محقق ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کی تحقیق کے مطابق میر گوہرام خان لاشاری کی قبر ضلع دادو (سندھ) میں واقع ہے۔ قبر کا عکس اور تحقیقی مقالہ کیلئے ڈاکٹر بلوچ کے شکر گزار ہیں۔"

نویں صدی کے آخر اور دسویں صدی ہجری (۱۵ ویں صدی عیسوی) کے شروع میں میر چاکر رند اور میر گوہرام لاشاری بلوچستان ، سندھ اور جنوبی پنجاب کی تاریخ کے نمایاں کردار تھے۔ میر چاکر درہ بولان سے فتح پور تک کے علاقہ میں رند قبائل کے سردار تھے اور میر گوہرام درہ مولا سے گاجان اور گنداواہ اور جنوب کی طرف والے علاقہ میں لاشاری قبائل کے سردار تھے۔ آباء واجداد کی نسبت سے دونوں بلوچ تھے اور آپس میں بھائی تھے (رند و لاشار مُبنا براثیں) لیکن اختلافات پیدا ہوئے تو تیس سالہ جنگ لڑ کر انہوں نے اپنی قبائلی طاقت کو ضائع کر دیا۔ چنانچہ میر چاکر دل برداشتہ ہوئے اور سبی کو چھوڑ کر ملتان کی طرف چلے گئے۔ ادھر میر گوہرام مولا اور گنداواہ کو چھوڑ کر سندھ میں نیئں گاج کے علاقہ میں نوحانی قبائل کیساتھ جا کر مقیم ہوئے۔

تاریخ طبقات اکبری (تصنیف نظام الدین بخشی) اور دوسرے ماخذوں سے ثابت ہے کہ میر چاکر سبی چھوڑ کر ملتان آیا۔ اس وقت سلطان محمود لانگاہ (۱۵۲۴ء) ملتان کا حکمران تھا مگر جام بایزید سمہ نے (جو سندھ کے نظام الدین کا عزیز مگر مخالف تھا اور لانگاہوں کی طرف داری سے یہاں پر متمکن تھا) میر چاکر سے معاہدہ کر کے ان کو ست گھرہ جاگیر کے طور پر دیا جہاں میر چاکر نے اپنی ریاست قائم کر لی۔ وہ اتنا طاقتور تھا کہ شیر شاہ سوری (ف 1545ء) کے سپہ سالار ہیبت خان نے ان سے ملتان کے بلوچوں کیخلاف مدد مانگی۔ سنہ 962 ہجری 1555ء میں میر چاکر اور

ان کے بیٹے شہداد نے اپنی چالیس ہزار فوج سے ہمایوں کی مدد کی اور اس نے دہلی کو فتح کرلیا۔ اس وقت میر چاکر کی عمر نوے سال کے قریب کے تھی۔ اس کے بعد جلد ہی میر چاکر فوت ہوئے اوران کوست گھرہ میں دفن کیا گیا اور مزار پر پُر شکوہ مقبرہ تعمیر کرایا گیا جو اس وقت آثار قدیمہ کے طور پر موجود ہے۔ یہ مقبرہ ست گھرہ سے مشرق گوگیرہ میں موجود ہے۔ مغلوں کے بعد سکھ پنجاب پر قابض ہوئے تو انہوں نے مغلیہ دور کے امیروں سے معاندانہ رویہ اختیار کیا چنانچہ سکھ افسر قمر سنگھ نے یہاں چار ایکڑ زمین کی اراضی پر قلعہ بنوایا اور میر چاکر کے مقبرہ کو اس قلعے کا ایک برج کر دیا۔ مزید یہ کہ مقبرہ کا اوپر والا گنبد گرا کر اندر والی تربتوں کے اوپر مٹی بھروا دی اور اوپر مرکز میں سکھوں کا خاص نشان ''ہشت پہلو مینار'' تعمیر کروایا جو گنبد کی سطح سے اوپر نکلا ہوا تھا۔ 1957ء میں راقم کو یونیسکو سے تفویض شدہ ایک ثقافتی منصوبہ پر تحقیق کے سلسلے میں جب ملتان سے منٹگمری (ساہیوال) جانے کا اتفاق ہوا تو میر چاکر کے مقبرہ کو دیکھنے کے لئے ست گھرہ پہنچا۔ اس وقت جو صورتحال نظر آئی اس کو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اوپر سے گنبد ٹوٹا ہوا تھا اور مقبرہ کے اندر درمیان میں ہشت پہلو مینار تھا اور مزارات نظر نہیں آرہی تھیں۔ وہاں کے ایک بزرگ پیر نادر علی شاہ جیلانی (عمر 75 سال) سے مل کر حالات معلوم کیے تو انہوں نے حقیقت بیان کی۔ میں نے شکستہ مقبرہ کا فوٹو اتارا اور شعبہ آثار قدیمہ پاکستان کو لکھا کہ اس کی تفتیش کریں اور نیچے سے مزارات کو ظاہر کریں۔ کچھ دنوں کے بعد مجلہ ''بلوچی دُنیا'' ملتان کے مدیر محترم مولانا نور احمد خان فریدی مرحوم حیدر آباد تشریف لائے تو ان سے شکایت کی کہ نئے آزاد ملک پاکستان میں یہ ماضی والی معاندانہ صورتحال تبدیل ہونی چاہیے۔ انہوں نے بلوچی دُنیا مارچ 1958ء) کے سرورق پر مقبرہ کا فوٹو شائع کر دیا اور جب جناب عطا محمد خان لغاری ملتان کے کمشنر تھے تو انہوں نے شعبہ آثار قدیمہ کی معاونت سے مقبرہ کی ماضی والی صورت تبدیل کروادی اور میر چاکر اور عزیزوں کی قبریں ظاہر ہوئیں۔

میر گوہرام کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ وہ سندھ (ٹھٹھہ) چلے گئے اور وہاں سے انہوں

نے اپنے کچھ قریبی رشتہ داروں کو گجرات بھیج دیا تھا۔ البتہ کلاسیکل بلوچی شاعری (شعری دپتر) میں میر گوہرام اور میر چاکر کے متعلق کافی حوالے ملتے ہیں۔ جو جغرافیائی اور تاریخی لحاظ سے اہم ہیں۔ رند اور لاشار کی تیس سالہ جنگ کے ضمن میں شمالی خطے سبی، نلی (ناڑی)، فتح پور، شوران، گاجان، گنداواہ، مولا اور گاج کے نام آتے ہیں۔ بعض حوالوں میں گاج سے مراد گاجان معلوم ہوتا ہے لیکن میر چاکر کے ایک شعر میں (جس میں وہ میر گوہرام سے مخاطب ہے) گاج کا جو حوالہ آیا ہے اس سے مراد نیئں گاج اور اس سے متصل سندھ کا وہ علاقہ ہے جو ضلع دادو کے تعلقہ جوہی اور تعلقہ خیرپور ناتھن شاہ پر مشتمل ہے۔ ایک دوسرا حوالہ نوحانی بلوچ قبیلے والوں کے متعلق ہے جو اس جنگ میں میر گوہرام اور لاشاریوں کے طرفدار تھے اور جن کی قبائلی طاقت کا مرکز بھی نیئں گاج والا علاقہ تھا۔

تیس سالہ جنگ کے معرکوں میں پہلے رند قبائل کو لاشاری قبائل پر برتری حاصل رہی اور میر گواہرام نے سندھ کے سلطان جام نظام الدین سے مدد و معاونت کا معاہدہ کیا۔ اس وقت میر گوہرام کے قریبی رشتہ دار دریا خان سلطان کے وزیر سپہ سالار تھے اور غالباً ان کی وساطت سے ہی اتحاد مضبوط ہوا۔ لاشاریوں کے بعض سرداروں کو ٹھٹھہ کی حدود میں جاگیریں ملیں اور بعض کو میر گوہرام نے گجرات بھیج دیا۔ ''شعری دپتر'' میں شامل میر چاکر کے ایک شعر میں اس صورتحال کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ جس میں وہ میر گوہرام سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ ''تمہارے آدھے لوگ گاج اور گجرات میں ہیں اور آدھے پالن پور میں سرگردان ہیں''۔

نیمو گاج گجرات گوشتا

نیمو بہ پالنپور شہتا رُلتا

اس شعر میں گاج سے مراد ''کچھی'' سے آگے ''کاچھو'' کے کھیرتھر پہاڑی سلسلے کے دامن میں، ''گاج نئیں'' (گاج ندی) اور اس سے متصل گاج والا علاقہ ہے۔ جہاں پر نوحانی قبیلہ آباد

تھا۔نوحانی اس تیس سالہ جنگ میں لاشاری قبائل کی جمعیت میں شامل تھے۔

رندولاشار جنگ کے پہلے دور میں ناکامی کے بعد میر گوہرام سندھ میں نوحانی قبیلے کے علاقہ میں چلا گیا اور ان کے والد بزرگوار میر نوز بندغ جب فوت ہوئے تو ان کو وہیں دفنایا گیا۔ان کا مزار اب تک تعلقہ جوہی (ضلع دادو) کے شہر ٹنڈہ رحیم خان سے متصل بستی میں موجود ہے اور وہاں پر سالانہ میلہ ہوتا ہے۔ یہاں کی مقامی روایت میں یہ مشہور ہے کہ میر چاکر نے یہاں پر ایک حملہ کیا تھا اور وہ جگہ ”چاکر گھٹ“ کے نام سے مشہور ہے۔

رندولاشار جنگ کے دوسرے دور میں لاشاریوں کا پلہ بھاری رہا۔سپہ سالار دریا خان لاشاری تھا۔لہٰذا لاشاریوں کی طاقت میں اضافہ ہوا۔میر چاکر نے ان کیخلاف ہرات کے سلطان حسین سے مدد مانگی جس نے امیر ذوالنون ارغون کو مدد کے لئے مقرر کیا۔جس کے بیٹے شاہ بیگ نے قندھار تا کوئٹہ تک قبضہ کرلیا اور سبی کا رخ کیا۔مگر سپہ سالار دریا خان نے سنہ 895 ہجری میں ارغونوں کو شکست دی اور شاہ بیگ کا بھائی محمد بیگ مارا گیا۔اس جنگ کے بعد لاشاری اور نوحانی وغیرہ قبائل مل کر حملہ آور ہوئے تو میر چاکر جوش میں آکر جنگ میں کود پڑنے کے لئے تیار ہوا مگر ان کے دو دانا رفیقوں یعنی بیورغ اور میر حان نے مشورہ دیا کہ وہ جلد بازی میں پیش قدمی نہ کریں کیوں کہ اس معرکہ میں ایک ہزار جنگجو نوحانی جوان بھی لاشاریوں کے ساتھ ہیں۔ اس موقعے پر نوحانی قبیلے کے سردار عمر نوحانی نے لاشار لشکر کے لئے ایک پر تکلف دعوت کا انتظام کیا اور عمر اپنے قول کا پکا تھا۔ ”دپتر شیئر“ یا ”شعری دپتر“ میں ہے کہ:

چھما دیت کھدو نوحانی

ہفت صد پھنڈر شہت صد میش

”میں نے دیکھا خود نوحانی کو سات سو بیل اور آٹھ سو بھیڑ ذبح کیے“

اس جنگ میں رند قبائل کو شکست ہوئی اور میر حان مارا گیا۔رند قبائل بڑی بہادری سے

لڑے لیکن فتح لاشار قبائل کو ہوئی۔ اس سے دل برداشتہ ہو کر میر چاکر نے سبی کو چھوڑنے کا ارادہ کیا اور میر گوہرام کو اپنے شیئر میں طعنہ دیا کہ اب تو عمر نوحانی کے ہاں چلے گئے ہو لیکن میں مردانہ وار تمہارے اوپر آؤں گا۔

نیں عومرا پنہاذی گواران داکی

گوں کھفان لالو کھشتغیں مردی

"اب تو عمر کے پہلو میں جا بیٹھا ہے میں انتقام لینے والے مردوں کی طرح تمہارے اوپر آپڑوں گا"

ان حوالوں سے گمان ہوتا ہے کہ جیسے میر گوہرام مولا اور گنداواہ کو چھوڑ کر گاج نئیں کے علاقہ میں نوحانی قبیلے کے ساتھ جا کر رہے ہوں۔

سندھ کے طاقتور حکمران جام نظام الدین سنہ 914ھ میں فوت ہوئے اور 13 سال کے بعد 927ھ میں، ارغون نے ٹھٹھہ پر حملہ کیا اور دریا خان شہید ہو گیا۔ سبی پر ارغونوں کا اس سے پہلے ہی قبضہ ہو گیا تھا۔ میر گوہرام مولا اور گنداواہ کو پہلے چھوڑ چکے تھے اور اب ان کے لئے دوبارہ واپس جا کر گنداوہ پر قبضہ کرنا مشکل تھا۔ گویا میر چاکر نے جو کہا تھا وہ قول پورا ہونے والا تھا کہ "میر گوہرام سے محروم ہوا۔ اسے نہ گور ملا اور نہ گنداواہ نصیب ہوا"۔

اس کی تصدیق گاج علاقہ میں صدیوں سے مشہور متواتر روایت سے ہوتی ہے کہ جب وفات کا وقت آیا تو میر گوہرام نے وصیت کی کہ ان کی میت کو ایسی جگہ دفنایا جائے جہاں پر آبادی نہ ہو اور کوئی وہاں پر آسانی سے پہنچ نہ سکے۔ مزید یہ کہ ان کی قبر کو گمنام رکھا جائے اور اس پر نام نہ لکھا جائے۔ میر گوہرام پر رند و لاشار جنگ میں بلوچوں کی قبائلی طاقت کے زوال پر دل گرفتہ تھا۔ وہ اتنا مایوس تھا کہ بعد از موت بھی وہ اپنی قبر کو گوشہ گمنامی میں رکھنا چاہتا تھا۔ چار سو برس گزر جانے کے بعد آج تک گاج کے علاقہ میں یہ روایت متفقہ طور پر مشہور ہے کہ "میر گوہرام نے خود کو گمنام کروایا"۔ حالیہ تحقیق کے دوران مندرجہ ذیل بیانات سے اس کی تصدیق ہوئی۔

جناب حکیم عبدالحمید خان چانڈیہ بلوچ جونیئں گاج کے علاقے سے متصل ''شہر ماڑ و تعلقہ خیر پور ناتھن شاہ'' کے مشہور مصنف اور مورخ ہیں اور جن کے آباء و اجداد چانڈیہ قبیلہ کے سرداروں کے پشت بہ پشت حکیم اور معتمد علیہ و مشیر رہے ہیں۔ ان سرداروں میں سے سردار سریمن خان ٹھٹھہ کے جام نظام الدین کے سپہ سالار دریا خان کے معاصر تھے اور دریا خان سے مل کر 895ھ میں انہوں نے ارغون کو شکست دی تھی اور سبی کو فتح کر لیا تھا۔ جناب حکیم صاحب نے سردار سریمن خان کی قبر دکھائی اور سپہ سالار کی جاگیر کاہان کے حدود کی نشاندہی کی۔ خاص طور پر نیئں گاج کے علاقہ میں واقع میر گوہرام کی قبر کی تصدیق کی اور اس علاقہ کے بزرگوں سے جو مندرجہ ذیل بیانات سنے وہ بیان کیے۔

نیئں گاج کے کنارے واقع ''ڈرگھ بالا'' ایک مشہور تاریخی بستی ہے جس کو سندھ کے حکمران ٹالپور کے خاندان کے آباء و اجداد نے اٹھارویں صدی میں آباد کیا تھا۔ اس وقت کے معاصر دو قبیلے ڈاہری اور سرہیہ جو اب تک وہاں آباد ہیں۔ یہاں کی روایات سے باخبر ہیں۔ جناب حکیم صاحب نے میر گوہرام کی قبر کے متعلق کافی عرصہ پہلے ''ڈرگھ بالا'' کے مولوی محمد صلاح الدین اور ان کے دو بھائیوں مولوی عبدالرحمن اور مولوی حمزہ سے سنا کہ ان کے والد شیر خان بیان کرتے تھے کہ ہم اپنے بڑوں سے سنتے آئے ہیں کہ یہ قبر میر گوہرام لاشاری کی ہے۔

ڈرگھ بالا کے دوسرے قبیلے سرھیہ کے مولوی عبدالقادر سرھیہ نے (جو موضع ''ملا کاتیا'' والے بزرگ کے مرید تھے) بتایا کہ ان کے والد مولوی حاجی حمزہ سرھیہ کہتے تھے کہ ہم نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ یہ قبر میر گوہرام لاشاری کی ہے۔

موضع ''راجو گنڈھو'' کے مولوی قیصر براہمانی نے بتایا کہ مولوی محمد حسن کھوسہ بیان کرتے تھے کہ ہم اپنے بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ یہ قبر میر گوہرام کی ہے۔

گاج کے علاقے میں تعلقہ جوہی (ضلع دادو) کے عمر رسیدہ اور باخبر لوگ سب متفقہ طور پر

میر گوہرام کی قبر کی تصدیق کرتے ہیں۔ مرحوم سومرو خان لُنڈ بلوچ (وفات 1970ع، عمر 75 سال) جو خود ''دیھ پوٹھو'' کے رہنے والے تھے (جہاں پر میر گوہرام کی قبر موجود ہے) تصدیق سے بتاتے تھے کہ ہمیں اپنے آباء واجداد سے بخوبی معلوم ہے کہ یہی قبر میر گوہرام کی ہے۔

فروری 2006ء تک نیئں گاج کے علاقہ میں اوپر والی تحقیقات سے مطمئن ہو کر راقم نے سرزمین پر جا کر میر گوہرام کی آخری آرام گاہ کو دیکھنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ 30 اپریل 2008ء کو جناب حکیم عبدالحمید چانڈیو نے انتظام فرمایا اور ہم صبح کو تعلقہ ہیڈ کوارٹر شہر جوہی پہنچے، جہاں سے محترم عبدالفتاح (ہیڈ ماسٹر ہائی سکول ڈرگھ بالا) ہمارے رہنما ہوئے۔ ہم پہلے نیئں گاج کے کنارے پر واقع تاریخی بستی ''ڈرگھ بالا'' پہنچے جہاں پر سندھ کے حکمران ٹالپور خاندان کے آباء واجداد کا سترویں صدی میں یہاں آکر آباد ہونا اس حقیقت پر شاہد تھا کہ یہ خطہ اس سے پہلے بلوچ قبائل کی طاقت کا مرکز بن چکا تھا۔ ''ڈرگھ بالا'' سے نزدیک تالپور خاندان کے قدیم قبرستان سے گزر کر آگے مغرب کو کچھ فاصلے پر ہماری جیپوں کا قافلہ ''نیئں گاج'' کے شمالی مجرا میں داخل ہوا یہ طے شدہ تھا کہ راستے میں سب آثار قدیمہ دیکھیں گے۔ لہٰذا پہلے ہم نوحانی قبیلے کی قدیم بستی ''واہی برادی'' پہنچے۔ ''برادی'' نوحانی قبیلے کے فرد کا نام تھا اور پانی کا ایک چھوٹا مجرا (بڑے برساتی نالہ ''نیئں گاج سے نکل کر) ''نالی یا واہی'' کی صورت میں یہاں سے گزرتا ہے جس کی مناسبت سے اس بستی کا نام ''واہی برادی نوحانی'' ہوا۔ اس بستی کے ساتھ شمال کی طرف پیڑوں کا ایک جھنڈ تھا۔ جس کے اندر ایک قدیم قبر بھی تھی۔ جس کے معائنہ کے لئے ہم اندر گئے۔ دیکھا کہ یہ قبر پتھر کے تراشے ہوئے بھاری بلاکس سے بنائی گئی تھی اور اس کے اوپر رنگین غلاف پڑا ہوا تھا یعنی اب تک اس مزار کو عزت واحترام سے دیکھا جاتا ہے۔ مزید معائنہ کے لئے غلاف اٹھا کر دیکھا تو سرہانے کی طرف ''عمر یوسف'' نام کندہ شدہ نظر آیا۔ یہ وہی عمر (بن یوسف) تھا جس کا ذکر (بلوچی ''دپتر شیئر'' میں شامل) میر چاکر کے شعر میں ملتا ہے۔ اس بستی سے متصل جنوب کی طرف بھی پتھر

کی تین قبریں محفوظ ہیں جن میں سے ایک پر غلاف پڑا تھا اور ''عمر یوسف'' نام کندہ تھا۔ دوسری بغیر نام کے تھی اور تیسری بچی (ظائفہ) کی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ ''عمر یوسف'' کا پوتا تھا اور شمال کی طرف مدفون اس کا دادا ''عمر یوسف'' تھا۔ جس پر ''گوہر'' نام لکھا تھا۔ اس سے آگے ہم جنوب کی طرف بڑھے اور نیئں گاج کے درمیانی مجرا سے گزر کر نیئں گاج کے جنوبی مجرا سول سے باہر نکلے۔ یعنی نیئں گاج کے تینوں مجراؤں سے نکل کر گاج سے آگے پانچ چھ میل جنوب کی طرف چل کر مغرب کو پہاڑوں کی طرف مڑے۔ کچھ فاصلے کے بعد چند گھر نظر آئے اور ساتھ ہی پتھر کی ایک بڑی قبر دور سے نظر آئی۔ یہ چند گھر لنڈ بلوچ قبیلے والوں کے تھے۔ جنہوں نے تصدیق سے بتایا کہ یہ قبر میر گوہرام لاشاری کی ہے۔

اب اندازہ یہ ہوا کہ قبر نیئں گاج سے تقریباً چھ میل جنوب کو کھیر تھر پہاڑی سلسلے کے دامن میں واقع ہے۔ ریونیو ریکارڈ کی رو سے یہ قبر دیہہ ''پوڑھو''، تپہ ڈرگھ بالا (تعلقہ جوہی، ضلع دادو) میں ہے۔ غلاف ہٹا کر معائنہ کیا گیا مگر کوئی نام نظر نہیں آیا۔ اس قبر کو تراشے ہوئے لمبے بھاری پتھروں سے کافی اونچا کر کے بنایا گیا تھا۔ پتھروں پر سنگ تراشی سے بنائے ہوئے نقش و نگار کندہ تھے۔ پتھر سب کے سب پیلے رنگ کے ہیں جن سے اندازہ ہوا کہ غالباً یہ پتھر دور سے لائے گئے تھے۔ زمین کی سطح پر نیچے کی لمبائی کے درمیان دونوں طرف ایک دوسرے کے سامنے، دو خال تھے۔ جن کو روایتی طور پر ''ہوادار'' دریچہ کہا جاتا ہے۔ قبر کے نیچے زمین کی سطح پر بھی پتھر کے فرش کے آثار نظر آئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس پہنائی فطرت میں یہ اکیلی اونچی قبر اپنے سادہ مگر شکوہ ہیئت و صورت میں ایک ایسی منفرد یادگار ہے جو میر گوہرام کے شایان شان ہی ہو سکتی ہے۔

عہدنامہ مابین رندولاشار

رندولاشار کی طویل جنگ کے اختتام پر چاکر اعظم اور میر گوہرام
خان لاشاری کے مابین ایک عہدنامہ کا انکشاف ہوا ہے۔
جس کا عکس اور اردو ترجمہ ممتاز مؤرخ ومحقق ڈاکٹر عبدالرحمن
براہوئی کے حوالے سے شامل کتاب ہے۔

رندولاشار کی لڑائی کئی سالوں تک جاری رہی دونوں اطراف سے کئی لوگ لقمہ اجل بن گئے بچے یتیم ہو گئے عورتوں کا سہاگ لٹ گئے آخر کار سادات بیچ میں آ گئے انہوں نے جنگ بندی کرادی۔ فریقین کے درمیان صلح نامہ ہوا۔ دونوں قوموں کے سربراہوں سے قرآن مجید پر سورۃ الناس کی پشت پر میر چاکر اعظم رند کا عہدنامہ فارسی میں تحریر ہوا۔ جس پر آپ نے اپنی مہر ثبت کردی اور یہ قرآن مجید مع عہدنامہ میر گوہرام خان لاشاری کے حوالہ کیا گیا اسی طرح ان کے لئے بھی ایک عہدنامہ قرآن مجید کے اختتام پر سورۃ الناس کی پشت پر لکھا گیا۔ جس پر انہوں نے اپنی مہر ثبت کردی یہ قرآن مجید مع عہدنامہ میر چاکر اعظم رند کے سپرد کیا گیا۔ اس طرح دو عہدنامے قرآن مجید پر تحریر کرائے گئے۔ جن پر دونوں حکمرانوں نے اپنی مہریں ثبت کردیں۔ دونوں عہدناموں پر سن 957ھ تحریر ہے جو سن عیسوی کے مطابق 1550ء بنتا ہے۔

میر گوہرام لاشاری کا عہدنامہ فارسی جس قرآن مجید پر لکھا گیا اس کا نسخہ نیشنل میوزیم کراچی میں موجود ہے۔ میر چاکر اعظم رند کا عہدنامہ جس قرآن مجید پر لکھا گیا وہ بقول قمر بلوچ (ریٹائرڈ سیکرٹری سی اینڈ ڈبلیو) سندھ میں ایک خاندان کے پاس ہے جس کا ہدیہ وہ دس لاکھ روپیہ مانگ رہا ہے۔ سادات کا نسخہ جس پر دونوں حکمرانوں کے عہدنامے مع مہر ثبت ہیں وہ قمر

بلوچ کے کتب خانہ میں موجود ہے قمر بلوچ کے نسخہ پر میر علی شیر قانع ٹھٹھوی مؤلف تحفتہ الکرام (متوفی 1203ھ) کی مہر ثبت ہے۔ اگرچہ آپ کا تعلق سادات سے تھا لیکن آپ کی اور والد کی بیعت سلسلہ نقشبندیہ سے تھی ممکن ہے کہ آپ کے خاندان نے یہ صلح کرایا ہو کیونکہ یہ تاریخی نسخہ آپ کے خاندان میں رہا ہے نیشنل میوزیم کراچی اور قمر بلوچ کے نسخوں کے عکس شائع کئے جا رہے ہیں اور دونوں عہدناموں کا اردو ترجمہ بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ جس کے لئے ڈاکٹر محمد جواد اور سید علی مہدی زیدی نے تعاون کیا۔ دونوں عہدناموں میں کاتب نے قرآن مجید کی سورۃ مائدہ کی آیت میں سہواً لفظ ''بالعہد'' لکھا ہے جو غلط ہے صحیح لفظ بالعقود ہے اس لئے ترجمہ میں بالعقود لکھا گیا ہے۔

عہدنامہ ـــــــــ میر چاکر اعظم رند

"اس معاہدے کا مقصد یہ ہے کہ یہ بندہ درگاہ خدا میر چاکر اعظم وعالیجاہ شوکت دستگاہ میر گوہرام خان ہمیشہ سے باہمی دوستی اور بھائی چارگی، اتحاد اور خوشی اور غم کے دنوں میں ایک دوسرے کے مددگار رہے ہیں۔

بد قسمتی سے زمانے کی شر انگیزیوں، فساد اور ناہنجاری کے موجب، بلاوجہ اور بے سبب دونوں طرف سے کدورتیں اور غلط فہمیاں پیدا ہوئیں، جو ایک تباہ کن جنگ کا باعث بنیں۔ جس کے نتیجے میں دونوں جانب سے بہت سے جوان لقمہ اجل بنے اور یہ لاحاصل جنگ کئی سالوں تک متواتر جاری رہی اس جنگ میں سوائے قتل و غارت گری خونریزی تباہی و بربادی مزید کوئی مفید اور بار آور نتیجہ نہ نکل سکا۔ حالانکہ دنیا پر بھروسہ اور عمر کو بقاء نہیں ہے ہم پر لازم ہے کہ گزشتہ کی طرح دوستی اور خلوص کے رشتے کو مضبوط کریں اور قتل و غارت سے دور رہیں۔ اسی بناء پر دونوں جانب سے عہد کرتے ہیں اور اپنے آپ کو پابند سمجھتے ہیں کہ کلام الٰہی اور اس کے جملہ امور کو گواہ بناتے ہوئے خالق کون و مکان اور رسول آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ عہد کرتے ہیں اس آیت مبارکہ (یاایھا الذین امنو آاوفو بالعقود) ترجمہ : "اے ایمان والو! اپنے اقراروں کو پورا کرو" کے مصداق مستحکم عہد کرتے ہیں کہ ظاہری اور باطنی طور پر دوستی اور خلوص کو برقرار رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کے بعد ہم ایک دوسرے کے دوست اور بھائی بن کر رہیں گے اور ایک دوسرے کے دوست کو دوست اور دشمن کو دشمن سمجھیں گے اور ایک بال برابر بھی اس عہد و میثاق سے تجاوز نہیں کریں گے۔ جب تک عالیجاہ میر گوہرام کی طرف سے اس عہد و میثاق میں خلل نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس بندہ درگاہ خدا کی جانب سے کوئی خلل پیش نہیں آئے گا۔ اگر کسی وقت دونوں جانب سے کسی ایک سے بال برابر اس معاہدے کی خلاف

ورزی ہوئی تو وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قہر و غضب میں گرفتار ہوگا اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اور رسول بزرگوار (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حضور میں شرمندہ و شرمسار ہوگا اور یہی قرآن کریم اور کلام رب العالمین اس کا اور اس کی اولاد کا دشمن ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے التجا کرتا ہوں کہ یہ عہد نامہ دونوں جانب سے نسل در نسل برقرار اور مستحکم رہے اور یہ چند معروضات عہد نامہ کی صورت میں تحریر ہوئے۔

بہ مورخہ ۲۵ رجب المرجب شریف ۹۵۷ھ۔

(مہر، میر چاکر اعظم)

عہدنامہ ـــــــ میر گوہرام

"اس معاہدے کا مقصد یہ ہے کہ بندہ درگاہ خدا میر گوہرام خان وعالیجاہ شوکت دستگاہ میر چاکر خان اعظم ہمیشہ سے باہمی دوستی اور بھائی چارگی، اتحاد اور خوشی اورغم کے دنوں میں ایک دوسرے کے مددگار رہے ہیں۔

بدقسمتی سے زمانے کی شرانگیزیوں فساد اور ناہنجاری کے موجب بلاوجہ اور بے سبب دونوں طرف سے کدورتیں اور غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور جو ایک تباہ کن جنگ کا باعث بنیں جس کے نتیجے میں دونوں جانب سے بہت سے جوان لقمہ اجل بنے اور یہ لاحاصل جنگ کئی سالوں تک متواتر جاری رہی۔ اس جنگ میں سوائے قتل وغارت گری خونریزی، تباہی وبربادی مزید کوئی مفید اور بارآور نتیجہ نہ نکل سکا۔ حالانکہ دنیا پر بھروسہ اور عمر کو بقا نہیں ہے۔ ہم پر لازم ہے کہ گزشتہ کی طرح دوستی اور خلوص کے رشتے کو مضبوط کریں اور قتل وغارت سے دور رہیں اسی بناء پر دونوں جانب سے عہد کرتے ہیں اور اپنے آپ کو پابند سمجھتے ہیں کہ کلام الٰہی اور اس کے جملہ امور کو گواہ بناتے ہوئے خالق کون ومکان اور رسول آخرالزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ عہد کرتے ہیں کہ اس آیت مبارکہ ((یاایھا الذین امنوآاوفو بالعقود) ترجمہ : "اے! ایمان والو اپنے اقراروں کو پورا کرو" کے مصداق مستحکم عہد کرتے ہیں کہ ظاہری اور باطنی طور پر دوستی اور خلوص کو برقرار رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کے بعد ہم ایک دوسرے کے دوست اور بھائی بن کر رہیں گے اور ایک دوسرے کے دوست کو دوست اور دشمن کو دشمن سمجھیں گے اور ایک بال برابر بھی اس عہد ومیثاق سے تجاوز نہیں کریں گے۔ جب تک عالیجاہ میر چاکر اعظم خان کی طرف سے اس عہد ومیثاق میں خلل نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اس بندہ درگاہ خدا کی جانب سے کوئی خلل پیش نہیں آئے گا۔ اگر کسی وقت دونوں جانب سے کسی ایک سے بال برابر اس

معاہدے کی خلاف ورزی ہوئی تو وہ اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قہر و غضب میں گرفتار ہوگا اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اور رسول بزرگوار (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حضور میں شرمندہ وشرمسار ہوگا اور یہی قرآن کریم اور کلام رب العالمین اس کا اوراس کی اولاد کا دشمن ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے التجا کرتا ہوں کہ یہ عہدنامہ دونوں جانب سے نسل درنسل برقرار اور مستحکم رہے اور یہ چند معروضات عہدنامہ کی صورت میں تحریر ہوئے۔

بہ مورخہ ۲۵ رجب المرجب شریف ۹۵۷ھ۔

(مہر، میر گوہرام خان)

☆☆☆☆

شجرہ نسب

(اولادِ امجاد چاکر اعظم رحمتہ اللہ علیہ)

۱۔ **میرشهداد**۔ جدامجد میر رانے بلوچ، بلو چان گڑھی بلوچ فتح پور، نورنگ پور، بادشاہ پور ۲۔ **میراللہ داد عرف دادن خان**۔ جدامجد بلوچان خوشاب فرخ نگر، خورم پور۔ ملتان ۳۔ **میرشیھک**۔ گورنر ملتان (شہید)۔ ۴۔ **میرمیران**۔ گورنر ملتان (شہید) ۵۔ **میرباقرخان**۔ گورنر متھرا۔ ۶۔ **میرقائم خان**۔ ۷۔ **میرجلال خان**۔ جدامجد ڈومبکی سرداران ۔ ۸۔ **میر نوح**۔ ۹۔ **میربجارخان**۔ جدامجد سرداران ساہیوال ضلع سرگودھا۔ ۱۰۔ **میرشاھو خان** ۔ ۱۱۔ **سپه دار خان**۔ جدامجد سرداران منکیرہ۔

شجرہ نسب مصنّف

(۱) چاکر اعظم عرف خان اعظم (۲) نواب اللہ داد خان دادن خان (۳) اللہ یار خان (۴) پہلوان خان (۵) میر محمد خان (۶) بجار خان (۷) برخوردار خان (۸) اللہ یار خان ثانی (۹) جلال خان (۱۰) میر محمد خان (۱۱) شیر محمد خان (۱۲) محمد لعل خان (۱۳) فاضل محمد خان (۱۴) محمد عمر خان (۱۵) غلام حیدر خان

(۱۶) غازی محمد خان (متوفی ۲۲ شعبان ۱۳۲۹ھ)

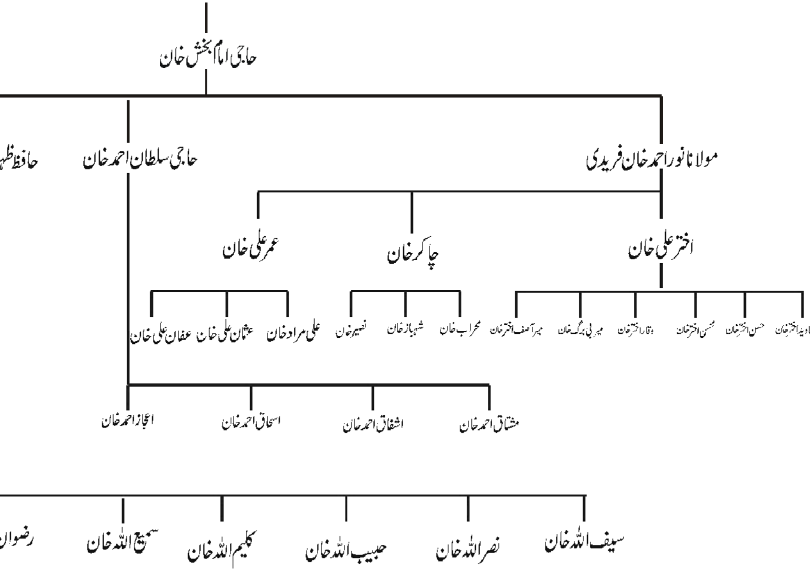

انتساب

مارچ ۱۹۱۸ء کا ذکر ہے، میں وظیفے کا امتحان دے کر کمرے سے باہر نکل رہا تھا کہ ملک حسن بخش صاحب ڈرل سپروائزر نے قریب بلا کر آہستہ سے کہا کہ تمہیں صاحب بلا رہے ہیں۔ اگر وہ پوچھیں کہ آگے پڑھو گے؟ تو جواب دینا کہ ہاں ضرور پڑھوں گا۔

میں دوبارہ اندر داخل ہوا۔صاحب کو سلام کیا۔ انہوں نے پوچھا۔" بیٹے !تمہارا نام کیا ہے؟"

عرض کی "نور احمد خان!"

"قوم؟"

"بلوچ!"

"کون بلوچ ؟"

یہ میں نہ بتا سکا!

"تم جتوئی تو نہیں ہو!"

"نہیں صاحب! یہ نام کبھی نہیں سنا!"

اب صاحب عملہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہال لڑکوں سے خالی ہو چکا تھا اور نگران سمٹ سمٹا کر ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس کے قریب آ گئے تھے۔ میں اگرچہ اس وقت دس سال کا بچہ تھا۔لیکن سفر حج کے دوران بڑے شہروں کی سیاحت نے مجھے کافی ہوشیار بنا دیا تھا۔ مجھے اس وقت یہ تو معلوم نہیں تھا کہ صاحب بہادر مجھ سے یہ باتیں کیوں پوچھ رہے ہیں لیکن اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ یہ میرے بھلے کی باتیں ہیں۔

صاحب نے ملک صاحب سے فرمایا کہ امیدواروں کی فہرست پیش کرو! اس میں کل کتنے

بلوچ امیدوار ہیں؟''

ملک صاحب نے فہرست پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے عرض کیا ''جناب امیدواروں میں جتوئی کوئی نہیں ہے۔ صرف تین امیدوار ہیں۔ ان میں نور احمد خان کے نمبر سب سے زیادہ ہیں!''

''اچھا بیٹا جاؤ!''

یہ کہہ کر صاحب نے مجھے رخصت کر دیا۔ باہر آ کر معلوم ہوا کہ سردار کوڑا خان مظفر گڑھ کے ایک بلوچ رئیس تھے چونکہ ان کی اولاد نہیں تھی اس لئے انہوں نے اپنی جائیداد کا کچھ حصہ مظفر گڑھ ڈسٹرکٹ بورڈ کے سپرد کر دیا تھا۔ اس سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ عوام کی بھلائی پر خرچ کی جاتی ہے اور بلوچ طلباء کو وظائف ملتے ہیں۔ ایک ماہ کے اندر اندر مختلف ذرائع سے معلوم ہو گیا کہ مجھے سردار کوڑا خان کا وظیفہ دیا جانا منظور کر لیا گیا ہے اور اس کے فوراً بعد سرکاری طور پر اس کی توثیق ہو گئی اور میں تعلیم جاری رکھنے کے لئے شجاع آباد مڈل سکول کی پانچویں جماعت میں داخل ہو گیا۔

اس زمانے میں جبکہ روپے کا سوا سیر گھی اور ۳۲ سیر گندم فروخت ہوتی تھی۔ مجھے چار روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ ایک روپے کے میں پوسٹ کارڈ خرید لیتا تھا جو ایک پیسہ فی کارڈ کی شرح سے ملتے تھے۔ مختلف رسائل، اخبارات اور فرموں کو خط لکھتا۔ ان سے نمونے کے طور پر اخبارات اور رسائل منگواتا، کتب خانوں کی فہرستیں، درسگاہوں کے قواعد، انجمنوں کی کارروائیاں روزانہ پیکٹوں کی صورت میں میرے نام آجاتی تھیں۔ کبھی کبھی قصے کہانیوں کی چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی منگوا لیتا۔ میری ڈاک میں کئی کارڈ اور پیکٹ ہوتے تھے اور ڈاکیہ لا کر کلاس روم میں استاد کی میز پر رکھ دیتا تھا۔ میرے اساتذہ میرے اس شغل سے سخت بگڑتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں پیسہ اور وقت ضائع کرتا ہوں۔ وہ وہیں سے پیکٹ اٹھا کر میری طرف پھینکتے جو بسا اوقات میرے سر پر آلگتے اور کبھی کسی ساتھی کی تواضع بھی ہو جاتی۔

جہاں تک مجھے یاد ہے کہ مبلغ دو روپے سے میں سکول کے اخراجات ادا کرتا تھا اور دو روپے میرے اس علمی مشغلے پر صرف ہوتے تھے۔ ہشتم جماعت تک میں نے سردار کوڑا خان

مرحوم کے وقف سے ۱۹۲/ روپے حاصل کئے۔ گویا ۹۶/ روپے میری تعلیمی ضروریات پر صرف ہوئے اور ۹۶/ روپے سے میں نے رسائل کا پڑھنا، چھوٹے چھوٹے مضامین کا لکھنا اور مختلف عنوانات پر تقریریں کرنے کا ملکہ پیدا کرلیا۔ عمر کی پختگی کے ساتھ علمی اور ادبی صلاحیتوں میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ میں نے کچھ پڑھنا لکھنا سیکھ لیا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ سردار کوڑا خان مرحوم کے اس وظیفے کی ہی برکت ہے ورنہ اگر یہ وظیفہ نہ ملتا تو شاید نہ میری علمی اور ادبی صلاحیتیں اجاگر ہوتیں اور نہ ہی بلوچ قوم کی یہ تاریخ مدوّن ہوسکتی۔ اس لئے جب اس تاریخی شاہکار کے انتساب کا وقت آیا تو اگرچہ میرے بے شمار محسن موجود تھے اور میں اس تصنیف کو ان سے منسوب کر کے ان کے قدردانوں سے استفادہ بھی کرسکتا تھا۔ مگر پھر پھرا کے میری نظر انتخاب اس محبوب شخصیت پر پڑی جس کے وقف سے میں نے طالب علمی کے زمانے میں استفادہ کیا تھا چنانچہ میں اس تاریخ کو جو دراصل سردار کوڑا خان کے آباء کرام کی ہی پرشوکت داستان ہے۔ ان کے نام نامی و اسم گرامی سے معنون کرتا ہوں تاکہ جب تک یہ کتاب لوگوں میں متداول رہے ہمارے سرداروں کو اس امر کا احساس دلاتی رہے کہ چار پیسے جو غریب عوام کی بھلائی کیلئے وقف کئے جاتے ہیں وہ رائیگاں نہیں جاتے۔

سردار کوڑا خان نے عوام کی بھلائی کے لئے جائیداد وقف کر کے جو نیکی کا کام کیا ہے میری دعا ہے کہ خداوند عزّوجل اسے قبول فرمائے۔ اس کے بدلے مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے اور ساتھ ہی دوسرے بلوچ سرداروں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ایں دُعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

نور احمد خان فریدی

نور محل۔ ملتان

یکم نومبر ۱۹۶۷ء

افتتاحیہ

مثل مشہور ہے کہ وہ قوم بڑی خوش نصیب ہوتی ہے جس کی کوئی تاریخ نہ ہو۔ اگر یہ مقولہ صحیح ہے تو پھر ہماری قوم کے خوش نصیب ہونے میں کسے شبہ ہوسکتا ہے کیونکہ نہ تو ہمیں اپنے آباء کرام کے پرشوکت کارنامے یاد ہیں کہ ان پر فخر کرسکیں اور نہ ہی ہمیں اسلاف کی شکستوں اور ناکامیوں کا علم ہے کہ ان کا غم کھائیں۔ یہ تو ہمارے بزرگوں کے فہم وتدبر اور عقل ودانش کا صدقہ ہے کہ آج ہمیں چند لوری ایسے مل جاتے ہیں جو ہمارے شجروں اور چند رجزیہ اشعار کو سینوں سے لگائے پھرتے ہیں۔ اگر ہمارے اسلاف اس عملہ کو بھرتی نہ کرتے تو ہم اپنے بارے میں کچھ بھی نہ بتا سکتے۔ انگریزوں یا دوسرے مولفین نے بلوچ قوم سے متعلق جو کچھ بھی لکھا ہے وہ انہیں لوگوں کی یادداشت کا رہین منت ہے۔ یہ ہمارے بزرگوں کی بڑی دانائی کی بات ہے کہ انہوں نے ایسے لوگ ملازم رکھ لئے جو رزم وبزم میں ہمیشہ ان کے ہمراہ رہے اور جو واقعہ انہیں یادرکھنے کے قابل نظر آیا اسے نظما لیا۔ چنانچہ بلوچ قوم کے شجرے اور خاص خاص واقعات اب تک ان لوگوں کے وردزبان چلے آتے ہیں۔ انہیں محض اس لئے نظر انداز کرنا کہ یہ ان پڑھ لوریوں اور مراسیوں کی یادداشتوں کا نتیجہ ہیں نہ صرف ان نسابین سے زیادتی ہے بلکہ انہیں رد کرنے کے بعد ہماری تاریخ اور ثقافت کا درخت بھی کھوکھلا ہو کررہ جاتا ہے۔

احقر کو جب بلوچ قوم کی تاریخ مدوّن کرنے کا خیال آیا تو دسمبر ۱۹۵۵ء میں بمقام مسلم ہائی سکول ملتان میں پڑھے لکھے لوگوں کا ایک اجلاس طلب کیا جس کا مقصد بلوچ قوم کی تاریخ مدوّن کرنے کے بارے میں سوچنا تھا۔ اجلاس نے طے کیا کہ ماخذات کے حصول کے لئے "بلوچی

دُنیا'' کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا جائے اور جب تاریخ کی تسوید کے لئے زیادہ سے زیادہ مواد جمع ہو جائے تو پھر تدوین کا کام شروع کر دیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۵۵ء میں ماہنامہ ''بلوچی دُنیا'' منظر عام پر آیا اور اب ۱۹۶۷ء رخصت ہو رہا ہے۔ اس طویل عرصہ میں جو کچھ میسر آسکا ہے وہ بسا غنیمت ہے۔ کل کو اگر کسی صاحب نے اس موضوع پر قلم اٹھانے کی زحمت گوارا کی تو اسے ہماری طرح ماخذات کے حصول میں صبر آزما مراحل سے دو چار ہونا نہیں پڑے گا۔ ہماری جدو جہد نقش اوّل ہے۔ ''نقش ثانی'' بہر حال بہتر و افضل ہو گا!

انگریز مؤرخین کی جو بات ہمیں شدت سے کھٹکی ہے وہ بلوچ قوم کی عظیم وحدت کو پارہ پارہ کرنا ہے۔ بلوچ ایک ایسا لفظ ہے جس کے سنتے ہی دل میں بجلی کی ایک کرنٹ سی دوڑ جاتی ہے۔ بلوچ من حیث القوم اپنے نام اور اپنے بلوچ بھائیوں سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں۔ بلوچ بڑی قوم ہے جو کئی ملکوں میں پھیلی ہوئی ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ بلوچ جہاں کہیں بھی ہیں خاصی قوت رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے انگریز نے اپنے سیاسی مفاد کے پیش نظر بلوچوں میں افتراق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ جب تالپوروں سے الجھے تو اپنے ایجنٹوں کو تالپوروں کے بلوچوں سے الگ ایک قوم ثابت کرنے پر مقرر کیا۔ جب تالپوروں کی حکومت ختم ہو گئی اور بلوچوں کی دوسری عظیم ریاست ''قلات'' کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنایا گیا تو بروہیوں کو بلوچوں سے الگ قوم ثابت کرنے کے لئے کئی کتابیں لکھوائی گئیں۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ جب ہماری فوجیں قلات پر حملہ آور ہوں تو دوسرے بلوچ برہم نہ ہوں۔ قلات فتح کرنے کے بعد بلوچ تمنات میں حقد و عداوت کی آگ اس طرح سے بھڑ کائی کہ کھوسہ، جمالی، لغاری اور مزاری جیسے کئی بلوچ قبائل کو آپس میں گتھم گتھا کر دیا۔ اس لئے ہم قوم کی اس قسم کی تجزیہ کرنے کیلئے قطعاً تیار نہیں جس سے اس کی وحدت پر زد پڑنے کا اندیشہ ہو۔ ڈاکٹر میر عالم خان راقب، میر گل خان نصیر، میر رحیم داد خان مولائی شیدائی، ملک صالح محمد خان لہڑی اور بلوچ عبدالغفار خان جنہوں نے اس موضوع پر کافی دردسری کی ہے وہ اس نظریہ کے

مَوّیِد ہیں کہ بلوچ اور براہوئی دونوں ''سیما طیقی'' Semetic نسل سے عرب ہیں۔ جناب محمد حسین عنقا اور ان کے چند ہم خیال انہیں دراوڑ ظاہر کرتے ہیں۔ جو لوگ ''بلوچی دُنیا'' کا بالا استقلال مطالعہ کرتے چلے آئے ہیں۔ وہ جناب عنقا اور حضرت قاضی عبدالصمد سر بازی کی قلمی جنگ کو بھولے نہیں ہوں گے۔ اختلافات کی خلیج کا پاٹنا ہمارے بس کا روگ نہیں اور نہ ہی ہم بخت نصر اور نمرود کی بحث میں پڑنا قوم اور ملک کے لئے مفید سمجھتے ہیں۔ بلوچ قوم کے خلاف آج تک جس قدر سازشیں ہوئی ہیں بلوچ براہوی تفریق ان سب سے زیادہ خطرناک ہے۔

نور محل۔ ملتان

۱۷۔ نومبر، ۱۹۶۷ء

خاکسار

نور احمد خان فریدی

تقریب

جب ہم نے بلوچ تاریخ مدون کرنے کے لئے اجلاس بلایا، تو بعض حضرات کو ہماری قبائلی اصلاح وتعمیر کی یہ تحریک گراں گزری اور انہوں نے اسے غیر مفید اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ڈیرہ غازی خان کے ایک بزرگوار اس معاملے میں پیش پیش تھے۔ نیازمند نے جنوری ۱۹۵۸ء کے "بلوچی دُنیا" میں ان کے اعتراضات کا جو جواب شائع کیا تھا۔ اسے احباب نے بے حد پسند کیا۔ اس سلسلے میں پاک و ہند کے مسلمہ ادیب سید کامل القادری نے بھی اپنے تاثرات ظاہر فرمائے تھے۔ یہ اعتراضات وقتی نہیں تھے بلکہ پاکستان کا وہ طبقہ جس کا تعلق پست اقوام سے ہے برابر قبائلی شرف وفضل کے خلاف زہر اگلتا رہتا ہے۔ اس لئے قبل اس کے ہم بلوچ تاریخ پر قلم اٹھائیں۔ ان اہم اقتباسات کو آپ بھی ایک نظر ملاحظہ فرمالیں تاکہ اگر کوئی آپ کے منہ آئے تو آپ اسے مسکت جواب دے سکیں۔

شعوب وقبائل

اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی کیلئے جو "دستور حیات" بھیجا ہے۔ اس میں صاف ارشاد فرمایا ہے کہ

یَآیّھَاالنّاسُ اِنا خَلَقناکُم مِن ذَکرٍ وَاُنثی وَجعلَنکُم شَعُوبًا و قَبائِل لِتَعارُفواط اِنَاکَرمکَمُ عِندَاللہِ اِتقَاکُم طاِنَّ اللہَ علَیمٌ خَبِیر o (الحجرات۔ ۲)

ترجمہ: "لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری ذاتیں اور برادریاں ٹھہرائیں تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرسکو، ورنہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں زیادہ شریف وہی ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ جاننے والا باخبر ہے"۔

اس ارشاد ربانی کے بعد کسی کو یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں ہونی چاہیے کہ شعوبی اور قبائلی تقسیم سب سے گھٹیا اور گندی تقسیم ہے۔ ہاں جہاں تک نسلی تفاخر کا معاملہ ہے ہمارا ایمان ہے کہ نوع انسانی میں سب سے اکرم اور افضل وہ ہے جو متقی اور پرہیز گار ہے۔ آج تک کسی بلوچ نے غیر بلوچ پر اپنے حسب نسب کے لحاظ سے برتری کا اظہار نہیں کیا۔ بلوچ من حیث القوم فقیروں اور درویشوں کی معتقد ہے۔ اس کے عوام تو بجائے خود رہے بڑے بڑے تمنداروں سرداروں اور امیروں نے بھی خدا یاد بزرگوں کی کفش برداری کو اپنے لئے سعادت تصور کیا ہے اور انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ یہ درویش کس خاندان اور کس گوت کا ہے۔ میں پوری ذمہ داری سے یہ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ نسلی تفاخر پوری قوم میں نہیں ہے۔ بلوچ قوم فروتنی اور انکسار میں تمام اقوام سے بڑھی ہوئی ہے۔ ضلع ملتان میں جو خاکسار کا زادبوم ہے بالعموم ڈیرہ غازی خان کے بلوچ امراء بڑے عہدوں پر فائز ہو کر آتے رہے ہیں۔ جن لوگوں کو ان سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے وہ ان کے اخلاق حمیدہ کی تعریف کرتے ہیں۔ مجھے خان اعظم الحاج میر احمد یار خان بلوچ ، خان آف قلات، شہزادہ میر عبدالکریم خان بلوچ احمدزئی، میر غلام علی خان تالپور، میر علی احمد خان تالپور اور میر محمد یوسف خان چانڈیو کو بھی ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ جس خلوص اور محبت سے یہ اکابر امراء ملے ہیں اس کی یاد مدت تک میرے دل پر نقش رہے گی۔ جب تک ''بلوچی دنیا'' میں ایسے صاحب اخلاق موجود ہیں فروتنی اور انکسار میں کوئی قوم ہم سے بازی نہیں لے جا سکتی۔ باقی رہا نفسیاتی طور پر معلوم کرنا کہ شعوبی تقسیم مفید ہے یا غیر مفید، وہ میں اپنی طرف سے عرض نہیں کروں گا بلکہ اسلام کے ایک ایسے فرزند جلیل کے اقتباسات پیش کروں گا۔ جنہیں ہندوستان کا بہترین مورّخ اور ناقد تسلیم کیا گیا ہے۔ وہ کون صاحب ذوق ہے جو مولانا اکبر شاہ خان صاحب نجیب آبادی سے متعارف نہیں۔ یہ اقتباسات ان کی مشہور تصنیف ''مقدمہ تاریخ ہند'' جلد ۲ سے لئے گئے ہیں۔

مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی کے ارشادات

آپ لکھتے ہیں کہ:۔

’’تمام نوع انسان ایک آدم کی اولاد ہے۔جس طرح ایک درخت کی شاخیں،شاخ در شاخ ہو کر بڑھتی اور پھیلتی ہیں۔ اسی طرح انسانی نسلیں قوموں،قبیلوں اور خاندانوں میں متفرع ہوئی ہیں۔فطرت انسانی کا تقاضا ہے کہ جس قدر قرابت اور رشتہ داروں کا تعلق قریبی ہوتا ہے اسی قدر ہمدردی اور محبت زیادہ ہوتی ہے۔ جوں جوں یہ تعلق بعید ہوتا جاتا ہے محبت وہمدردی بھی کم ہوتی جاتی ہے۔دو حقیقی بھائیوں میں جو محبت اور ہمدردی ممکن ہے ایک پردادا کے ذریعے تعلق رکھنے والے دوسرے دُور کے بھائیوں میں اس قدر ممکن نہیں۔ایک قبیلے کے افراد میں محبت واخوت کا جو تعلق ہوتا ہے وہ قوم کے عام افراد میں نہیں ہوتا اور جو خلوص ایک قوم کے افراد میں ہوتا ہے۔ دوسری قوم والوں کے ساتھ نہیں ہوتا۔ یہ محبت وشفقت اور صلہ رحمی ایک فطری خاصہ ہے۔اس نسلی تعلق وہمدردی کا سبق مربیت کے سوا اور کچھ نہیں۔دو حقیقی بھائیوں میں محبت اسی لئے ہے کہ وہ ایک خون سے پیدا ہوئے ہیں اور ان کی پیدائش جسمانی کا سبب ظاہری اور مربی ان کا باپ ہے۔ایک دادا کی اولاد میں اسی لئے محبت اور اخوت موجود ہے کہ ان مربیوں کا مربی یعنی ان کے باپوں کا باپ ایک ہے۔انسان اور اس کے مربیوں میں جس قدر دوری اور بعد ہوتا جاتا ہے۔اسی قدر محبت کا تعلق کمزور اور ہلکا پڑ جاتا ہے خدائے تعالیٰ نے انسان کو باہمی تعاون اور تمدن کا محتاج بنا کر تمام نوع انسانی کے درمیان دوستی ومحبت کے پیدا ہونے کا ایک قدرتی سامان پیدا کیا ہے جو نوع انسان کو انتشار اور افتراق کے مضر اثرات سے محفوظ رکھتا ہے اور ہادیان برحق اور خداوندی ہدایت ناموں کے ذریعے انسان کو توجہ دلائی کہ تمہاری جسمانی پیدائش اور پرورش جسمانی کے تمام اسباب کا پیدا اور مہیا کرنے والا تمہارا حقیقی ربّ خدا تعالیٰ ہے اور اس کی ربوبیت کے بغیر نہ

تمہارا وجود ممکن ہے نہ تم اپنی زندگی کا ایک لمحہ اس کی ربوبیت کے بغیر گزار سکتے ہو اور اس کی ربوبیت نہ صرف تمہاری جسمانی پرورش کا باعث ہے بلکہ تمہاری روحانی پرورش اور مقصد حیات سے ہمکنار اور حقیقی کامرانی تک فائز ہونے کا موجب بھی وہی ہے۔ لہٰذا مربیّت سے بڑھ کر ربوبیت کا درجہ ہے اور دنیوی مرّبیوں کے تعلق سے بالاتر تمہارے رب کا تعلق ہے اور چونکہ ہر ایک انسان یکساں طور پر اپنے ربّ کا مربوب ہے۔ لہٰذا ہر انسان پر دوسرے انسان کا حق ہے کہ ایک خالق کی مخلوق اور ایک ربّ کا مربوب ہونے کی حیثیت سے شفقت و محبت کا معاملہ کیا جائے اور نوع انسان کے تعلقات آپس میں نہایت خوشگوار رہوں اور شفقت و محبت کا معیار خدائے تعالیٰ کا تعلق ہو۔ باقی تمام تعلقات اس تعلق سے نیچے ہوں۔

وَالذین اٰمَنُوا اَشدَ حُباًللّٰہ ط (البقر۔ ۲۰)

”اور جو لوگ مومن ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھتے ہیں!“

ایک باپ کے دو بیٹوں میں اگر ایک بیٹا باپ کا نافرمان، گستاخ اور دشمن بن جائے تو دوسرا سعید بیٹا اپنے شقی بھائی کا ہمدرد اور معاون نہیں رہتا۔ مگر ہاں اس بات کی کوشش ضرور کرتا ہے کہ باپ کا نافرمان و شقی بھائی اپنی نافرمانی اور شقاوت سے باز آ کر باپ کا فرمانبردار بن جائے اور جس طرح بھی ممکن ہو باپ کو راضی کر لے۔ اسی طرح جو شخص اپنے خالق اور ربّ کا نافرمان ہے وہ ان شخصوں کی حمایت کا مستحق نہیں رہتا جو اپنے ربّ کے فرمانبردار ہیں۔

ہاں وہ اس بات کے ضرور مستحق ہیں کہ ان کو اپنے ربّ کے احکام کی فرمانبرداری و اطاعت کی طرف ترغیب اور توجہ دلائی جائے اور ان کے ساتھ احکام ربانی کے موافق عملدرآمد کیا جائے۔

کیا نسلی عصبیت کو مٹا دینا چاہیے؟

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب نسلی تعلقات کے تقاضے بھی فطری اور جذباتی چیز ہیں تو پھر قبائلی یا نسلی محبت یا عصبیت کو کیسے مٹایا جا سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب ذرا بھی مشکل نہیں۔ نسلی اور قبائلی خصوصیت و محبت ہر گز فنا نہیں ہونی چاہیے۔ اس کا باقی رہنا ضروری ہے اور وہ مٹائی نہیں جا سکتی لیکن وہ اس خصوصیت کے مقابلے میں جو خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق سے پیدا ہوتی ہے ہرگز نہیں لائی جا سکتی۔ نسلی وقبائلی تعلق خدائی تعلق کی ضد ہر گز نہیں ہے بلکہ خاندانی و نسلی تعلق خدائی تعلق کو سمجھنے کیلئے وہی مرتبہ رکھتا ہے جو حروف تہجی کو عالم فاضل بننے کے لئے ہے کہ جب تک پہلے حروف تہجی نہ سیکھے جائیں کتاب خوانی کی نوبت نہ آئے گی نسلی و خاندانی وقبائلی و قومی خصوصیات اس وقت تک ضرور عامل رہیں گی جب تک کہ خصوصیات و تعلقات ربیؔ پر اثر انداز نہ ہوں۔ مثلاً ہمارا حقیقی بھائی اور ایک غیر قوم کا شخص دونوں توحید باری تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور خدائے تعالیٰ کے فرمانبردار و پرستار ہیں تو ہم مجبور ہیں کہ اپنے بھائی کے ساتھ زیادہ محبت کا برتاؤ کریں لیکن اگر ہمارا حقیقی بھائی خدانخواستہ مشرک یا منکر خدا ہے اور دوسرا غیر قوم کا شخص مُوحد اور خدا پرست ہے تو اس حالت میں ہمارا تعلق اسی دوسری قوم کے شخص سے زیادہ ہوگا اور وہی ہم کو زیادہ عزیز ہونا چاہیے۔

نسلی تعلق امتداد زمانہ کے ساتھ انسانوں میں محبت و شفقت کو پھیلاتا اور خدائی تعلق نسلی تعلق کو بجنسہٖ باقی رکھتا ہوا تمام انسانوں میں نہایت قوی محبت اور وحدت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ عالم انسانیت کی فلاح و بہبود اسی میں ہے کہ وہ وحدت اور عام انسانی شفقت کی طرف قدم بڑھائے۔ شرائع الٰہیہ نے اس حد تک نسل اور خون کے تعلق کو ضرور اہمیت دی ہے جو معاشرتی سہولتوں کے لئے ناگزیر ہے اور جس کے بغیر انسانوں کا اپنی انسانی شرافت کو پالینا دشوار تھا۔ مثلاً

ماں باپ کے حقوق اولاد پر اور اولاد کے حقوق ماں باپ پر۔ یا انسانی مملوکات کے ترکہ میں حق وراثت یا خاوند بیوی کے حقوق اور قریبی رشتہ داروں اور جدی و مادری رشتوں کے مدارج وغیرہ مربیانہ اور فطری تعلقات جو دور کے رشتہ داروں میں فطرتاً اس مربیّانہ حیثیت سے باقی نہیں رہتے۔ بلکہ ایک خاندان کے اغراض و مقاصد دوسرے ہم قبیلہ خاندان کے مقاصد سے رقابت پیدا کر سکتے ہیں۔ شریعت کے ذریعے نسل و خاندان کے فطری تقاضے مکمل طور پر تسکین پا لیتے ہیں اور خدائی حقوق یا دینی حقوق سے قطعاً متصادم نہیں ہو سکتے لیکن چالاک اور خود غرض انسانوں نے قومی تعلقات اور قومی حقوق کو حد سے زیادہ اہمیت اور خدائی حقوق پر فضیلت دے کر ہمیشہ اپنا اُلو سیدھا کرنے کی کوشش کی اور مظلوم وجہول انسان اس شیطانی چکمے میں مبتلا ہوتا رہا۔ بنی اسرائیل نے ایک زمانے میں دعویٰ کیا تھا کہ ساری دنیا میں اولاد اسرائیل ہونے کی وجہ سے ہم ہی برتر اور فائق ہیں۔ ہندوستان میں برہمنوں نے اپنے آپ کو برہما کے منہ سے پیدا ہونے والا یعنی نسلی خصوصیات کی بناء پر پاک اور اپنے مقابلے میں دوسروں کو پیدائشی و نسلی طور پر ناپاک قرار دیا۔ شودروں کو آج بھی ان کے اعمال و عقائد کی وجہ سے نہیں بلکہ نسلی اور قومی اعتبار سے نجس اور پلید سمجھا جاتا ہے اسی طرح امریکہ میں حبشیوں کو محض امتیاز نسل کے سبب بہت سے انسانی حقوق سے محروم رکھا گیا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ یورپین، یورشین اور انڈین عیسائی عقیدہ و مذہب کے اعتبار سے ایک ہی عیسائی ہیں۔ مگر گرجے اور عبادت خانے تینوں کے جدا جدا، یعنی مذہب اور خدا شناسی کے تعلق پر امتیاز نسل غالب ہے۔ یہ قومی امتیاز جو اپنی مناسب حد کے اندر انسان کے لئے ایک رحمت و نعمت تھا۔ انسان کے بے لگام جذبات اور احکام آلٰہیہ کی نافرمانی اور خدا تعالیٰ سے بے تعلقی اختیار کرنے کے سبب انسان کے لئے سب سے بڑی لعنت بن گیا''۔

ہم مولانا کے ان اقتباسات کے ایک ایک حرف کی تصدیق کرتے ہیں اور بیانگ دہل اعلان کرتے ہیں کہ نسل و خاندان پر ناجائز فخر کرنا، دوسری قوم اور نسل کے آدمیوں کو ذلیل سمجھنا اور

نفسانیت و خود بینی کو اپنا شعار بنا لینا ابلیسی جذبہ اور پرلے درجے کی شیطانیت ہے۔

اَفرَئیت مَنِ اَلتخذ اِلٰھہٗ ھَوَاہُ وَ اضلّہ اللّٰہ عَلیٰ علم۔ (الجاثیہ۔ ۳)

''کیا تم نے اس شخص کی حالت پر غور نہیں کیا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا معبود بنالیا ہے اور خدائے تعالیٰ نے باوجود اس کے کہ وہ علم و دانش رکھتا تھا اسے گمراہ کردیا!''۔

لیکن کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ بلوچوں نے عام مسلمانوں سے الگ اپنے لئے کہیں کوئی مسجد بنائی ہے کہیں انہوں نے حسب نسب کے لحاظ سے کم درجہ کے پیچھے نماز پڑھنے سے احتراز کیا ہے؟ کیا کہیں انہوں نے ایک دستر خوان پر غیر بلوچ کے ساتھ کھانا کھانے سے پرہیز کیا ہے؟ اگر یہ باتیں بلوچوں میں نہیں، اور وہ آپس میں نسل اور خون کی بنا پر محبت کرتے ہیں تو اس میں کسی کا کیا بگڑتا ہے۔

کیا رسول اللہ ﷺ نے نسلی تقسیم کو مٹانے کی کوشش فرمائی تھی؟

کہا جاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑی محنت اور کوشش سے نسلی تقسیم کو مٹایا تھا۔ میرے خیال میں حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی نسلی تفاخر کو اس حد تک مٹانے کی کوشش فرمائی ہے جو حدود اللہ سے متصادم ہوتا ہو ورنہ تحدیث نعمت کے طور پر تو حضور نے خود کئی بار حضرت ابراہیم، سیدنا ہاشم اور سیدنا عبدالمطلب کی اولاد ہونے پر فخر و مباہات کا اظہار فرمایا ہے۔ چنانچہ حنین کی جنگ میں جبکہ مسلمانوں کو تقریباً شکست ہو چکی تھی اور آپ کو پیچھے ہٹنے کا مشورہ دیا گیا تو آپؐ نے بڑے جوش سے یہ رجز پڑھا۔

اَنَا اَلنبِی لَا کَذِب اَنَا ابنُ عَبد المطلب

اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نہ صرف قبائلی تقسیم قائم رکھی بلکہ لوگوں کو یہ ہدایت فرمائی کہ وہ امیروں کی تکریم کریں۔ بنو قریظہ کی جنگ میں جب حضرت سعد بن معاذؓ خچر پر سوار

کر کے لائے گئے تھے تو آپ نے حاضرین سے فرمایا کہ اٹھ کر اپنے سردار کی طرف جاؤ اور انہیں اتار لو۔

(طبقات ابن سعد خرد ساد س ص ۵)

عبداللہ بن شدادؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سعد بن معاذؓ کے پاس گئے جو اپنی جان دے رہے تھے۔ فرمایا ''اے سردار قوم! اللہ تجھے جزائے خیر دے''

(طبقات ابن سعد جز و ساد س ص ۱۲)

سید القوم خادمھم اور اصغر القوم خادمھم بھی اسی بنا پر کہا گیا ہے۔ اگر قومیت ہی تسلیم نہ ہوتی تو پھر یہ سیادت اور خدمت بے معنی رہ جاتی۔ قبائلی تقسیم کا حضور کو اس قدر خیال تھا کہ جب قبیلہ تجیب کے تیرہ افراد اپنے مال مویشی لے کر حاضر ہوئے تو حضور نے فرمایا کہ اسے واپس لے جاؤ اور اپنے قبیلہ کے فقراء پر تقسیم کر دو۔

(رحمۃ اللعالمین جلد اوّل ص ۲۲۹)

قبائلی جائزہ

جب حضرت نے مکہ مکرمہ پر حملہ کرنے کا ارادہ فرمایا تو تمام قبائل کو طلب کیا۔ان کی عسکری قوت کا جائزہ لینے کا جو انضباط اوقات مرتب فرمایا وہ کچھ اس طرح تھا۔

یکم رمضان	قبیلہ مزینہ
۲ رمضان	قبیلہ جہنیہ
۳ رمضان	بنو خزاعہ
۴ رمضان	بنو تمیم ۔ بنو حندف
۵ رمضان	بنی قحطان، حمیر، مرہ، فہر، سلام، علقمہ، قرانصہ، نجیب، کلاب، ذوالکلاع، شنوخ، کہلان
۶ رمضان	شیبان، ضیغم، دوس، حاملہ

ومرتاب، مراد کندہ، سکاسک، لسکون، بنو عدنان، بنو عیس، بنو رحلان،

ربیعہ، غفار، لخمؓ، جذام، ہذیل، قیس بن غیلان، مرہ، ذیبان، صعصعہ، منصور، ہوازن، کنانہ، عقیل۔

اگر حضور قبائلی تقسیم کے مخالف ہوتے تو اس طرح قبائل وار رئیس قبیلہ کی قیادت میں لشکر کو مرتب کرنے کا حکم نہ دیتے۔ممکن ہے بعض حضرات کا خیال ہو کہ چونکہ یہ لوگ قبائل وار آباد تھے۔اس لئے انہیں قبائلی صورت میں طلب کیا گیا۔نہیں ذرا آگے چلئے اور اصابہ اور الاستیعاب کی اس عبارت پر غور فرمائیے۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دے دیا کہ تمام قبائل کو اطلاع کر دی جائے کہ

آنحضرتؐ تمہارے پاس تشریف لاتے ہیں۔ جب تمام قبائل کو یہ مژدۂ فرحت افزا پہنچا تو سب اپنے خیموں میں گئے اور لباس واسلحہ سے آراستہ ہو کر حضورؐ کی تشریف آوری کے منتظر کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مع اپنے اہل بیت واصحاب کے وہاں پہنچے تو ہر ہر قبیلہ کے آدمی اپنے اپنے گھوڑوں سے اتر اتر کر آتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام کرتے تھے۔ ہاتھ کو بوسہ دیتے تھے اور پھر آپ کی اجازت سے اپنی جگہ واپس چلے جاتے تھے۔''
(الاستیعاب۔ اصابہ)

اسلامی لشکر کے قبائلی رسالے

اب قبائل کا مکہ مکرمہ کو روانگی کا نقشہ ملاحظہ ہو۔ ابوسفیان اور حضرت عباس مکہ مکرمہ کے قریب ایک پہاڑی کی ٹیکری پر بیٹھے اسلامی لشکر کے گزرنے کا منظر دیکھ رہے تھے۔ سب سے پہلے ایک دستہ فوج کا آیا جس کا سردار عباس بن مرداس سلمی تھا۔ یہ تمام لوگ غرق آہن تھے اور سروں پر بھی خود رکھے ہوئے تھے۔ سوائے آنکھوں کے ان کا چہرہ کا اور کوئی حصہ نظر نہیں آتا تھا اور بڑے بہادر دکھائی دیتے تھے۔ جب ان کے قریب پہنچے تو انہوں نے رجزیہ اشعار پڑھے۔ جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف تھی اور اس بات کا اظہار ہوتا تھا کہ ہمارے دلوں کا غیظ وغضب اس وقت ختم ہوگا جب ہم مکہ فتح کر لیں گے۔

ابوسفیان نے سر اٹھا کر حضرت عباسؓ سے پوچھا کہ یہ کون شخص تھا؟ آپ نے فرمایا کہ یہ عباس بن مرداس سلمیؓ ہے اور قبیلہ بنوسلیم کا سردار ہے۔

اتنے میں دوسرا قبیلہ آیا ان کا سردار عقبہ بن عامر الجھنی تھا۔ یہ لوگ بھی خود اور زرہیں پہنے ہوئے تھے۔ سوائے آنکھوں کے ان کے چہرے کا اور کوئی حصہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

ابوسفیان نے کہا یہ کون لوگ تھے؟ حضرت عباس نے فرمایا کہ یہ بنوجہینہ کے لوگ تھے

یہ سن کر ابوسفیان نے ایک لمبی سانس لی اور کہا پہلے یہ لوگ کیسے تھے اور اب کیسے ہیں (یعنی اسلام کی بدولت یہ کتنی ترقی کر گئے ہیں)۔

اتنے میں تیسرا قبیلہ آیا۔ یہ لوگ بھی غرق آہن تھے۔ ان کے سردار نعمان بن منذر مزنی رضؓ تھے۔ انہوں نے بھی ابوسفیان کے قریب آ کر رجزیہ اشعار پڑھے اور گزر کر چلے گئے۔ ابوسفیان نے حضرت عباس سے دریافت کیا کہ یہ کون لوگ تھے؟ فرمایا کہ یہ نعمان بن منذر تھے اور قبیلہ مزنیہ تھا۔

اتنے میں ایک اور قبیلہ نمودار ہوا۔ اس کے سردار اقرع رضؓ بن جانس تمیمی تھے۔ انہوں نے بھی رجزیہ اشعار پڑھے اور علَم ہلا کر ابوسفیان کو ڈرایا اور گزر کر چلے گئے۔ حضرت عباس نے بتایا کہ یہ بنوتمیم تھے۔

پھر ایک اور قبیلہ نمودار ہوا۔ اس کے سردار وحیہ کلبی تھے۔ یہ ایسے خوبصورت تھے کہ کبھی کبھی جبرائیل ان کی صورت میں تشریف لایا کرتے تھے۔ حضرت عباس نے فرمایا کہ یہ قبیلہ بنو حمیر ہے۔

ان کے بعد ایک اور سردار اپنے لشکر کے ساتھ گزرا۔ حضرت عباس رضؓ نے بتایا کہ یہ بنوکندہ تھے اور ان کے سردار مقداد رضؓ بن الاسود ہیں۔

اتنے میں بنونزار و مضر آئے پھر ابوذر غفاری رضؓ اپنے قبیلے کو لئے ہوئے گزرے۔

پھر بنوعبس آئے جن کے سردار عمار رضؓ بن عیسیٰ تھے پھر بنوثقیف آئے ان کے سردار عبداللہ بن مسعود رضؓ ثقفی تھے۔ انہوں نے بھی رجزیہ اشعار پڑھے اور وہی الفاظ کہے جو پہلے سردار کہتے گئے تھے۔ حضرت عباس رضؓ ابوسفیان کو ہر ہر قبیلے کا پتہ اور شجاعت کی اطلاع فرماتے جاتے تھے۔ اس وقت ابوسفیان نے کہا۔

"یا ابا الفضل! میں نے کسریٰ نوشیروان، مقوقش بادشاہ مصر کے لشکروں کو دیکھا ہے لیکن ایسا (یعنی جو حسن ترتیب اور شجاعت اس لشکر میں نظر آ رہی ہے وہ کسریٰ اور مقوقش کے لشکروں کو

خواب میں بھی نصیب نہیں!)لشکر کسی بادشاہ کا نظر نہیں آیا تمہارے بھتیجے تو بڑے بادشاہ ہو گئے!'' حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ بادشاہت نہیں، نبوت ہے!''

بنو ہاشم

اتنے میں ایک غبار نظر آیا جس میں ہندی تلواریں چمک رہی تھیں۔ جب گرد چھٹی تو ایک ہزار سوار نمودار ہوئے۔ زرہیں پہنے۔ حجازی عمامہ باندھے، ہاتھوں میں نیزہ سنبھالے عربی گھوڑوں پر سوار تھے۔ یہ سوار بنی ہاشم تھے۔ ان کے سردار ایک جوان نہایت حسین و جمیل، صاحب حیاء ووقار، وصاحب ہیبت وافتخار تھے۔ سر پر خود اور اس پر عمامہ، ہاتھ میں یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عَلَم۔ حضرت عباس کہتے ہیں کہ اس سردار نے جب مجھے دیکھا تو مسکرائے اور سلام کیا۔ اس وقت میں نے پہچانا کہ یہ میرے بیٹے فضل رضی اللہ عنہ ہیں۔ انہوں نے ابوسفیان کو دیکھ کر نیزہ ہلایا اور فرمایا۔

اَنظر مَا اَعَدَاللہ لَکَ وَلقَومِکَ

''دیکھ! خدا نے تیرے اور تیری قوم کیلئے کیا لشکر تیار کر کے بھیجا ہے!''

فضل بن عباس

ابوسفیان نے کہا کہ ''یہ کون بہادر تھا۔ کیا کوئی روم کا سردار تھا۔ یا کوئی شیر جرار تھا کہ تمہارے بھتیجے کا مطیع ہو گیا ہے''۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''کیا تم نے نہیں پہچانا؟ یہ بنو ہاشم تھے اور ان کا سردار میرا بیٹا فضل تھا!'' ابوسفیان نے کہا۔ ''سچ کہتے ہو! بہادروں کے بیٹے بہادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ تمہارے اس بیٹے میں عبدالمطلب کی بہت سی مشابہت ہے!''

سیدنا علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اچانک ایک اور غبار نظر آیا۔ جس میں ہزار سوار تھے۔ زرہیں پہنے، ہندی تلواریں لٹکائے عربی گھوڑوں پر سوار، نیزے ہاتھوں میں لئے ہوئے نہایت شجاعت

ومردانگی سے بادصرصر کی طرح قریب آئے۔ ان کے سردار بھاری جسم کے آدمی تھے۔ شجاعت ان کے نورانی چہرہ سے ٹپکتی تھی۔ سامنے دو علَم تھے۔ ان کے رجزیہ اشعار سن کر ابوسفیان گھبرا گیا۔ پوچھا یہ کون بہادر تھے کہ اس کے رعب سے میرے اوسان خطا ہو گئے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ میرے بھتیجے (سیدنا) علی ابن ابی طالب (کرم اللہ وجہہ) تھے۔

جمال نبوت

اتنے میں ایک اور غبار نظر آیا اس میں بکثرت سوار تھے اور تسبیح وتہلیل کی آوازیں آرہی تھیں۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بعد تامّل کے معلوم ہوا کہ وسط لشکر میں ہزار در ہزار قدسی نفوس کے درمیان چودھویں کے چاند کی مانند چمکتا ہوا نورانی چہرہ، خوشبو بدن سے مہکتی ہوئی۔ گھونگھریالے بال، سراج منیر حضرت سیدنا ومولانا محمد بن عبداللہ بن مطلب بن ہاشم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ حضرت عباس فرماتے ہیں کہ آنحضرت جب ابوسفیان کے قریب تشریف لائے تو فرمایا۔

اَللّٰھُمَ اھْدِہِ الاَسلام رَحُببْ اِلَیہ الاِیمَان اِنکَ عَلٰی کُل شَییٍ قَدِیر o

اے اللہ! ابوسفیان کو اسلام کی ہدایت دے اور اس کے دل میں ایمان کی محبت ڈال۔ بیشک تجھے ہر چیز پر قدرت حاصل ہے۔

خدا نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور ابوسفیان کے دل سے ''غطائے کفر'' ہٹا دیا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ جب مکہ مکرمہ کے قریب پہنچیں تو تمام جھنڈوں کے پھریرے کھول دیئے جائیں۔ چنانچہ حکم کی تعمیل میں دوسرے جھنڈوں کے ساتھ شاہ نجاشی کا علم بھی جو حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی معرفت آیا تھا کھولا گیا اور جب شاہ خیبر مرحب یہودی کا نیزہ سیدنا حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو عطا ہوا تو اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر انوار وتجلیات کی کثرت دیکھ کر اپنا مشہور قصیدہ پڑھنا شروع کیا۔ (خصائص الکبریٰ ص ۲۶۸)

مجھے احساس ہے کہ مضمون کافی طویل ہو گیا ہے مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ اسلامی لشکر کا پورا نقشہ آپ کے سامنے رکھے بغیر آگے گزر جاؤں۔ یہ رمضان ۸ ہجری کا واقعہ ہے۔اس کے تین سال اور کچھ ماہ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رفیق اعلیٰ کو لبیک کہہ گئے اس تاریخی شہادت سے پتہ چلتا ہے کہ نسلی تقسیم کو سرکار نبوت نے نہ صرف قائم رکھا بلکہ اسے فروغ دیا۔قبائل کی اقتصادی اور معاشی حالت اس قدر بہتر ہو چکی تھی کہ ابوسفیان ان کے عسکری نظام اور ان کے تہور کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے خاندان سے اگرچہ ہزارہا تکلیفیں پہنچی تھیں۔قریش نے آپ سے اور آپ کے خاندان سے کامل مقاطعہ کر کے تین برس تک شعب ابی طالب میں محصور رکھا۔بیع وشریٰ،مناکحت،کھانا پینا سب بند کر دیا اور آنحضرت کے وہ بہادر چچا،جن کو خدا نے اسد اللہ اور اسد الرسول کا خطاب عنایت فرمایا تھا انہیں دھوکہ اور فریب سے قتل کر کے کلیجہ نکال کر چبایا گیا۔مثلہ کیا اس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا صدمہ ہوا اور جنازے پر اتنا روئے کہ آپ کی چیخ نکل گئی۔بار بار فرماتے تھے

یَاحَمزہ!یَاعمّ رسول اللّٰہ! یَااسداللّٰہ وَرسولہ یافاعل الخَیرات یا کَاشفُ اِلکربات۔

بی بی زینب کو نیزہ مار کر اونٹ سے گرایا گیا،آپؐ کے دانت شہید کئے اور اتنی روحانی و جسمانی کلفتیں پہنچائیں کہ ان کے ذکر سے جسم تھرا اُٹھتا ہے۔رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن با ایں ہمہ ان کی ذلت اور بربادی گوارا نہیں!

اپنے قبیلے کی تباہی کے تصور سے نبوت آبدیدہ ہو گئی!

اصابہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر کو تیاری کا حکم دے دیا لیکن اپنا عزم کسی پر ظاہر نہ فرمایا۔مجاہدین نے کہا۔کاش! ہمیں علم ہو جاتا کہ ہم نے دور کا سفر کرنا ہے تو ہم ہتھیاروں کے بوجھ سے ہلکے ہو جاتے اور ہتھیار اتار کر سفر کرتے۔ یہ سن کر مالک بن کعب

انصاری نے کہا۔ ’’دیکھو! میں ایک تدبیر سے معلوم کرتا ہوں!‘‘ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دست بوسی کے بعد چند اشعار عرض کرنے کی اجازت چاہی۔ حضور نے اجازت دے دی تو انہوں نے بہت سے اشعار پڑھے جن میں جنگ خیبر کا ذکر اور اطاعت رسول کا اظہار تھا۔ آخر میں یہ اشعار پڑھے۔

وَنسبی الات والعزیٰ جمیعاً ونسلبھا القلائد والسکرنا

وتقسمُ الحسان لکل وَجہ وَنترُک دَارھم منھم خلوفَا

ترجمہ: ’’ہم لات اور عزیٰ کو توڑ دیں گے اور ہاروں و جھانجھنوں کو کھینچ پھینکیں گے خوبصورت عورتوں کو (جو غنیمت میں آئیں گی) آپس میں تقسیم کریں گے اور ان کے گھروں کو لوٹ کر خالی کر دیں گے‘‘۔

اس کے بعد وہ اٹھ کر لشکر کی طرف آیا اور لوگوں سے کہا خدا کی قسم! تم لوگ مکہ مکرمہ کی مہم پر جا رہے ہو کیونکہ جب میں نے لات وعزیٰ کے توڑنے کا ذکر کیا تو آنحضرت نے تبسم فرمایا اور جب قریش عورتوں کے قید ہونے کا ذکر آیا تو سرکار دو عالم بے اختیار آبدیدہ ہو گئے۔ بعض دفعہ دانا بھی کیا نادانی کی بات کرتے ہیں۔ اگر ہمارے معترض دوست کسی غیر مسلم سے یہ واقعہ ارشاد فرمانے کے بعد اعلان کریں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نسلی تقسیم کو مٹا دیا تھا تو وہ کیا کہے گا بنو قریضہ کی جنگ کا مکہ مکرمہ کی جنگ سے مقابلہ کیجئے۔ اس قبیلے نے بھی عہد شکنی کی تھی اور مکہ مکرمہ کے قریش نے بھی عہد شکنی کی۔ وہ قتل کر دیئے گئے اور یہاں عفو عام کا اعلان ہوا۔ یہ رعایت قریش سے کیوں ہوئی؟ حالانکہ یہ بنو قریظہ سے زیادہ گردن زدنی تھے۔ انہوں نے تو ایک دفعہ بد عہدی کی اور ان کی ساری عمر بد عہدی میں گزری۔ نہ صرف یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر سے نکالا بلکہ مدینہ منورہ تک چین نہ لینے دیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ خدا کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے قریش کی رعایت مطلوب تھی!۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر کافروں اور منافقوں نے تہمت لگائی تو صفائی کے لئے سورہ نور نازل ہوئی۔ اگر مخدومۂ کائنات کو زوجہ رسول ہونے کا شرف حاصل نہ ہوتا تو کیا ایسی صورت حال میں ان کے حق میں ایک سورہ تو بڑی چیز ہے ایک آیت کے اترنے کا بھی کوئی امکان تھا؟

یہ صرف رسول اللہ کی شان تھی کہ جس کو بھی اس پاک ذات سے رتی بھر نسبی یا روحانی وابستگی کا شرف حاصل ہوا وہ بارگاہ الٰہی میں منظور نظر ہو گیا۔

ہمیں کہا جاتا ہے کہ ہم اپنے قبیلے کی اصلاح کے ارادہ سے باز آجائیں۔ انہیں منظم نہ کریں ان کی تاریخ نہ لکھیں۔ کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کس حکم کی رو سے ہمیں ایسی دعوت دے رہے ہیں؟ یہ صحیح ہے کہ تمام انبیاء نے اپنی قوم کے کافروں سے جہاد کیا۔ ان سے قطع تعلق کیا لیکن یہ کہاں ثابت ہے کہ قوم کے مومنوں سے بھی کنارہ کر لیا یا ان کی جتھہ بندی توڑ دی بلکہ ہمارے پاس تو اس امر کا یہی ثبوت موجود ہے کہ مسلمانوں کو اپنے کافر رشتہ داروں سے بھی مروت اور احسان کرنے سے نہیں روکا گیا!

۹ھ میں ثقیف کا وفد حاضر ہوا۔ مغیرہ بن شعبہؓ نے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ ”یہ میری قوم کے لوگ ہیں کیا میں انہیں اپنے پاس اتار لوں؟ اور ان کی خاطر و تواضع کروں؟“ حضور نے فرمایا: لَا اَمنعک اَن تکرم قومک (رحمتہ اللعالمین جلد اوّل ص ۲۱۶) ”میں تمہیں اپنی قوم کی تعظیم و تکریم کرنے سے منع نہیں کرتا لیکن انہیں ایسی جگہ اتارو جہاں قرآن کی آواز ان کے کانوں میں پڑے“۔

ہم بھی حضرت مغیرہؓ کی طرح اپنی قوم کی اصلاح کے خواہشمند ہیں۔ ہمارے دلوں میں ان کے سود و بہبود کا جذبہ موجزن ہے۔ جب نبوت نے منع نہیں کیا تو دوسروں کو منع کرنے کا کیا حق ہے؟

آپ کو علم ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ کا بچہ فوت ہو گیا اور اسے لے کر المعلاۃ میں دفن کرنے گئے تو پہاڑ کو خطاب کر کے فرمایا کہ ”جو کچھ میرے دل پر گزر رہا ہے اگر تجھ پر گزرتا تو

ٹُوریزہ ریزہ ہوجاتا!‘‘

بدر کی جنگ کے بعد جب حضرت عباسؓ کی مشکیں کسی گئیں تو ان کی یہ تکلیف آپ سے برداشت نہ ہوسکی۔ رات بھر بے چین رہے اور ادھر ادھر کروٹیں بدلتے تھے۔ کسی نے عرض کی کہ ’’حضور آرام کیوں نہیں فرماتے؟‘‘۔ فرمایا ’’عباسؓ کے کراہنے سے مجھے نیند نہیں آتی۔ اس شخص نے جا کر حضرت عباسؓ کے بند ڈھیلے کردیئے۔

آپ کے داماد ابوالعاص کفر کی حالت میں مدینہ آئے۔ ان کا مال مسلمانوں کے ہاتھ لگ چکا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ’’اس شخص کا تعلق جو ہم سے ہے وہ تم جانتے ہی ہو۔ تم کو اس کا مال ہاتھ لگ گیا ہے اور وہ داد الٰہی ہے۔ مگر میں پسند کرتا ہوں کہ تم اس پر احسان کرو اور مال واپس کردو۔ لیکن اگر تم اس سے انکاری ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ تم اس پر احسان کرو اور مال واپس کردو لیکن اگر تم کو اس سے بھی انکار ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ تم زیادہ حقدار ہو!‘‘

ایک اور دفعہ جب ابوالعاص کے فدیہ میں بی بی زینب نے اپنا ہار پیش کیا تو حضرت آبدیدہ ہوگئے اور فرمایا یہ خدیجہؓ کا ہار ہے جو اس نے جہیز میں میری لڑکی زینب کو دیا تھا۔ مسلمان یہ کہاں برداشت کرسکتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روحانی کوفت ہو، فوراً ہار بی بی زینبؓ کے ہاں پہنچا دیا۔

ابولہب نے آپ کو تنگ کرنے میں کیا کسر چھوڑی تھی۔ یہاں تک کہ قرآن میں ’’تَبَّتْ یَدَا اَبِی لَھَب‘‘ (ابولہب کے ہاتھ ٹوٹیں) ایک سورۃ اتری۔ طارق بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں مکہ مکرمہ کے ’’سوق المجاز‘‘ میں کھڑا تھا۔ اتنے میں ایک شخص وہاں آیا۔ جو پکار پکار کر کہتا تھا۔ ’’یَاایھَا النَاس !قُولو الاَالٰہَ اِلا اللّٰہ تفلحوا!‘‘ (لوگو، لاالہ الااللہ کہو، فلاح پاؤ گے) ایک دوسرا شخص اس کے پیچھے پیچھے آیا جو اسے کنکریاں مارتا تھا اور کہتا تھا۔ یَاایھَاالنَاسَ لا تَصدّقوہ فَاِنہ کَذّاب ’’(لوگو! اسے سچا نہ سمجھو، یہ جھوٹا ہے) میں نے دریافت کیا کہ ’’یہ کون بزرگ ہیں؟‘‘ لوگوں

نے کہا کہ یہ تو بنی ہاشم کا ایک شخص ہے جو اپنے آپ کو رسول اللہ سمجھتا ہے اور یہ دوسرا اس کا چچا عبدالعزیٰ (ابولہب) ہے۔ (رحمتہ اللعالمین جلد اول ص ۲: ۷)

جب مکہ فتح ہوا تو اسی ابولہب کے بچوں کی ڈھنڈیا پڑی۔ حضرت عباس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''عتبہ ومعتب! ابولہب کے بیٹے کہاں ہیں؟'' میں نے عرض کی کہ ''ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جو بھاگ گئے ہیں اور مسلمان نہیں ہوئے''۔ آپ نے فرمایا کہ جاؤ انہیں ڈھونڈ کے لے آؤ!''

یہ حکم سن کر حضرت عباس سوار ہوئے اور ان دونوں کو تلاش کر کے لے آئے۔ آپ نے انہیں اسلام لانے کے لئے فرمایا۔ وہ حضور کا یہ اخلاق اور صلہ رحمی دیکھ کر مسلمان ہو گئے اور بیعت کر لی۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور ان دونوں بھائیوں کا ہاتھ پکڑ کر خانہ کعبہ میں لے گئے۔ کھڑے ہو کر دعا کی۔ جب واپس تشریف لائے تو حضرت کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ حضرت عباس نے فرمایا۔ ''یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ اسی طرح مسرور رکھے آج میں آپ کو بہت خوش پاتا ہوں''۔ فرمایا۔

''میں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ ان دونوں میرے بھائیوں کو مجھے عنایت فرما دے۔ اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول فرمائی اور ان کو مجھے دے دیا۔''

(خصائص الکبریٰ مطبوعہ مصر ص ۲۶۴)

یہ مضمون بہت طویل ہے اور اسے جتنی طوالت دی جائے اتنا طویل ہو سکتا ہے۔ مختصراً عرض کرتا ہوں کہ نسلی تقسیم ایک فطری تقسیم ہے۔ تمام انبیاء اور صلحاء اس سے متاثر رہے ہیں۔ ہمارے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیا سے زیادہ اپنی قوم سے تکالیف پہنچیں لیکن حضور نے اس کی تمام لغزشیں معاف کر دیں۔ فتح مکہ کے بعد حضور اپنے سب سے بڑے دشمن ابوسفیان کو مکہ مکرمہ کی سرداری دے کر مدینہ واپس تشریف لے آئے۔ حضرت کے بعد خلافت کا مرحلہ

پیش آیا اور انصار نے بنوسقیفہ میں اجتماع عام طلب کر کے اپنے آپ کو خلافت کا مستحق گردانناچاہا تو اس وقت یہ ارشاد نبوی پیش کیا گیا کہ اَلائمۃُ مِنَ القُریش۔جس پر انصار قریش کے حق میں دست بردار ہو گئے۔

خلافت راشدہ کے دور میں ہی بنو امیہ نے بنو ہاشم کے مقابلے میں کافی طاقت پکڑ لی تھی۔ چنانچہ کربلا کے ریگ زار میں بنو امیہ نے بنو ہاشم کو شہید کیا۔ کچھ عرصہ تک انہوں نے حکومت کی پھر بنو ہاشم کو موقع ملا۔ وہ ابھرے اور بنو امیہ سے ایسا شدید انتقام لیا کہ ان کی قبریں تک کھود ڈالیں۔ بنو ہاشم کے بعد بنو فاطمی ابھرے اور انہوں نے بغداد کے مقابلے میں مصر کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ یہ قبائلی تقسیم نہ جاہلیت کے دور میں ختم ہوئی اور نہ اسلام کے بابرکت عہد میں ،اسلام نے اس روح کی ضرور مخالفت کی جو بعض اوقات نسلی امتیازات کو مذہب پر غالب کر دیتی ہے۔اس جذبہ کے ہم بھی مخالف ہیں اور انشاء اللہ رہیں گے۔

وَاللّٰہ عَلیٰ مانقُول وَکیل

تعارف

بلوچ! دنیا کی وہ بہادر اور غیور قوم ہے جو پاکستان میں کروڑوں کی تعداد میں پھیلی ہوئی ہے۔ مکران، لسبیلہ، قلات، خیرپور، میرپور، حیدرآباد، جیکب آباد، سبی، کوئٹہ، ڈیرہ غازی خان اور مظفر گڑھ میں ان کا طوطی بول رہا ہے۔ جھنگ، سرگودھا، شاہ پور، ملتان اور ساہیوال میں اگرچہ اقتدار اعلیٰ کے مالک نہیں تاہم سیاسی اور زرعی حیثیت میں دوسروں سے کم بھی نہیں۔ پاکستان سے باہر بھی اس عظیم قوم کی کافی تعداد موجود ہے۔ افغانستان کا جنوبی حصہ ایرانی بلوچستان، سیستان میں لاکھوں بلوچ آباد ہیں۔ پاک و ہند کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس قوم کا ماضی نہایت تابناک رہا ہے۔ یہ وہی قوم ہے جس نے اپنی طاقت اور قوت کے بل بوتے پر وسط پنجاب سے ایران کی سرحد تک بہت بڑی ریاست پیدا کر کے اس میں ڈیرہ اسماعیل خان، کوٹ ادو، کوٹ فتح خان، ڈیرہ غازی خان، مٹھن کوٹ، میرپور، خیرپور، شہداد پور اور ٹنڈو الہ یار جیسے عظیم شہروں کی بنیاد ڈالی۔

جس نے ہمایوں کے لٹے ہوئے قافلے کو نہ صرف پناہ دی بلکہ مرزا عسکری کی شدید ممانعت کے باوجود اسے اپنی حفاظت میں ایران پہنچایا اور جب وہ تازہ دم ہو کر دلی کی طرف پلٹا تو سوری خاندان سے تخت حاصل کرنے میں اس کی بیش از بیش امداد کی۔

جس نے بلوچ پور کے میدان میں شہزادہ خرم کی بے پناہ طاقت کے طوفان سے عظمت جہانگیری کو بال بال بچالیا۔

مغلوں کے آخری دور میں جب مرہٹوں اور بھرت پور کے جاٹوں نے اسلامی ہند کا ناک میں دم کر دیا تھا تو اس وقت یہی سرفروش اور جاں باز بلوچ ہی تھے۔ جنہوں نے سورج مل جاٹ اور جنوبی ہند کے چوہوں کو کچل کر رکھ دیا تھا۔

۱۸۵۷ء میں لال قلعہ نے جب مسلمانوں کو آخری بار اسلام کے ناموس کی حفاظت کیلئے پکارا تو سب سے پہلے سنگ سرخ کی دیواروں پر جانیں نچھاور کرنے والے فرخ نگر اور بہادر گڑھ کے بلوچ شہزادے ہی تھے جو خود بھی شمع حریت پر سے تصدّق ہو گئے اور اپنی سرسبز و شاداب ریاستوں کو بھی اسلامی آن کی بھینٹ چڑھا کر دنیا میں وفا شعاری اور وطن دوستی کی عدیم النظیر مثال چھوڑ گئے۔

۱۹۴۷ء جبکہ مشرقی پنجاب مسلمان، بچوں، بوڑھوں اور بے کس عورتوں کے خون سے ہولی کھیل رہا تھا جبکہ مسلمان کا لہو پانی کی طرح ارزاں ہو چکا تھا جبکہ لاکھوں مخدرات عصمت زہر میں بجھی ہوئی برچھیوں، سنگینیوں، کرپانوں، تلواروں اور تھری ناٹ تھری کی رائفلوں میں گھر کر رہ گئی تھیں اور جبکہ انسانیت مشرقی پنجاب کی بربریت اور سفا کی پر آٹھ آٹھ آنسو رو رہی تھی اس وقت یہی بلوچ ہی تو تھے جو سر دھڑ کی بازی لگا کر انہیں بدمعاشوں اور غنڈوں کے ورطۂ ہلاکت سے نکال لائے۔ جنہوں نے وادی کشمیر میں درّانہ وار پہنچ کر پاکستان کا جھنڈا بلند کیا۔

ہاں! یہ وہی قوم ہے جس کا بہادر فرزند میجر شفقت بلوچ 1965ء کی جنگ میں صرف ایک سو سپاہیوں کی معیت میں بھارت کے پورے ڈویژن اور بے شمار ٹینکوں کے سامنے سد سکندری بن کر ڈٹ گیا۔ نہ صرف یہ کہ دشمن کو ۹ گھنٹے تک روکے رکھا بلکہ اس کے تین ٹینک بھی تباہ کر دیئے اور دشمن انتہائی کوشش کے باوجود ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکا۔ نیز کرنل ذوالفقار علی خان بلوچ، میجر نذر حسین خان بلوچ، میجر انور حسین خان بلوچ، کرنل شاہنواز خان بلوچ، میجر آغا عبدالرحمن خان احمدزئی بلوچ، میجر حق نواز خان بلوچ، کیپٹن فاروق احمد خان بلوچ، صوبیدار گل نواز خان بلوچ، نائب صوبیدار اکبر علی خان بلوچ بھی اسی شجاع قوم کے بہادر سپوت ہیں۔ جنہوں نے پاکستان اور بھارت کی سترہ روزہ جنگ میں دشمنوں کے دانت کھٹے کر دیئے تھے۔ ہاں! یہ وہی قوم ہے جس کے خوشحال افراد نے کروڑوں روپے دفاعی فنڈ میں دیئے۔ اگر نواب گورمانی نے سیر

حاصل اراضی کے بیسیوں مربعے پیش کئے اور خان قلات نے مجموعی طور پر سات لاکھ روپے نقد اور چھتیس ہزار کارتوس نذر کئے تو سندھ کی نادار بڑھیا ملوکن بی بی نے اپنے اکلوتے فرزند جگر بند خمیسو بروہی کو قوم اور ملک پر سے تصدق کرنے کے لئے آگے بڑھایا اور اسے وصیت کی کہ بیٹا! گولی سینے پر کھانا ورنہ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی!''

ہاں! یہ وہی قوم ہے جس کا شاندار ماضی ہزار در ہزار شجاعت و بصالت بذل وسخا، غیرت وحمیت اور وعدہ ایفائی کے زرّین کارناموں سے بھرا پڑا ہے۔

ہاں! یہ وہی قوم ہے جسے ایک پیر مرد کی زبانی شاعر انقلاب حکیم الامت علامہ محمد اقبال اس طرح سے خطاب فرماتے ہیں۔

اس دشت سے بہتر ہے دلی نہ بخارا ہو تیرے بیاباں کی فضا تجھ کو گوارا
وادی یہ ہماری ہے یہ صحرا بھی ہمارا جس سمت کو چاہے صفت سیل رواں چل
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا دنیا کو ہے پھر معرکہ روح و بدن پیش
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا اللہ کو پامردی مومن پہ بھروسہ
توفیق عمل مانگ ''نیاگان کہن'' سے
شاہاں چہ عجب گر بہ نوازند گدارا

بلوچی حسب نسب

بلوچ قوم کی تاریخ مدوّن کرنے میں بڑی دقت حسب نسب کے بنیادی اختلافات ہیں۔ بلوچی ادب کا دعوی ہے کہ بلوچ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی اولاد ہیں ہیں۔ چنانچہ قومی شاعر کہتا ہے۔

ما مریدوں یاعلی ءَ
دین ایمان ثبیتیں
حمزہ اولاد بلوچی صوب
درگاہ گزیں

"ہم بلوچ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مرید ہیں اور ہمارا دین وایمان ثابت ہے۔ بلوچ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی اولاد ہیں اور انہیں درگاہ الٰہی سے فتح حاصل ہے!"

صاحب تحفتہ الکرام اس بیان کی حمایت میں لکھتے ہیں کہ

"حضرت امیر حمزہؓ اتفاقاً کسی شکار کے تعاقب میں جاتے جاتے ایک کفت دست میدان میں جا پڑے۔ وہاں ایک پری نمودار ہوئی۔ جس سے امیر حمزہؓ کو تعلق ہو گیا۔ چند روز دل بہلانے کے بعد حمزہؓ تو اپنے وطن چلے گئے مگر وہ پری حاملہ ہو گئی اور اس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جس کا نام عبدالرحمن رکھا گیا۔ ان سے ابان پیدا ہوئے۔ ان سے ہارون اور ان سے محمد۔ محمد بن ہارون محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ کی مہم پر آیا اس کی سات بیویاں تھیں۔ جن سے پچاس اولادیں ہوئیں۔ بلوچ انہی کی اولاد ہیں!"۔

ممکن ہے بلوچی ادب کا محولہ بالا شعر تحفتہ الکرام کی اسی روایت پر ہی موزوں کیا گیا ہو۔ مگر

یہ دنیا بھر کی تاریخوں کا فیصلہ ہے کہ حضرت امیر حمزہؓ کے تمام صاحبزادے عین عالم شباب میں فی سبیل اللہ لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ اس لئے آپ کی اولاد نرینہ نہیں رہی۔ تحفتہ الکرام کی اس شرمناک اور لغو حکایت کو تو کوئی قبول ہی نہیں کرے گا۔

بنو حمزہؓ

ابن سعد نے صاف لکھا ہے کہ حضرت حمزہؓ کے لڑکوں میں سے ایک یعلیٰ تھے۔ جن کی وجہ سے (سیدنا) حمزہؓ کی کنیت ''ابوالعلیٰ'' تھی۔ ایک فرزند عامر تھے جو لاولد فوت ہوئے۔ ایک فرزند عمارہ تھے۔ وہ بھی بے اولاد رخصت ہوئے یعلیٰ بن حمزہ کے پانچ صاحبزادے تھے۔ عمارہ، فضل، زبیر، عقیل اور محمد یہ پانچوں عالم فانی سے عالم بقا کو لاولد رخصت ہوئے۔ (سیدنا) حمزہ بن عبدالمطلب کے نہ بیٹے رہے اور نہ پوتے۔ جنگ اُحد میں جب آپ شہید ہوئے تو سوائے امامہ ایک معصوم بچی کے آپ پر کوئی رونے والا نہیں تھا۔

حضرت حمزہؓ کا ماتم

عطا بن یسار فرماتے ہیں کہ جب حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُحد سے فارغ ہو کر مدینہ طیبہ واپس لوٹے تو نبی عبدالاشہل کے محلے سے گزرے۔ اس خاندان کی عورتوں کو ان لوگوں پر روتے سنا جو اُحد میں شہید ہوئے تھے۔ گھر پہنچے تو حضرت حمزہ کے گھر کو سنسان پایا۔ سیّدہ امامہؓ بے ماں باپ کی ننھی سی یتیم بچی بے خبر چارپائی پر پڑی سو رہی تھی اور حضرت کی بی بی حزن وملال کی پوٹ بنی دل ہی دل میں اپنے آپ کو کھائے جا رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت کا دل بھر آیا۔ فرمایا ''کیا حمزہؓ پر رونے والے نہیں ہیں؟''

ثنائے رسول حضرت سعد بن معاذؓ نے سنا تو لمبے لمبے ڈگ بھرتے اپنے گھر پہنچے اور انہیں حکم دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر جائیں اور (سیدنا) حمزہؓ پر روئیں۔

(طبقات ابن سعد جزو اوّل ص ۱۶ مطبوعہ حیدر آباد دکن)

محمد بن ابراہیم فرماتے ہیں کہ حضرت سعد بن معاذؓ اپنی عورتوں کو مسجد کے دروازے پر اس حالت میں لائے کہ وہ (سیدنا) حمزہؓ پر رو رہی تھیں۔ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب ہم نے ان کی بیویوں کو روتے دیکھا تو ہم بھی ان کے ساتھ رونے لگیں۔
(طبقات ص ۱۶)

حضرت عطا ابن یسار سے روایت ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا رونا سنا تو فرمایا "یہ کون ہیں؟" عرض کیا "انصار کی عورتیں!" آپ ان کے پاس نکل کر آئے اور فرمایا (طبقات ص ۱۷۔) (بروایت عبدالعزیز بن محمد) (طبقات ابن سعد ص ۱۷) اللہ تم پر رحمت فرمائے تمہاری اولاد پر اور تمہاری اولاد کی اولاد پر ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عہنا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز عشا پڑھ کر لیٹ گئے (کئی دنوں کی تھکاوٹ کے سبب) آپ کو نیند آ گئی لیکن ہم سب عورتیں بدستور روتی رہیں۔آپ بیدار ہوئے تو فرمایا۔

"تو کیا وہ بی بیاں ابھی تک یہیں ہیں؟ انہیں کہو کہ اب وہ واپس چلی جائیں!"

آپ نے ان کے لئے ان کے شوہروں اور بچوں کیلئے دعا کی۔ (طبقات ابن سعد ص ۱۷)

اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے پہلے فوت ہو چکے تھے اور ان پر کوئی رونے والا نہیں تھا۔اگر آپ کے جوان بیٹے زندہ ہوتے تو لازماً ان کی مائیں اور بیویاں بھی ہوتیں اور وہ اتنا روتیں کہ ایک کہرام سا برپا ہو جاتا۔

سیّدہ امامہ

اب اور سنئے۔اُحد کے واقعہ کے بعد حضرت حمزہؓ کی ایک یتیم بچی رہ گئی جس کی والدہ سلمیٰ بنت عمیس پہلے سے فوت ہو چکی تھیں۔حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم حج کے بعد مکہ مکرمہ سے باہر آئے اور قافلہ مدینہ منورہ کو روانہ ہونے لگا تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی سیّدہ امامہ رضؓ اے چچا، اے چچا کہتی ہوئی آپ کے پیچھے دوڑیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے لپک کر اس معصومہ کا ہاتھ تھام لیا اور حضرت فاطمہ سے فرمایا۔ "چچا کی بیٹی کو اپنے ہمراہ سوار کرلو! بخاری شریف کا اصل متن یہ ہے:۔

"**فقد مضی الاجل فخرج النبی صلی اللہؐ علیہ وسلم فتبعتھم ابنة حمزة یاعم یاعم فتناولھا علی رضی اللہؓ عنه فاخذ بیدھا وقال لفاطمة رضی اللہؓ عنھا دونک ابنة عمک احملیھا**"

(تجرید البخاری ص ۵۰۱)

اس سے بھی صاف ظاہر ہے کہ بن ماں باپ کے یہ یتیم بچی کوئی وارث نہیں رکھتی تھی اور سنیے بخاری شریف کی روایت ہے کہ:۔

"پھر حضرت علیؓ، زید اور جعفر نے اس کی بابت باہم جھگڑا کیا۔ حضرت علیؓ فرماتے تھے۔ میں اس لڑکی کا زیادہ مستحق ہوں۔ یہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور جعفرؓ کہتے تھے کہ وہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور اس کی خالہ میرے نکاح میں ہے اور حضرت زیدؓ نے فرمایا کہ وہ میرے بھائی کی بیٹی ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ صاحبزادی اس کی خالہ کو دلادی اور فرمایا۔ خالہ بمنزلہ ماں کے ہے"۔

اصل متن ملاحظہ فرمائیں۔

قال فاختصم فیھا علی وزید وجعفر فقال علی انا احق بھَا وھی ابنَة عمیّ وقال جعفر ابنة عمی وخالَتھا تحتَی وقال زیَد ابنة اخی فَقَضیٰ بھیاالنبی صلی اللہؐ علیه وسلم، لخَالتَھا وَقَال اَلخالَةُ بمنزلة اُلام۔

(تجرید بخاری ۵۰۱)

کیااس تفصیل کے بعد اس امر کا امکان رہ جاتا ہے کہ سیدنا حمزہؓ اولاد نرینہ چھوڑ کر شہید ہوئے تھے۔ اب سیّدہ امامہ رضی اللہ عنہا کی شادی کا ذکر بھی ملاحظہ فرمائیں۔ حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سیّدہ امامہ رضی اللہ عنہا قریش کی تمام عورتوں سے زیادہ خوبصورت تھیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے چاہا کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس خاتون کبریٰ سے نکاح کرلیں مگر آپ نے انکار کردیا اور فرمایا:

"اے علیؓ! کیا تجھے معلوم نہیں کہ حمزہؓ میرے رضاعی بھائی ہیں اور اللہ نے جو نسب سے حرام کیا ہے وہ رضاع سے بھی حرام ہے"۔

(طبقات ابن سعد جلد اوّل صفحہ ۵،۶)

ابن سعد ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیّدہ امامہؓ کا نکاح مسلمہ بن ابی سلمہ سے کردیا تھا۔

(طبقات ابن سعد جلد اوّل ص ۵،۶)

الحاج میر محمد بخش خان تالپور کا مؤقف

الحاج میر محمد بخش خان تالپور اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:۔

"یہ تسلیم ہے کہ مدینہ طیبہ میں حضرت امیرؓ کی اولاد نہیں رہی تھی لیکن کیا اس امر کا بھی آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے کہ حضرت امیرؓ نے عراق یا شام کی طرف کوئی شادی نہیں کی۔ تجارتی سلسلے میں امرائے عرب کا شام کی طرف جانا احادیث اور تواریخ سے ثابت ہے۔ حضرت امیرؓ شکاری انسان تھے۔ ان کا اکثر وقت سیر وسفر اور دشت وجبل میں بسر ہوتا تھا۔ ابن بطوطہ اور ناصر خسرو نے اپنے سفرناموں میں بیت المقدس کے ایک نشان کا ذکر کیا ہے جسے لوگ سیدنا امیر حمزہؓ کی سپر سے منسوب کرتے ہیں۔ عین ممکن ہے حضرت نے اس جانب کسی خاتون سے شادی کرلی

ہو اور اس کی اولاد وہیں ننھیال میں رہ گئی ہو۔ اگر بلوچ قوم کا وجود حضرت امیرؓ سے صدیوں پہلے ثابت ہو بھی جائے تو اس امر کا قرینہ باقی رہ جاتا ہے کہ شاید میر جلال خان اور اس کی اولاد کو سیدنا امیر حمزہؓ کی ذریت ہونے کا شرف حاصل ہو"۔

جناب تالپور کا بیان اس خیال کو تقویت پہنچاتا ہے جس کی بناء پر میر علی شیر قانع نے تحفتہ الکرام میں امیرؓ سے کسی پری کا حاملہ ہونا بیان کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ پری سے مراد کوئی خوبصورت عورت ہو، ویسے شعراء خوبرو عورتوں کو پریوں سے تشبیہہ دیتے چلے آئے ہیں۔ تالپور صاحب کا یہ ارشاد بھی بجا ہے کہ حضرت امیر حمزہؓ شکاری آدمی تھے اور دوسرے شرفاء عرب کی طرح سیر وسفر کے بھی عادی تھے۔ لیکن بایں ہمہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ جونہی کفار نے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ستانا شروع کیا تھا۔ حضرت حمزہؓ نے حدود حرم سے باہر نکلنا ترک کر دیا تھا اور مکہ مکرمہ کے مضافات میں ہی شکار کے لئے چکر کاٹ کر واپس آجاتے تھے۔ اگر جوانی کے دنوں میں حضرت نے شام کی طرف کسی خاتون سے نکاح فرمایا ہوتا تو اس سے اس قدر تغافل نہ فرماتے۔ خلافت راشدہ کے بابرکت دور میں شام پر یزید بن ابی سفیان اور پھر معاویہ بن سفیان گورنر رہے خلافت راشدہ کے بعد ایک صدی تک شام پر بنوامیہ کی حکومت رہی ہے۔ بنو ہاشم بھی برابر آتے جاتے رہے ہیں اگر حضرت حمزہؓ کا کوئی فرزند اس جانب ہوتا تو عرب مورخین اس کا ذکر ضرور کرتے اور بچے کی ماں بھی خلفائے راشدین یا مسلمان سپہ سالاروں سے ضرور رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کرتی۔ اسے نامور باپ کے نامور فرزند کو دنیائے اسلام سے چھپانے کی ضرورت کیا تھی۔ بلکہ اگر اس قسم کا کوئی نوجوان دارالخلافت میں آتا تو اسے نہ صرف ہاشمی سرآنکھوں پر جگہ دیتے بلکہ خلفائے راشدین بہادر باپ کے بہادر بیٹے کی اعلیٰ حربی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے اور اسے خالد بن ولید اور سعد بن ابی وقاص کی طرح سپہ سالاری کے ممتاز عہدوں پر فائز کرتے لیکن جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ ابن سعد صاف لکھتا ہے کہ سیدنا حمزہؓ نے

اپنے پیچھے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔

حسب نسب سے متعلق بزدار قبائل کا نظریہ

مولانا امیر احمد فاضل دیوبند بزدار قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھی اندرون پہاڑ کے باشندے ہیں۔ مولانا عبدالقادر بزدار کی وساطت سے انہوں نے ایک شجرہ مرحمت کیا ہے۔ اس میں ''حمزہ'' کا نام موجود ہے مگر یہ بزرگوار حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی اولاد سے ہیں اور اس شجرے میں نقص یہ ہے کہ ایک جگہ عباسؓ بن علیؓ پر اور دوسری جگہ محمد بن حنیفہؓ بن علیؓ پر منتہی ہوتا ہے اور اسماء کی ترتیب بھی صحیح نہیں۔ اس شجرے کی دونوں صورتیں درج ذیل ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ

عباس	محمد الاکبر یا محمد حنفیہ
عبداللہ	میر حمزہ
حسن	بلوچ
حمزۃ الاکبر	لعل بیگ
بلوچ	شاہ بیگ
رند	رند
شیہک	شیہک
چاکر	چاکر

الحاج میر محمد بخش خان تالپور اور دوسرے حمزئی ذہن کے مورخین کے لئے یہ شجرے بحث و فکر کا ایک اور دروازہ کھول دیتے ہیں۔ اگر کوئی ماہر انساب کسی تسلی بخش نتیجے پر پہنچ سکے تو ہمیں ضرور مطلع کرے۔

بلوچ عبدالغفار خان کا نظریہ

بلوچ عبدالغفار خان ایڈووکیٹ کراچی کی تحقیق یہ ہے کہ:۔ ''بلوچ قوم انمار عربوں کی ایک شاخ ہے۔ زمانہ عتیق میں انمار قوم کا نجد اور حجاز سے کچھ ایسا ارتحال ہوا کہ قدیم وطن میں ان کا کوئی نام لیوا بھی نہ رہا۔ تخمیناً ۷۰۰ء قبل مسیح میں انمار قوم شیراز کے مغرب میں دجلہ اور فرات تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس علاقے کو نمر بھی کہتے ہیں''۔

(بلوچی حسب نسب پر ایک نظر۔ بلوچی دنیا اکتوبر ۱۹۵۸ء ص ۳۹)

بلوچ صاحب کی اس عبارت کا ملخّص یہ ہے کہ بلوچ جناب انمار کی اولاد ہیں اور یہ لوگ ۷۰۰ء قبل مسیح دجلہ اور فرات تک پھیل چکے تھے۔ ہمیں بلوچ صاحب کے اس دعوے سے اس لئے اتفاق نہیں کہ وہ بنی انمار کا وجود ۷۰۰ء قبل مسیح تک تسلیم کرتے ہیں حالانکہ خود انمار حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کم وبیش ایک سو برس بعد پیدا ہوئے ابن سعد کی یہ روایت ملاحظہ ہو۔ ''ہشام بن محمد کہتے ہیں کہ معد عیسیٰ بن مریم کے عہد میں تھے''۔

(طبقات ابن سعد جلد اوّل ص ۵۳)

سعد انمار کے دادا بزرگوار تھے۔ نیز آپ کا یہ ارشاد بھی محل نظر ہے کہ جو نمری دجلہ اور فرات تک پھیلے ہوئے تھے وہ انمار بن نزار بن معد کی اولاد تھے کیونکہ انمار نام کے ایک بزرگ سبا بن یقطن کی اولاد سے بھی گزرے ہیں۔ طبقات میں لکھا ہے کہ سبا کی اولاد سے یمن میں چھ قبیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک قبیلہ انمار ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے انمار کی بابت

سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔

"انمار وہی ہیں جن سے قبائل خشعم و بجیلہ نکلے ہیں"۔

(طبقات ابن سعد جلد ا ص ۳۸)۔

گویا جن نمریوں کا بلوچ صاحب نے ذکر کیا ہے وہ انمار بن سبا کی اولاد تو ہو سکتے ہیں۔مگر انمار بن نزار بن سعد کے نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ نمر نام کا علاقہ انہی سے منسوب ہو کیونکہ انمار بن سبا حضرت ابراھیم علیہ السلام کے معاصر ہیں اور انمار بن نزار کا دادا معد حضرت عیسی علیہ السلام کا ہمزمان ہے، بلکہ محمد بن سائب تو یہ بھی کہتے ہیں کہ جب بخت نصر (بنوکدنصر) نے یمن کے قلعوں پر حملہ کیا تھا حضرت سعد بن عدنان اس مہم میں بخت نصری کے ساتھ تھے۔ اس تجزی کے بعد بلوچ صاحب ہی بتائیں کہ ان کے اس دعوی میں کہ بلوچ کلیتہ جناب انمار کی نسل سے ہیں۔ کتنا وزن باقی رہ جاتا ہے۔

میر سردار خان گشکوری کے نظریات

میر سردار خان گشکوری پہلے بلوچ مورخ ہیں جنہوں نے سالہا سال کی دماغی کاوش کے بعد ایک ضخیم بلوچ تاریخ مدون کی اور اسے انگریزی زبان کا جامہ پہنایا آپ نے لفظ بلوچ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"The name Baloch has come to us after going through several changes both in pronuiciation and script.The old kushite Aarm had been Bealoch(بعلوث)or Bealoth(بیلوث)the Assyrion Babyluion or Kaldion wrote and Pronouneed it as Belous(بیلوس) the madievol Arabs termed it as Balos(بلوص)or Baloj(بلوج) and the persion name had been Baluch (Page 17.)

یعنی لفظ بلوچ تلفظ اور تحریر کی مختلف تبدیلیوں کے مراحل طے کرنے کے بعد ہم تک پہنچا

ہے۔قدیم کوش رسم الخط ”بعلوث“ یا ”بیلوث“ تھا۔اسیریا، بابل اور کلدانی عوام نے اپنی تحریروں میں بیلوس یا بعلوس لکھا ہے۔قرون وسطی کے عربوں نے بلوص یا بلوج اور اہل فارس نے اسے ”بلوچ“ سے موسوم کیا۔

بلوچی حسب نسب پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”بلوچ کوش خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کا مورث اعلیٰ بلوص تھا۔جسے نمرود بھی کہتے تھے“۔گشکوری صاحب کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔

"The Baluchis thus belong to the Royal Family of the Kaldian tribs of the Kushite race the Airst mighty ruler of the first Kaldian dynsty was nimrod the Belus etc(History of Baluch Race (Page 18).

ڈاکٹر میر عالم راقب کو گشکوری صاحب کی تحقیق سے اتفاق نہیں۔آپ اپنے مضمون ”نمرود“ میں لکھتے ہیں کہ:۔

”بلوص“ اور ”نمرود“ دو جداگانہ شخصیتیں ہیں۔نمرود کا اصل نام گلگمش تھا نہ کہ بلوص۔مسٹر ہومیل (Hommal) کا بیان ہے کہ نمرود نہ تو سمریل تھا اور نہ ہی سامی النسل بلکہ اس کی نسل کا معلوم کرنا ایک لاینحل مسئلہ ہے“۔(گشتنا بیبلوئنز انڈ اسیرنیز ص ۲۹۲) پروفیسر جی سمتھ (G.Smith) پوری بحث کے بعد ثابت کرتے ہیں کہ نمرود (گلگمش) نسلاً حبشی تھا۔ (کالدین اکاؤنٹ آف جنس (۱۷۴ و ۱۹۴)

عہدنامہ قدیم میں صاف لکھا ہے کہ:۔

”کوش سے نمرود پیدا ہوا“ (باب ۶، آیت ۹۔ پیدائش)

”نمرود کے خصائل عادات اور حالات وغیرہ گلگمش پر پورے اترتے ہیں۔بالفاظ دیگر گلگمش ہی نمرود تھا۔جس کا دارالسلطنت اُر (Uruk) تھا۔وہ شمس پنشتم کی نسل سے تھا اور شمس پنشتم حامی نسل تھا“۔

(ہیروِ آف دی چالڈین ایپک ص ۴۲۱۔ مصنفہ پروفیسر سیس (Sayce))

اس بات کے ثابت ہو جانے سے کہ گلگمش ہی نمرود تھا اور وہ حامی النسل تھا۔ یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ جناب گشگوری نے نمرود کو صحیح طور پر حامی النسل بتایا ہے۔ مگر اس کا دوسرا رخ کہ بلوص ہی نمرود تھا۔ نظر ثانی کا محتاج ہے۔

میر محمد حسین خان عنقا کی تصریحات

جناب محمد حسین عنقا بلوچستان کے سیاسی لیڈر ہی نہیں بلکہ شاعر، ادیب اور ناقد بھی ہیں۔ بلوچ قوم کے حسب نسب پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

''اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا کی کوئی قوم خالص نہیں۔ مختلف حالات کے تحت صدیوں سے آ کر ایک علاقہ میں آباد ہو جانے والے افراد خاندان اور قبائل رفتہ رفتہ ایک ہی ثقافت کے تابع ہو جاتے اور اسی نام کو قبول کر لیتے ہیں جو اس علاقے کا نام پہلے پڑ چکا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ دعویٰ کرنا صحیح نہ ہوگا کہ آج جتنے خاندان یا قبائل بلوچ کہلاتے ہیں وہ سب کے سب واقعی بلوچ نسل سے ہیں۔ سندھ میں جس طرح مختلف اقوام آباد ہیں اور سندھی کہلاتی ہیں اسی طرح بلوچستان میں آباد اور اس کے نیک و بد سے متاثر ہونے والے بلوچ کہلاتے ہیں!''

(بلوچی دنیا اکتوبر ۶۵ء، بلوچ ص ۱۶)

جناب تالپور کے تاثرات

میر حاجی محمد بخش خان تالپور نے عنقا صاحب کے اس نظریہ کی تائید کرتے ہوئے بلوچ قوم کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اصلی، الحاقی اور ادغامی۔ ان کے نزدیک بلوچوں کا پہلا جتھ یا گروہ وہ ہے جو اصل بلوچ نسل سے ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو اصل بلوچوں میں آ کر ایسا شیر و شکر ہوا کہ اب ان میں فرق کرنا بہت مشکل ہے اور تیسرا گروہ وہ ہے جس نے بلوچستان میں بلوچوں کے تسلط اور غلبہ کے باعث بلوچی لباس اور زبان اپنالی اور جب بلوچستان یا اپنے

زاد بوم (Native Place) سے باہر نکلے تو اپنے آپ کو بلوچ کہلانا شروع کر دیا اور ایسے حضرات کا ہی نظریہ ہے کہ لاشار ایک میدان ہے جس کے رہنے والے لاشاری ہیں یا مگس ایک ندی ہے جہاں کے رہنے والے مگسی کہلاتے ہیں۔ مگر دراصل ایسا نہیں ہے۔ لاشار واقعی ایک سطح مرتفع ہے لیکن اس کا نام لاشاریوں کے آباد ہونے کی وجہ سے پڑ گیا۔ جب لاشاریوں کی اکثریت وہاں سے ہجرت کر کے نکل گئی تو مختلف قومیں اور قبیلے اس میں بس گئے اور لاشار کی وجہ سے لاشاری کہلائے مگر لاشاری ان کی شہریت ہے قومیت نہیں۔ ایسے ہی تیسری قسم کے ادغامی بلوچ ہیں جن کو اپنا قبیلہ اور ذات یا تو یاد نہیں ہے یا پھر ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔ خود کو قصر قندی، بمپوری اور گوادری کہلاتے ہیں۔ جیسے کوئی لاہوری، ملتانی، حیدرآبادی یا میرپوری کہلائے۔ یہ ان کی شہریت ہے قومیت نہیں! ۔ اب چونکہ یہ تیسری قسم کے ادغامی بلوچ نہ تو جلال خان کی اولاد ہیں، نہ ان کو جانتے ہیں۔ اس لئے ان کو میر جلال خان کی کیا خبر! سرے سے وہ رند، ہوت، کورائی اور جتوئی پسران میر جلال خان اور ان کے اولاد کے بھی منکر ہیں۔

(بلوچی دنیا، اگست ۱۹۶۷ء ص ۱۱، ۱۲)

عنقا صاحب کے شبہات

جناب عنقا کو گشکوری سے یہ شکایت بھی ہے کہ انہوں نے اس قومی روایت کو ماخذ کیوں قرار دیا ہے کہ:۔

''بلوچ حلب سے کرمان آئے اور پھر مکران پہنچ کر اس قدر مٹ گئے کہ بس ایک ہی فرد جلال خان کی اولاد بن کر رہ گئے۔ گویا جلال خان آدمی نہیں ''مورو ملخ'' تھا کہ چند ہی صدیوں میں ایک کروڑ ۸۰ لاکھ کی قوم بن گیا''۔

(بلوچی دنیا مارچ ۱۹۶۰ء ص ۵۳)

''آگے چل کر گشکوری صاحب میر جلال خان کی اولاد کو سمیٹ کر دو بنا دیتے ہیں۔ رند اور

لاشار اور پھر یہ نہیں کہ ان میں اقتدار اور ایک سرداری بنانے کی خاطر لڑائی ہوئی بلکہ یہ بتاتے ہیں کہ گوہر نامی ایک عورت پر ان میں چالیس سال لڑائی ہوتی رہی۔

"بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است"

اس بحث کا یہ موقع نہیں، جب میر جلال خان اور ان کی اولاد کا ذکر آئے گا اس وقت ہم کھل کر اس موضوع پر کچھ عرض کرسکیں گے۔ بہرحال اس نظریے میں ہم جناب گشکوری کے مؤید ہیں اور اپنی قومی روایات کی تکذیب نہیں کرتے۔ بلاشبہ بلوچ کرمان سے آئے مگر مکران میں آ کر مٹے نہیں بلکہ پورے ملک میں پھیل گئے۔ انہیں جس طرح مختلف وادیوں اور گھاٹیوں میں آباد کیا گیا اس کی تفصیل بھی ان اشعار میں درج ہے۔ تمام بلوچوں کو فرد واحد کی اولاد بنانے کی کوشش کسی نے نہیں کی۔ البتہ میر جلال خان ان تمام بلوچوں کا سردار اور حکمران ضرور تھا۔

اسی طرح جناب گشکوری نے میر جلال خان کی اولاد کو نہیں سمیٹا بلکہ حالات نے سمیٹ کر انہیں دو متحارب جتھوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ سینکڑوں قبائلی اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے پہلے فرد واحد (میر جلال خان) کے تابع تھے۔ اب وہ سرداریوں میں بٹ گئے۔ کسی نے رند سردار سے رابطہ کیا اور کوئی لاشار سردار کے مطیع ہو گیا۔ اس میں "بوالعجبی" اور "عقل سوختگی" کی تو بات نہیں اور پھر لڑائی گوہر کے لئے نہیں بلکہ ایک اصول کی خاطر لڑی گئی تھی۔ ایک قبیلے کے چند نوجوانوں نے رند سردار کے علاقے میں گھس کر ایک بیوہ خاتون کے شتر بچے ذبح کر دیئے اس کا انتقام رند سردار کے لئے ضروری تھا یہی امر ایک طویل جنگ کا سبب بن گیا۔ خیر! یہ فروعی باتیں ہیں جن کا نسب کی ابتدائی بحث سے کوئی تعلق نہیں۔

ڈاکٹر میر عالم خان راقبؔ کا نظریہ

راقب صاحب کو اپنی قوم سے والہانہ محبت ہے۔ انہوں نے سالہا سال کی کاوش کے بعد بلوچ قوم کی تاریخ لکھی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ بلوچ قوم بلوص بن الکاؤس شاہ بابل کی اولاد ہے۔ آپ نے اس روایت کی بھی تائید کی ہے کہ بلوچ ۸۵۴ قبل مسیح موجود تھے۔

مولانا دیر مانی اور مولانا سر بازی کے نظریات

مولانا عبداللہ دیر مانی ایک متبحر عالم اور سرگرم مبلغ دین ہیں۔ آپ کو تاریخ سے بھی گہرا شغف رہا ہے۔ آپ کا دعوی ہے کہ:

"زمانہ قدیم سے بلوچوں کا وطن مکران ہے۔ سندھ تک اس پورے ملک کا نام قدیم میں مکران تھا اور یہ ایک بڑی آزاد مملکت تھی جو بعد میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر مختلف ناموں سے پکاری جانے لگی"۔ (بلوچی دنیا۔ نومبر ۱۹۵۹ء ص ۴۱)

مولانا قاضی عبدالصمد سر بازی بھی اسی خیال کے موید ہیں۔ اپنے گراں قدر مقالہ "بلوچ اور بلوچستان" میں لکھتے ہیں کہ:

"بلوچوں کا مرکزی (اصلی) وطن بلوچستان ہے۔ جس کو تاریخوں میں پہلے مکران کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ جس طرح افغانوں اور ترکوں کے متعلق یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ افغان، افغانستان میں اور ترک، ترکستان میں کہاں سے آکر آباد ہوئے۔ اسی طرح یہ سوال بھی بے جا ہے کہ بلوچ کہاں سے آکر بلوچستان میں آباد ہوئے"۔

(بلوچی دنیا۔ ستمبر ۱۹۶۶ء ص ۱۴)

جن حضرات نے بلوچوں کا نسب نامہ مسخ کیا ہے۔ اس کی دست برد سے مکران بھی نہیں بچ سکا۔ ایک صاحب اس امر کے مدعی ہیں کہ بلوچی زبان میں "مُک" کھجور کو کہتے ہیں۔ گویا

''مکران'' نخلستان کا مترادف ہے۔ دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ دراصل یہ لفظ ایرانیوں کا بخشا ہوا ''ماہی خوران'' ہے جو امتداد زمانہ سے مکران ہو گیا۔ حالانکہ ''مکران'' ایک عظیم شخصیت کا نام ہے۔ جس کا ''ماہی خوران'' یا ''مک ران'' سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

صاحب معجم البلدان لکھتے ہیں کہ ''مؤرخین نے کہا کہ مکران کا نام اس وجہ سے مکران رکھا گیا ہے کہ اس میں مکران بن فارک بن سام بن نوح علیہ السلام ''کرمان'' کے بھائی نے فردکش ہو کر اس کو اپنا وطن بنایا تھا جبکہ بابل میں زبانوں کی ایک دوسرے سے علیحدگی ہوئی تھی۔

اس تاریخ کے مندرجات سے واضح ہو گیا کہ سام بن نوح علیہ السلام کے پوتے مکران نے اس ملک میں فردکش ہو کر اسے اپنا وطن عزیز بنایا۔ پھر ان کا یہ وطن مالوف ان کے نام پر ''مکران'' مشہور ہو گیا۔ اس طرح ''کرمان'' کا ملک ان کے بھائی جناب کرمان کے نام پر مشہور ہوا ہے اور یہ کہ جناب مکران اپنے ساتھ ایک مستقل زبان بھی لے کر آئے تھے جو مکران میں جاری و ساری رہی اور ظاہر ہے کہ یہ بلوچی زبان ہے کیونکہ مکران کے باشندوں کی زبان بلوچی ہے اور اگر وہ کوئی اور زبان لے کر آتے تو وہی زبان مکران میں رواج پذیر ہوتی لیکن مکران کے باشندے بلوچ اور ان کی زبان بلوچی ہے۔ اس تاریخی حوالے سے مکران اور اس کی زبان (بلوچی) کی قدامت کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے''۔

(مکران اور اس کا جغرافیہ۔ بلوچی دنیا۔ ستمبر ۱۹۶۶ء۔ ص ۳۱)

اس نظریہ سے قدیم وجدید مؤرخین کا اختلاف واتفاق

افسوس ہے بہت کم مورخین نے اس نظریہ سے اتفاق کیا ہے۔ میر حاجی محمد بخش خان تالپور لکھتے ہیں کہ ممکن ہے کہ مکران کی سرزمین جناب مکران سے موسوم ہو۔ اہل مکران بھی مکران اعظم کی اولاد ہو سکتے ہیں۔ مگر وہ مکرانی سے بلوچ کیسے بن گئے؟

جناب تالپور کا خیال ہے کہ بلوچ حلب سے اس ملک میں آئے ہیں۔ اہل مکران نے ان کے غلبہ کے زیر اثر ان کے تمدن کو قبول کرلیا تھا اور اپنے آپ کو بلوچ کہلانے لگے اس لئے یہ الحاقی بلوچ کہے جاسکتے ہیں۔ کرنل ای موکلر اپنے ایک مضمون ''بلوچوں کی اصل'' میں لکھتے ہیں کہ بیشتر بلوچ مکران کے باشندے ہیں اور یونانیوں نے جس علاقے کو گدروشیا کہا وہیں سے ان کا تعلق ہے۔ موکلر اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ بلوچوں کے چند قبائل حلب سے ضرور آئے ہیں وہ رند بلوچوں کو حارث علافی کی اولاد ظاہر کرتا ہے جس نے حجاج کے خلاف لڑائی کی تھی اور ۸۶ ہجری میں بالآخر سندھ کی جانب فرار ہونے پر مجبور ہو گیا تھا۔

(بلوچوں کی اصل از کرنل ای موکلر مطبوعہ جرنل آف ایشاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۹۰ء)

پوٹنگر اور خانیکوف بلوچوں کو نسلاً ترکمان ظاہر کرتے ہیں لیکن اس کے برعکس سرطاس ہالڈک اور دوسرے متعدد مورخین نے بھی بلوچوں کو عربی النسل قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ بلوچ عرب سے ہجرت کر کے پہلے ایرانی سرحدات پر آباد ہوئے اور پھر یہاں سے کرمان سیستان اور مکران سے ہوتے ہوئے سندھ اور پنجاب تک پھیل گئے۔

ملک محمد رمضان بلوچ کا نظریہ

جدید اصابت الرائے محققین میں سے ملک محمد رمضان بلوچ ایڈیٹر ''ساربان'' مستونگ بھی بلوچوں کو عربی النسل تسلیم کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ:۔

''ظہور اسلام سے قبل عرب میں ایک قوم بلوص آباد تھی جو بڑی جنگجو، بہادر اور وقت کی ایک نہایت معزز قوم تھی۔ زاں بعد عرب کی سرزمین نور اسلام سے منور ہوئی تو اس قوم نے اسلام قبول کرلیا۔ یہی بلوص قوم جب ایران کی حدود میں داخل ہوگئی تو ''ص'' مفرس ہو کر ''چ'' بن گئی اور یہ قوم ''بلوچ'' کہلانے لگی۔ (بلوچی دنیا جنوری ۵۸ءص ۴۰)

عبدالرحمٰن غورؔ کی رائے

عبدالرحمٰن غورؔ بلوچستان کے قادرالکلام شاعر اور مُسلّمہ ادیب ہیں۔تاریخ کی پر پیچ وادیوں میں بھی کافی عرصہ سرگرداں رہے ہیں۔بلوچ قوم کے حسب نسب پر بحث وتنقید کرتے ہوئے اپنا فیصلہ ان الفاظ میں دیتے ہیں کہ:

''قدیم تاریخی روایات وواقعات کی تحقیقات اور لسانی وثقافتی تجزیہ کے بعد بالآخر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بلوچ حسب نسب کے اعتبار سے عربی النسل ہیں۔''

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

''بلوچ قوم کی تاریخ کے سلسلے میں اکثر مورخین متفق ہیں کہ وہ بلوچستان میں ایران سے آئے اور تاریخی واقعات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ بلوچ قوم بلوچستان میں مختلف راہوں سے وارد ہوئی'' (بلوچی دنیا۔فروری ۱۹۵۹ء ص ۲۶)

میر محمد سردار خان گشکوری کے نقطۂ نگاہ کی وضاحت پہلے ہی ہوچکی ہے کہ مکران بلوچوں کا قدیم وطن نہیں بلکہ وہ عراق کی طرف سے اس ملک میں داخل ہوئے ہیں۔

ملک الشعراء میر گل خان نصیر کا نظریہ

میر گل خان نصیر اپنی تالیف ''تاریخ بلوچستان'' میں تاریخی شواہد اور حقائق کی عدم موجودگی کا شکوہ کرتے ہوئے اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ:

''یہ بلوچ قوم زمانہ قدیم میں عربستان میں دجلہ اور فرات کی گودیوں اور حلب کے مرغزاروں میں ایرانی سرحد کے ساتھ ساتھ آباد تھی اور ایران میں تبریز سے کوہ البرز کے دامن میں مشہد تک پھیلی ہوئی تھی''۔

(تاریخ بلوچستان مصنفہ میر گل خان نصیر)

ملک صالح محمد خان صاحب لہڑی بھی اسی خیال کے مؤید ہیں۔ محترم عبدالصمد امیری نے بھی اپنے مضمون بلوچ نسل کی تاریخ میں تسلیم کیا ہے کہ:

"بلوچ قوم ہزاروں سال پہلے مختلف ادوار میں قبیلوں کی صورت میں اپنے اصلی وطن سے مہاجرت و مسافرت کر کے موجودہ بلوچستان میں پھیلتی گئی"۔

(بلوچی دنیا جون ۱۹۶۰ء)

ہمارا نظریہ

مختلف قدیم و جدید محققّین اور مؤرّخین کی متنوع آراء کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بلوچ من حیث القوم عربی النسل ہیں اور سیدنا اسماعیل بن ابراہیم علیہم السلام کی اولاد ہیں۔ جب عوانہ نے بنو اسماعیل کو مکہ مکرمہ سے نکالا تو ان کے چند قبائل شام کی مشہور وادی "بلوص" میں آ کر آباد ہوئے اور بلوص کہلائے۔ یہی بلوچ جب فارس اور ارض روم کی طرف بڑھے تو بلوص کی "ص"، "چ" میں بدل گئی اور یہ لوگ "بلوص" سے "بلوچ" بن گئے۔ اس اجمال کی تفصیل آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

شمال
شام
کردستان
موصل
عرب
ایران
مغرب
مشرق
بغداد
بابل
ہمدان
ایران
اہواز
بلوچوں کا قدیم وطن
جنوب
خلیج العرب

شمال
شام
عراق
عرب
ایران
ایران
مشرق
مغرب
جنوب
بغداد
خلیج العرب
بلوچوں کا قدیم وطن

بلوچوں کا جدید وطن

اَلبلُوش وَالاکِرَاد

(عربوں کی نظر میں)

آئیے اب ہم یہ معلوم کریں کہ بلوچوں کے بارے میں خود عرب کیا کہتے ہیں۔ ہم نے الحاج فیض محمد واڈیلہ مقیم بحرین سے درخواست کی تھی کہ اہل علم اور باخبر عرب حضرات سے مل کر اطلاع بخشیں کہ بلوچوں کے بارے میں ان کی معلومات کیا ہیں۔ نیز یہ کہ موجودہ بلوچ قبائل کے نام کا کوئی قبیلہ وہاں بھی آباد ہے!

فیض محمد واڈیلہ کراچی کے باشندے ہیں اور کافی عرصہ سے بحرین میں آباد ہیں۔ اس سلسلہ میں عرب شیوخ وعلماء سے ان کی جو گفتگو ہوئی وہ دلچسپ بھی ہے اور خاصی معلومات افزا بھی۔ آپ لکھتے ہیں کہ عرب میں بلوچ کو ''بلوش'' کہتے ہیں اور مسقط، عمان، برقہ، طیبی مرکہ، معزم، حلب اور حمص کے گردو پیش جو بلوچ آباد ہیں انہیں عرب لوگ ''اولادِ محمد'' سے موسوم کرتے ہیں۔

اگر کوئی نوجوان بلوچ کسی لڑائی میں بہادری دکھاتا ہے تو یہاں کے عرب فوراً کہہ اٹھتے ہیں۔ **نَعمُ البَلوش هَم شُجاع من اَولادِ محمد**۔ اگر کسی بلوچ سے کوئی غلطی ہو جائے تو کہتے ہیں۔ **عَیب عَلیکَ اَنت مِنْ اَوْلادِ محمداً**۔ عرب کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباء واجداد سے یہی سنا ہے کہ بلوچ عرب ہیں اور محمد کی اولاد ہیں۔

''اَلبلُوش مِنْ اَوُلادِ مُحمد''

یہ الفاظ مسقط کے بہت بڑے عالم، فقیہہ، مصنف اور مورخ جناب شیخ زبیر بن شیخ علی الہوتی نوراللہ مرقدہٗ کے ہیں۔ آپ نسباً ہوت بلوچ تھے۔ مسقط میں پیدا ہوئے اور عمر بھر سلطان مسقط کی مصاحبت میں رہے۔ سلطان کو آپ سے، آپ کے علم وفضل اور زہد وتقوی کے سبب

بڑی محبت تھی۔آپ کو دار فانی سے عالم باقی کو رخصت ہوئے بیس سال گزر چکے ہیں۔جب آپ سے سوال کیا گیا کہ عربوں میں مشہور ہے کہ بلوچ اولاد محمد ہیں کیا یہ صحیح ہے۔آپ نے فرمایا:۔

اَیھَّا الاَعذالکِرام! نعم۔اِن نَسل الیلوش من سَبائک الذھب اولۂ محمد آخِرہٗ عَدنان۔

یعنی ہاں۔اے محترم دوستو! عربی کی تاریخ ''سبائک الذھب'' کی رو سے بلوچوں کے نسب کی ابتداء محمد سے اور انتہا عدنان پر ہوتی ہے۔

''سبائک الذھب'' میں الحمدانی نے محمد کا نسب چودہ واسطوں سے جناب عدنان سے ملایا ہے اور اس طرح سے نقل کیا ہے۔

مُحمدبِن نَزارۃ بِن دبِیان بن بِغیَض بن رِیث بن سعد بن غطَفان بِن سعدبِن قیس بِن غَیلان بن مُضر بن نزار بن معدبن عدنان رحمَھُم اللّٰہ عَلِیھم اَجمَعین۔

بہر حال مولانا ہوتی نے اپنی رائے پیش نہیں کی بلکہ انہوں نے عرب کی ایک ثقہ تاریخ کی رو سے ثابت کیا ہے کہ بلوچ اولاد محمد اس لئے کہلاتے ہیں کہ یہ محمد بن نزار کی اولاد سے ہیں۔اور جناب محمد کا شجرہ چودہ واسطوں سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد حضرت عدنان سے مل جاتا ہے اور حضرت عدنان سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے محبوب فرزند سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں۔

آلاکرِاد

ہمارے ہاں وادئ بولان اور بلوچستان کے دوسرے مقامات پر جو کرُد آباد ہیں وہ بلوچ ہونے کے مدعی ہیں۔ان کا یہ دعوی بے اصل نہیں۔

مروج الذہب جزو ثانی ص ۱۲۳ ملاحظہ ہو۔لکھا ہے۔الاکراد۔**انھم من ولد ربیعۃ بن نزار** یعنی کرد ربیعہ بن نزار کی اولاد ہیں۔پھر اسی صفحے پر ذرا آگے چل کر یہ عبارت ملتی ہے۔**انھم**

(الاکراد)من ولد رَبیعة بن نزار بن مَعد۔یعنی کرد ربیعہ بن نزار بن معد بن عدنان کی اولاد سے ہیں۔اس طرح اکراد اور بلوچوں کا نسب جناب نزار بن معد سے مل جاتا ہے۔جناب ربیعہ کردوں کے اور جناب مضر بن نزار بلوچوں اور تمام قریش کے مورث ہیں۔مختصر یہ کہ بلوچ اور کرد دونوں ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں اور دونوں کو حضرت سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد ہونے کا شرف حاصل ہے۔

بلوچوں کے چند عرب قبائل

اب ہم بلوچوں کے چند ایسے قبائل کا ذکر کرتے ہیں جو اب بھی اسی نام سے عرب میں موجود ہیں۔بلوچستان میں قحطانی بلوچ بکثرت آباد ہیں۔ یہ جناب قحطان اعظم کی اولاد ہیں۔ ہمارے ہاں بُرّ بلوچوں کا ایک زبردست قبیلہ ہے۔ بالکل اسی نام سے ایک قبیلہ عرب بھی ملتا ہے۔اس کے بارے میں ایک عرب مورخ لکھتا ہے۔ انھم من عرب الیمن یعنی بُرّیمن کے عرب ہیں۔سبائک الذھب میں الحمدانی ان کا ذکر اس طرح سے کرتا ہے۔ذکر الحمدانی انھم من ولد بُرّ بن قیدار بن اسماعیل بِن ابراھیم عَلیہ السلام وَانہ کانَ قَدارَتکَب معَصیة فطردہ اَبوہٗ وقال لَہ اذھَب یابر فعاانت بُرّ۔یعنی حمدانی کہتا ہے کہ بُرّ قبائل جناب بُرّین قیدار بن اسماعیل بن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔بُرّ سے کوئی غلطی ہوگئی تھی۔جس پر اس کے والد جناب قیدار بن اسماعیل نے اسے گھر سے نکال دیا تھا اور فرمایا کہ تو بُرّ یعنی اچھا آدمی نہیں ہے۔

جمالی

اسی طرح جمالی بلوچوں کا ایک مشہور قبیلہ ہے اور جیکب آباد کے گرد و پیش آباد ہے۔میر جعفر خان جمالی اسی قبیلہ کے فیاض، نڈر، بیباک اور بہادر رہنما تھے۔میر رحیم داد مولائی شیدائی نے اس قبیلہ کو رند ظاہر کیا ہے بلاشبہ جمالی رندوں کے حلیف تھے اور رندوں کے ہمراہ ہی ایرانی

بلوچستان سے آئے تھے۔ مگر یہ یمن کے عرب ہیں اور اس وقت وہاں ان کی کئی بستیاں آباد ہیں اور وہ لوگ جمالی کہلاتے ہیں۔

مری

مری بلوچستان کا بہادر قبیلہ ہے۔ اس نے ایک صدی پیشتر انگریزوں کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ ہمارے مؤرخین اس قبیلے کو میر بجار پھڑ سے منسوب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ بجار خان نے چاکر اعظم کے ہمراہ دہلی کی مہم پر جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے خان اعظم نے اسے مری کا خطاب دیا۔ جس کے معنی ضدی کے ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ارض شام میں بھی اس نام کا ایک بلوچ قبیلہ موجود ہے اور وہ خالص عرب ہے۔ ملاحظہ ہو۔ سبائک الذھب ص ۱۰۰ ذکرھم الحمدانی ''آل مری من عرب الشام'' یعنی ہمدانی کہتا ہے کہ آل مری شام کے عرب ہیں!

ہوت

اسی طرح سبائک الذھب میں مرقوم ہے کہ ھیت من حجاز یعنی ہوت حجاز سے ہیں اور حجاز سے عمان آئے اور پھر یہاں سے معزم، طیی اور برقہ کی طرف بڑھ گئے۔

یہ ہماری تھوڑی سی کاوش کا نتیجہ ہے لیکن اگر ہم بالاستقلال پورے عرب کا جائزہ لیں تو یقیناً اور بھی بہت سے قبائل کا سراغ مل جائے گا۔ بہرحال یہ شہادتیں ہمارے اس دعویٰ کو تقویت پہنچاتی ہیں کہ بلوچ من حیث القوم عرب ہیں اور عرب سے ہی ایران بلوچستان، سندھ اور پنجاب کی طرف منتقل ہوئے ہیں۔

بلوچ اقوام کا

تاریخی پس منظر

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ عزوجل کے حکم سے اپنے فرزند جگر بند سیدنا اسماعیل علیہ السلام اوران کی والدہ محترمہ کواس جگہ آباد کیا۔ جہاں اب مکہ مکرمہ واقع ہے۔حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارہ فرزند تھےاورسب کے سب بڑے طاقتوراوراچھے حکمران تھے۔انہوں نے عرب کی سرزمین کوآپس میں تقسیم کرلیااوروہ بہت جلداس قدر پھیل گئے کہ شمال میں ملک شام تک جہاں ان کے بھائی بنی اسحاق آباد تھے جا ملے۔ جنوب میں یمن تک اور مغرب میں مصری سرحدات تک ان کا طوطی بولنے لگا۔مگرقدرت یہ چاہتی تھی کہ یہ بہادراورغیورقوم صرف عرب میں ہی مقید نہ رہے بلکہ مشک نافہ کی طرح دنیا میں پھیلےاورنوع انسانی کوخصائص انسانی سے ممتاز کرے۔اس لئے دفعتہً عمالقہ گھٹا کی طرح اٹھےاوردیکھتے ہی دیکھتے ارض مقدس پر چھا گئے۔بنو اسماعیل نے ہر چند مقابلہ کیا۔مگرحربی اعتبار سے ان کی ٹکر کے نہ تھے۔اس لئے مات کھا گئے۔ بالاآخران میں سے چند قبائل کوشام کارخ کرنا پڑا۔ چونکہ غیورقسم کےلوگ تھے۔کسی پر بوجھ بننا پسند نہ کیااورحلب کے قریب ایک بسیط وادی میں رہ پڑے۔جووادی البلوص کے نام سے مشہور تھی۔اس نسبت سےلوگوں نےانہیں ''بلوصی '' کہنا شروع کیا۔فارس کی مملکت قریب پڑتی تھی۔اس ملک کےلوگوں نے بلوصی کی ''ص'' کو ''چ '' سے بدل دیااور یہ قوم جوخالص عرب اورحضرت ابراہیم واسماعیل علیہم السلام کی اولادتھی ''بلوص '' سے ''بلوچ ''بن گئی۔انہوں نے اپنے نئے وطن کی اراضیات کونہریں احداث کرکے خوب آباد کیااورچند سالوں کے اندرہی اندراسے ''فردوس بہ روئے زمین'' بنادیا۔اس زمانے کو ایک ہزارقبل مسیح سے تعبیر

کرنا چاہیے۔ ۵۸ءق۔م تک یہ لوگ کافی اقتدار کے مالک بن چکے تھے۔ ان کی آبادیاں کاکیشیا سے روسی ترکستان اور وادی البلوص سے کوہ البرز تک پھیل چکی تھیں۔ ان کا اپنا جھنڈا اور لشکر تھا۔ بڑے بڑے سلاطین ضرورت کے وقت ان سے مدد لیتے تھے۔

بلوچ، شاہنامہ کے اوراق میں

ابوالقاسم فردوسی پہلا شخص ہے۔ جس نے سب سے پہلے اپنی منظوم رزمیہ تاریخ میں بلوچوں کا ذکر کیا ہے۔ جناب فردوسی ۹۴۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۰۳۰ء میں فوت ہوئے۔ انہوں نے اپنی حربیہ داستان کو سلطان محمود غزنوی کے دور میں مکمل کیا۔ یہ داستان "شاہنامہ فردوسی" کے نام سے موسوم ہوئی اور یہی بلوچ تاریخ کا اولین ماخذ ہے۔ اس منظوم تاریخ میں چار نسلوں کے مختلف بادشاہوں کا ذکر ہے۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

پیش دانی فرمانروا	۱۵	عرصۂ حکومت	۲۴۴ سال
کیانی فرمانروا	۱۰	عرصۂ حکومت	۷۳۲ سال
عشقانی (اشکانی)		۲۰۰ سال	
ساسانی	۲۰ بادشاہ	عرصۂ حکومت	۴۳۰ سال

یہ حربیہ داستان کم وبیش ایران کے ۳۸۷۴ سال کے تاریخی مواد پر مشتمل ہے۔ اس میں بلوچوں کا کیکاؤس کے فوجیوں کی حیثیت سے ذکر آتا ہے جو تمام تذکروں سے قدیم تر ہے۔ چند مؤرخین نے اس تاجدار کو کیخسرو بھی لکھا ہے۔ اس کا عرصہ حکومت ۵۵۸ سے ۵۳۰ قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔ یعنی شہنشاہ زرکس سے ۷۳ برس پیشتر، فردوسی لکھتا ہے کہ:

"بلوچ کیخسرو کی فوج میں اس کے جرنیل سائمیاس کے زیرکمان میداستاغاؤس (افراسیاب) کے خلاف نبرد آزما ہوئے تھے۔ مؤخرالذکر کا زمانہ ۵۵۸ قبل مسیح ہے چونکہ اس نے شہنشاہ کیخسرو کے بیٹے سیاؤش کو قتل کرادیا تھا۔ اس لئے شہنشاہ نے اس سے کئی جنگیں کیں اور

انجام کار افراسیاب مارا گیا"۔ اس جنگ میں فردوسی بلوچوں کا ذکر اس طرح سے کرتا ہے۔

گزیں گرد ازاں نامدار سوار　　دلیران جنگی دہ و دو ہزار
ہم از پہلو پارس کوچ و بلوچ　　زگیلان جنگی و دشت سروچ

(جناب سروچ کا نام نامی حضرت ابراھیم علیہ السلام کے آباء کرام میں تیسرے نمبر پر ملتا ہے۔ دشت سروچ آپ سے ہی موسوم ہے۔)

بلوچ کیخسرو کی فوج میں کتنی بے جگری اور بہادری سے لڑے۔ وہ بھی فردوسی کی زبان سے سنئے۔

سپاہی زگرد ان کوچ و بلوچ　　سگا لندۂ جنگ ء مانند قوچ
کہ کس در جہاں پشت ایشاں ندید　　برہنہ یک انگشت ایشاں ندید
سپہدار شاں اشکش تیر ہش　　کہ بارائے دل بود با مغز خوش
درفشے بر آوردہ پیکر پلنگ　　ہمے از درفشش بیا زید چنگ

"یہ لوگ اتنے بہادر تھے کہ دنیا میں جہاں کہیں لڑتے جنگ سے منہ نہیں موڑتے تھے اور لڑائی کے دوران کوئی ان کی پیٹھ نہیں دیکھ سکتا تھا اور انہوں نے جوشن، زرہ اور خود وغیرہ سے اپنے آپ کو اس طرح مسلح کر رکھا تھا کہ ان کی اُنگلی تک کسی کو نظر نہیں آتی تھی۔" ان کا اپنا جھنڈا تھا۔ جس پر چیتے کی تصویر تھی۔

یہ نشان اب تک بلوچوں میں جوں کا توں چلا آتا ہے۔ چنانچہ خان اعظم (فرمانروائے قلات) کے جھنڈے پر چیتے کی تصویر منقش ہے جو اس امر کا زندہ ثبوت ہے کہ یہ خاندان انہی سرباز بہادر بلوچوں کا جانشین ہے۔ جنہوں نے کیخسرو کی طرف سے افراسیاب کا مقابلہ کیا تھا۔

بلوچ شہنشاہ زرکس کے لشکر میں

شاہ ایران زرکس (Zarkes) ۴۸۵ھ تا ۴۶۵ھ قبل مسیح ، نے جب یورپ پر حملہ کیا تو اس نے ڈورسکس Doriscus کے میدان میں اپنے لشکر کا جائزہ لیا۔ یہاں چھپن (۵۶) قومیں اپنے قومی لباس میں اپنے اپنے پرچموں کے ساتھ حاضر ہوئی تھیں۔ اس نے تمام اقوام کی ایک فہرست مرتب کرائی جو یونان کے ریکارڈ میں محفوظ چلی آتی تھی۔ مشہور یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس نے اسے اپنی تاریخ میں نقل کیا۔ چنانچہ لکھتا ہے کہ:

Here were to be seen the cotton garments of the Indians and Ethiopians from above EGYPT Habited in lions Hiaes the sivar thy Baluochies from gedrosia. (History of the world by Henry Smith William L.L.O)

"یہاں سوتی کپڑوں میں ملبوس ہندوستانی، مصر سے اوپر رہنے والے ایتھوپین، شیر ببر کی کھالوں میں ملبوس اور گڈروشیا کے گندمی رنگ والے بلوچ نظر آرہے تھے۔"

ڈاکٹر میر عالم خان راقب اس اقتباس کو اپنی تاریخ میں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ۴۸۵ھ قبل مسیح میں بلوچ من حیث القوم موجود تھے اور بلوچ کہلاتے تھے۔

عرب مہاجرین کا ایک اور قافلہ

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عرب برابر ارض مقدس سے شام کی طرف ہجرت کرتے اور بلوچوں میں جذب ہوتے رہے ہیں عین اس وقت جبکہ بلوچ دنیا کی بڑی طاقت بن چکے تھے۔ عربوں کا ایک اور قافلہ شام میں پہنچا۔

اس کی تفصیل قاضی محمد سلیمان منصور پوری سے سنیئے، لکھتے ہیں کہ:۔

"اگرچہ بنو جرہم رشتے میں بنو اسماعیل کے ماموں تھے۔ لیکن چونکہ انہوں نے بت پرستی

میں بنو جرہم کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ اس لئے انہوں نے ۲۰۷ء میں حملہ کر کے بنو اسماعیل کو مکہ مکرمہ سے نکال دیا''۔

عمالقہ اور بنو جرہم کے بعد ایک اور طاقت ور قبیلے بنی خزاعہ نے مکہ مکرمہ پر چڑھائی کی۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ اس سے خاندان قریش بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ یہاں تک کہ حضرت کلاب بن مرہ جو چھٹی پشت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد ہوتے ہیں۔ حالات سے مجبور ہو کر شام کو ہجرت کر گئے۔ یہیں آپ نے بنی عذرہ کی ایک شریف خاتون فاطمہ بنت سعد سے شادی کی۔ جس کے بطن عفت سے خاندان نبوت کا وہ مشہور گوہر شب چراغ منصۂ شہود پر آیا جو اسلامی دنیا میں قصّی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چونکہ حضرت نے وطن سے دور عالم غربت میں تربیت پائی تھی اس لئے قصّی کہلائے ورنہ آپ کا اصل نام زید تھا۔ ابھی آپ شیر خوار ہی تھے کہ آپ کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا اور آپ کی والدہ نے ایک شامی عرب ربیعہ بن حرام سے نکاح کر لیا۔ چنانچہ آپ سن شعور تک جناب ربیعہ کو ہی والد سمجھتے رہے۔

(طبقات ابن سعد جلد اوّل ص ٦٧)

ایک دفعہ تیر اندازی کے مقابلے میں آپ کا رقیع قضاعی سے جھگڑا ہو گیا اس وقت آپ کو والدہ ماجدہ نے بتایا کہ تم قریش عرب کے مشہور سردار کلاب بن مرہ کے فرزند ہو۔ یہ سنتے ہی جناب قصّی مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے اور اپنے اعزہ و اقارب کی مدد سے غاصبوں کو نکال کر حجابہ، سقایہ، رفادہ اور علم برداری کے تمام عہدوں پر قبضہ کر لیا۔

(تاریخ حرمین الشریفین از مولانا عبدالسلام ندوی ص ٩٥، ٦٠)

اب بنو اسماعیل کے ان قبائل کا حال سنئے جو شام کے طول و عرض میں پھیل چکے تھے۔ چونکہ حربی ذہن کے لوگ تھے۔ اس لئے رومی شہنشاہ کی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ ان کا ذکر رومی تذکروں میں مفصل ملتا ہے۔

مسٹر ایس پی سکاٹ مصنف ہسٹری آف دی مورش ائمپائر ان یورپ لکھتے ہیں ان دنوں روم کے تخت پر مشہور شہنشاہ اورے لیون ORELEON متمکن تھا۔ یہ بھی عرب نژاد تاجدار تھا۔ بطور سپاہی کے بھرتی ہوا تھا اور ترقی کرتے کرتے روم کا بادشاہ بن گیا تھا۔ اس نے عربوں پر مشتمل ایک رسالہ تیار کیا جس پر اسے بڑا بھروسہ تھا اور اس کی فتوحات میں اس رسالے کی جانفشانیوں کو بڑا دخل تھا۔ اسی زمانے میں ملکہ زینوبیہ جو ۲۶۷ء میں شوہر کے انتقال پر تخت نشین ہوئی تھی۔ روم کے مشرقی حصے تدمیر کی فرمانروا بن گئی۔ اس نے بھی عربوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرلیا۔

(تدمیر اتنا مضبوط قلعہ تھا اور عرب اس کے بارے میں خیال کرتے تھے کہ اسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنوں کی مدد سے تعمیر کرایا ہے۔ چنانچہ نابغہ زبیانی کہتا ہے۔

اَلا سلیمانَ اذ قَالَ الاَلٰہ لِہ	سلیمان علیہ السلام، جب اللہ تعالیٰ نے
قم فی البریۃ فاحدرھا	اسے فرمایا کہ خلقت کو سستی رائے اور
عن الفندو جیشَ الجن اِنی	حماقت کی باتوں سے روکو اور جنوں کی جماعت کو
قداذنت لھم ینبوُن تدم	جمع کرو میں نے ان کو اجازت دیدی ہے کہ تدمیر
بِاَلصفا جَ وَ العَمد۔	کو پتھر کی چٹانوں اور عمودوں سے تعمیر کریں۔

(آئینہ عرب ص ۳۹)

یہی مؤرخ عربوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"متعدد قوموں پر عربوں کی شجاعت و بصالت نے سلطنت ایران کے بادشاہوں کی قسمت کا فیصلہ کیا۔ زینوبیہ ملکہ "پامیریا" کی فوج میں زیادہ تعداد ان کی ہی تھی۔ جس کسی کے بھی علم کے نیچے یہ لوگ لڑے، اپنی استقامت پر دھبہ نہیں آنے دیا"۔ (اخبار اندلس ص ۱۴)

اورے لیون نے تخت نشین ہوتے ہی ملکہ پر بڑے بھاری لشکر سے حملہ کیا۔ ملکہ بڑی

بہادری سے مقابلے میں نکلی۔ کئی جنگیں لڑیں لیکن ایرانیوں نے جن کی مدد پر ملکہ کو بڑا بھروسہ تھا عین موقع پر دھوکہ دیا جس سے ملکہ کو شکست ہوئی۔ اس نے اپنی عرب فوج کی حفاظت میں بھاگنا چاہا مگر اورے لیون کی فوج نے گرفتار کرلیا۔ (اخبارالاندلس)۔

عربوں نے تھوڑی تعداد میں ہونے کے باوجود ملکہ کا ساتھ نہ چھوڑا، اور آخیر دم تک اس کے لئے سینہ سپر رہے۔

ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ:

''عرب پریٹوریا کی فوج میں بھی بھرتی ہوئے تھے''۔

(اخبارالاندلس ص ۱۵)

منشی خلیل الرحمن پریٹوریا کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

''پیرے ٹوریا Pretoria سلطنت روم میں تیسرے درجے کے سپہ سالار کو کہتے تھے۔ اگرچہ یہ عہدیدار دیوانی و فوجداری مقدمات کی سماعت کے لئے مقرر ہوا تھا۔ مگر ضرورت کے وقت اس کو جنگ میں بھی بھیجا جاسکتا تھا اس کی فوج الگ ہوتی تھی۔''

(اخبارالاندلس)

ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ عرب تیسری صدی عیسوی میں سلطنت روم اور تدمیر پر چھا چکے تھے۔ دیوانی، فوجداری اور فوجی محکمے میں ان کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ ملک کے سیاہ و سفید پر اقتدار اعلیٰ رکھتے تھے۔ مگر بعد میں ایک وقت ایسا آیا کہ رومیوں نے عربوں کو عراق اور ایران کی طرف دھکیل دیا۔ جس پر یہ عرب بھی اپنے پیشرو بھائیوں کی طرح بلوچوں میں مدغم ہوگئے۔ اس سے بلوچوں کی عسکری قوت میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔

اُردوشیر کی زود پشیمانی

کیانی شہنشاہوں کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت کے وقت یہ شہنشاہ بلوچوں سے فوجی مدد لیا کرتے تھے اور بلوچ اتنے بہادر اور حرب وضرب کے اتنے ماہر تھے کہ لڑائی کے وقت دشمنوں کے دانت کھٹے کر دیتے تھے۔ یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔

چنانچہ دوداڈومبکی کہتا ہے کہ: ''ہم بلوچوں نے پانچ پشتوں تک ایران کے شہنشاہوں کی پرورش کی ہے''

لیکن ان فرمانرواؤں میں بعض ایسے بھی تھے جنہیں بلوچوں کی آزادی کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ چنانچہ ساسانی شہنشاہوں کے جداعلیٰ اُردوشیر نے اس امر کو شدت سے محسوس کیا۔ اس نے ان شیروں کو غلامی کے پنجرے میں مقید کرنے کیلئے نرمی سے کام لیا۔ قسم کے قسم کے انعامات اور خلاع فاخرہ کے چکمے دیئے۔ لیکن جب وہ اس سنہری جال میں نہ پھنسے تو پھر اس نے سختی سے کام لینا شروع کیا۔ حکام اور عمال کو ہدایات دیں کہ جس طرح بھی ممکن ہو، بلوچوں کو اطاعت پر مجبور کیا جائے۔ چنانچہ جگہ جگہ ساسانی طاقت کا مظاہرہ ہوا۔ شاہی افواج حرکت میں آئیں۔ بلوچوں سے شدت کی جھڑپیں ہوئیں۔ اطراف سے کافی آدمی قتل ہوئے۔ مگر بلوچوں نے شہنشاہ کے آگے سر نہ جھکایا۔ جس پر اردشیر نے مایوس ہو کر بلوچوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

بلوچوں کا قتل عام

نوشیرواں تک بلوچ آزاد اور خود مختار رہے اور اردشیر کے بعد کسی کو ان کی آزادی سلب کرنے کی جرأت نہ ہوئی لیکن جب نوشیرواں تخت نشین ہوا تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ بلوچ اگر رہیں گے تو مطیع ومنقاد بن کر۔ ورنہ ان کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے بلوچوں کے بارے میں سخت احکامات جاری کئے جن سے جھڑپوں کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ شاہی افواج کے دستے ان کی ریاستوں میں حکومت کا سکہ بٹھانے کے لئے داخل ہوتے مگر بلوچ انہیں کاٹ کر رکھ دیتے۔ اسی طرح حکومت کی طرف سے تادیبی کارروائی کے طور پر دوبارہ فوجیں روانہ ہوتیں مگر کوہ

البرز سے ٹکرا کر رہ جاتیں اور بلوچوں کا بال بیکا تک نہ ہوتا۔ جب اس صورت حال کی اطلاع نوشیروان کو ہوئی تو وہ غیظ و غضب سے جھلا اٹھا اور اس نے حکم دیا کہ

"تمام فوجیں اس مہم میں جھونک دی جائیں اور بلوچوں کو صفحۂ دہر سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا جائے"

ایک پیر مرد آگے بڑھا اور اس نے عرض کی۔ "اے شہنشاہ! جہاں پھول ہوتے ہیں، وہاں کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ آپ کے جد بزرگوار اردشیر نے انہیں ختم کرنے کے تمام منصوبے اور حربے آزمائے تھے۔ مگر اس کے ہاتھ کیا آیا۔ آپ بھی ان کے معاملے میں چشم پوشی سے کام لیں۔ جنگ و جدل کا یہ فتنہ خود بخود فرو ہو جائے گا"۔ نوشیرواں پر اس نصیحت نے کچھ اثر نہ کیا۔ اس نے فوج کی کمان خود سنبھال لی۔ کوہ البرز کی وادیوں میں گھس گیا اور اعلان کیا کہ "کسی بلوچ کو زندہ نہ چھوڑا جائے!" (فردوسی)

یہ حکم سنتے ہی شاہی فوجوں نے بلوچوں کو تلواروں پر دھر لیا۔ خواہ وہ غاروں میں تھے، یا چوٹیوں پر، پہاڑوں کے دامن میں تھے یا چٹیل میدان میں، ساسانی تلواروں نے انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹنا شروع کر دیا۔ ان کے لاکھوں عربی گھوڑے، برق رفتار اونٹ اور بھیڑ بکریوں کے ہزاروں ریوڑ سرکاری کارندے ہانک کر لے گئے۔ ان کے قصبات و دیہات نذر آتش کر دیئے گئے۔ مال و اسباب لوٹ لیا گیا۔ اسوقت بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا بلوچوں کے وجود سے خالی ہو چکی ہے۔ شہنشاہ کو بقول فردوسی جب یہ مژدہ سنایا گیا۔ "بلوچی نماند آشکار و نہاں" تو اس کی تسلی ہوئی اور اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ جہاں پر یہ جنگ لڑی گئی وہاں بلوچ نہیں رہے تھے لیکن اس کا یہ مطلب لینا صحیح نہیں کہ وہ فی الواقع ختم ہی ہو گئے تھے۔ دراصل وہ روسی ترکستان، افغانستان اور مکران کی طرف نکل گئے اور ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ شہنشاہ نوشیرواں نے بزعم خود جس عظیم قوم کو مٹا کر رکھ دیا تھا۔ وہ وسط ایشیاء کی مختلف اطراف سے شیر کی طرح دھاڑتی ہوئی نکل آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اردن سے بھارت اور گوادر سے اشک آباد تک صفحۂ ارضی پر چھا گئی لیکن نوشیروان کا اپنا خاندان جس کے بقاء کی خاطر اس نے اتنا خون خرابہ کیا تھا سمٹ سمٹا کر اسی عظیم قوم کا ایک مختصر ترین حصہ بن کر رہ گیا۔ جو "نوشیروانی" کہلاتا ہے اور بلوچ

ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔

(رائے بہادر ہیتو رام تاریخ بلوچستان ص ۵۷۶، سردار قوم نوشیروانی اپنے شجرہ کو نوشیرواں عادل شاہ ایران سے ملاتا ہے)

فردوسیؔ، نوشیرواںؔ اور بلوچوں کی چپقلش کا ذکر اپنے الفاظ میں اس طرح کرتا ہے۔

ہمے رفت و آگاہی آمد بشاہ — کہ گشت از بلوچی جہانے تباہ
زبس کشتن و غارت و تاختن — زمیں را بآب اندر انداختن
زگیلاں تباہی فزوں است ایں — زنفریں پراگندہ گشت آخریں
دل شاہ نوشیرواں شد غمی — بر آمیخت اندوہ بامُحرّمی
بایرانیاں گفت الاناں دہند — شداز بیم شمشیر ما چوں پرند
بشندہ بناشیم با شہر خویش — ہمے شیر جوئیم پیچاں زمیش
بد وگفت گویندہ کاے شہریار — بپالیز گل نیست بے رنج خار
ہماں مرز تا بود با رنج بود — زبہر پراگندن گنج بود
زکار بلوچ ارجمند اردشیر — بکوشید بارکا دانایان پیر
تبدُ سود مندے بافسون و رنگ — نہ از بند رنج و نہ پیکار جنگ
اگرچہ بد ایں سخن ناگزیر — بیوشید برخویشتن ارد شیر
زگفتار دہقاں بر آشفت شاہ — بسوئے بلوچ اندر آمد زراہ
چوآمد بنزدیک آں برزکوہ — بگرد دید گرد اندرش باگروہ
بداں کوہ گرد اندر آمد سپاہ — کہ بستند برمارو برمور راہ
ہمہ دامن کوہ تاروئے شخ — سپہ بود برسان موروملخ
منادی گرے گرد لشکر بگشت — خروش آمداز کوہ وازغار ودشت
کہ ہرگز بلوچی نیا بند وخورد — چہ ازتیغ داراں و مردان گرد
اگر انجمن ہست در اند کے — بنا ید کہ یا بد رسائی یکے
چو آگاہ شد لشکراز خشم شاہ — سوار و پیادہ بہ بستند راہ

ازایشاں فراواں و اندک نماند زن و مرد جنگی و کودک نماند
سراسر بہ شمشیر بگز اشتند! ستم کردن لوچ برداشتند
بشد ایمن ازرنج ایشاں جہاں بلوچی نماند آشکار و نہاں
چناں شد کہ بر کوہ ایشاں گلہ بُدی بے نگہباں کردہ یلہ
شبانے نبودے برگو سفند بہاموں وبرتیغِ کوہ بلند

(شاہنامہ فردوسی)

وادى البلوص

اَلشّامُ شمَامَةٌ وحَلُبٌ مجمعُ الاحُبابِ

وَواَدئ البلُوصِ مَجلِسُ الفُرسَانِ

O

وادی البلوص کا گزشتہ صفحات میں کئی بار ذکر آچکا ہے۔ دراصل یہی وہ سرزمین ہے جہاں عرب مختلف اوقات اور مختلف اقساط میں آتے اور بلوچوں میں جذب ہوتے رہے۔ پہلے یہ محض صحرائی علاقہ تھا۔ عربوں نے نہریں احداث کر کے اسے رشک ارم بنا دیا۔ البلاذری خود معترف ہے کہ بلوچ کی زمین اعلیٰ درجے کی عُشری زمین تھی۔

(فتوح البلدان جلداوّل ص ۲۴۳)

اورے لیون شہنشاہ روم نے شامی عربوں کو ان کی خدمات کے صلے میں بلوص اور اس کے گردو پیش کئی جاگیریں دی تھیں۔ بویلوص، قاصرین، عابدین اور صنفین اسی ریاست کے سیر حاصل اضلاع تھے۔ نوشیرواں اپنی قلمرو میں ہی خون خرابہ کرسکا تھا۔ یہ علاقے اس کی دسترس سے باہر تھے۔ جب مجاہدین اسلام نے ایران کا رخ کیا اس وقت بلوص اور قاصرین ہی دو اہم جنگی مقامات تھے۔ حضرت امین الامت ابوعبیدہ ابن الجراح سپہ سالار اسلام نے عراجین کے مقام سے ایک فوج حبیب بن مسلمہ کی سرداری میں قاصرین اور بلوص کی طرف روانہ کی۔ ان شہروں کے حکام اگرچہ نسلاً عرب تھے لیکن جس طرح ابتداء میں مکہ کے قریش نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ اسی طرح ان کو بھی شروع شروع میں آبائی مذہب کا ترک کرنا گراں معلوم ہوا اور پھر صدیوں سے ان کا سلطنت روم سے گہرا رابطہ چلا آتا تھا۔ اگرچہ دمشق، حمص، بصریٰ، اجنادین اور انطاکیہ جیسے عظیم شہر سلطنت روم سے نکل چکے تھے۔ پھر بھی ابھی تک ہرقل زندہ تھا۔ اس لئے وادی بلوص کے تمام ''بلوصی'' اپنے اہل وعیال اور قبائل سمیت ارض روم، الجزیرہ اور منبج کی طرف منتقل ہو گئے۔ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں اسلام قبول کیا۔ وادی البلوص

اپنے قدیم باشندوں سے خالی ہو چکی تھی۔ حضرت امین الملت اس سرزمین میں داخل ہوئے تو ہر طرف ہُو کا عالم طاری پایا۔

البلاذری لکھتا ہے کہ:۔

''سپہ سالار اسلام نے عربوں میں سے ایک جماعت کو جو شام میں آباد تھی، اور مسلمانوں کی فتوحات کے بعد اسلام لے آئی تھی۔ اس وادی میں لابسایا قبیلہ قیس میں سے بھی ایک قوم صحراؤں سے نکل کر یہاں آباد ہو گئی''۔

(فتوح البلدان جلد ا ص ۲۴۳)

دراصل یہی وہ قبائل ہیں جو جلال خان کی معیت میں سیستان اور پھر مکران میں داخل ہوئے۔ عین ممکن ہے جیسا کہ بلوچ عبدالغفار خان کا دعویٰ ہے یہ لوگ بنی انمار ہوں مگر ۱۷۰۰ء قبل مسیح کی بات صحیح نہیں!

اعلمش رومی

رائے بہادر ہتو رام نے سرداران رند سے بلوچوں کا جو شجرہ اپنی کتاب میں درج کیا ہے اس میں اعلمش رومی کا نام سرفہرست ہے۔ بلوچ عبدالغفار خان اس سے بڑے جز بز ہوئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر حلب میں کوئی اعلمش گزرا ہے تو حلب کی نسبت سے اسے حلبی ہی کہلانا چاہیے تھا وہ رومی کیوں کہلایا۔ (بلوچی دنیا دسمبر ۶۰ء ص ۱۶) حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ فتوحات اسلام سے پہلے شام کا تمام ملک رومی سلطنت میں شامل تھا اور امین الامت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے ہی اسے اسلامی قلمرو میں شامل کیا تھا۔ اعلمش کے فوراً بعد شجرے میں گل چراغ اور سرخ تاج جیسے نام ملتے ہیں۔ یہ امر بھی بلوچ صاحب کیلئے باعث حیرت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ''یہ ایرانی نام ہیں۔ رومی تمدن پر ارمنی زبان کا اثر اتنا جلدی کیسے پڑ گیا''۔

(بلوچی دنیا دسمبر ۶۰ء)

امر واقعہ یہ ہے کہ علمش رومی وہ پہلے سردار تھے جو اگرچہ عرب تھے مگر ان کا خاندان صدیوں سے شام میں آباد تھا اور رومی تمدن قبول کر چکا تھا۔ جب اسلام اپنے پورے محاسن کے ساتھ جلوہ گر ہو گیا تو جہاں دوسرے قبائل حلقہ بگوش اسلام ہوئے وہاں ان کا قبیلہ بھی مسلمان ہو گیا۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے انہیں عربی النسل ہونے کی وجہ سے وادئ بلوص میں آباد کیا اور اس مقام کو سرحدی چھاؤنی کا درجہ دے کر فوج کے ایک دستے کو متعین کیا۔ کچھ عرصے تک بلوچ قبائل بلوص اور اس کے مضافات میں سکھ چین کی زندگی بسر کرتے رہے۔ مگر ۶۱ء میں جب یزید کے مشہور ظالم گورنر عبید اللہ بن زیاد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے نواسے سیدنا امام حسین علیہ السلام اور ان کے جگر گوشوں کو کربلا کے ریگزار میں شہید کر ڈالا تو اس حادثہ سے تمام عالم اسلام میں رنج اور غم کی لہر دوڑ گئی چونکہ حلب اور موصل کے مضافات میں زیادہ تر عرب آباد تھے۔ یہ لوگ خاندان نبوت کی بے کسانہ شہادت سے زیادہ متاثر ہوئے۔ انہوں نے اموی حکومت کا جوا اتار پھینکا اور عبد اللہ بن زبیر سے سیاسی رشتہ جوڑ لیا۔ یزید کے مرنے پر مروان بن الحکم تخت نشین ہوا۔ اس نے موصل اور حلب کی گورنری پر عبید اللہ بن زیاد کو تعینات کیا۔ وہی ابن زیاد جس نے کربلا کی خاک پر آل رسول کے خون سے چھڑکاؤ کیا۔ مروان کے اسی اقدام سے بلوص کے باشندے زیادہ برافروختہ ہوئے۔ ابن زیاد کی سیاسی قوت خاصی وزنی تھی۔ حصین بن نمیر قاتل امام اور شام کے ہزاروں ایسے درندے اس کے ہمراہ آئے تھے جن کی زبانوں کو اہل بیت رضوان علیہم کے خون کی چاٹ لگ چکی تھی۔ بلوچی اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ یزیدی لشکر سے بلوچوں کی سات جنگیں ہوئیں۔ مگر ابن زیاد اور حصین بن نمیر کا پلہ بھاری رہا۔ اس وقت بلوچوں نے بلوص (حلب) سے سکونت ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب یہ حلب سے روانہ ہوئے۔ ان کا سردار اعلمش تھا۔ رومی کا لقب انہیں ایرانیوں نے دیا۔ پہلے کربلا آئے غالباً حضرت امامؑ اور ان کے اعزاء و اقارب کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے کے لئے پھر کربلا سے کرمان پہنچے۔ ہمارا قومی شاعر کہتا ہے۔

از حلبا پھاز کھایوں گوں یزیدآ جھیڑ ویں

کل بلا بھنپور نیاما شہر سیستان منزلیں !

''ہم ملک حلب سے آئے ہیں اور یزید کے ساتھ ہماری جنگیں رہی ہیں۔ کربلا کے بعد ہم بامپور (بھمپور) پہنچے۔ وہاں سے ہماری اگلی منزل سیستان تھی''۔

وادیٔ بلوص میں عربوں کے آباد ہونے اور پھر وہاں سے ارتحال کرنے کا ذکر فتوح البلدان میں تفصیل سے موجود ہے۔ جس کا اجمالاً پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

۱۔ یہاں حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضؓ نے عربوں میں سے ایک قوم کو جو الشام میں تھی اور مسلمانوں کے قدوم الشام کے بعد اسلام لائی تھی، آباد کیا۔

۲۔ قبیلہ قیس میں سے ایک قوم صحراؤں سے نکل کر یہاں آباد ہوگئی۔

۳۔ یہ لوگ فوجی مہموں میں بھیجے ہوئے نہیں تھے۔

۴۔ اور ایک قوم قاصرین (قاصرین بلوص کے مضافات میں واقع ہے) میں آباد کی۔ ارتحال کا ذکر ان الفاظ میں موجود ہے۔ ''بعد میں انہوں نے یا ان کی اولاد نے یہاں رہنے سے انکار کر دیا۔''

''بعد میں'' کی تعیین اسی زمانے میں ہی ہو سکتی ہے جبکہ ابن زیاد سے مسلسل متصادم ہونے کی صورت پیش آئی۔ بہرحال بلاذری کے بیان سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے عربوں کے کئی قبائل بلوص اور اس کے نواح میں آباد کئے اور پھر ان میں سے چند قبائل ہجرت کر گئے۔ (فتوح البلدان جلد اوّل ص ۲۴۳۔ ۲۴۴)

جو قبائل وہاں رہ پڑے تھے۔ انہوں نے اس علاقے کو خوب آباد کیا۔ ''جب مسلمہ بن عبدالملک بن مروان نے روم پر حملہ کرنے کیلئے کوچ کیا اور وہ الجزریہ کی سرحدوں سے اس ملک میں داخل ہوا تو اس نے بلوص میں ایک فوجی اڈہ قائم کیا۔ یہاں کے باشندے اور بوبلوص، قاصرین، عابدین اور صفین (یہ سب بلوص کے دیہات ہیں) کے باشندے اس کے پاس آئے۔ ان میں سے بالائی حصہ والوں نے درخواست کی کہ ہمارے لئے الفرات میں سے ایک نہر

احداث کرادو تا کہ ہم اس میں سے زمینیں سیراب کرسکیں۔ اس کے معاوضہ میں ہم تمہیں شاہی عشر کے علاوہ اپنی پیداوار کا تہائی حصہ بھی دیا کریں گے۔ اس نے نہر احداث کرادی جو ''نہر مسلمہ'' کے نام سے مشہور ہوئی اور وہاں کے باشندوں نے اپنا وعدہ ایفا کیا۔ اس نے شہر پناہ کی مرمت کرائی اور اس کو مستحکم بنا دیا۔

مسلمہ کے مرنے پر اس کے ورثاء، بلوص اور اس کے دیہات کے مالک ہوئے اور اموی دور کے اواخر تک ان پر انہی کا قبضہ رہا۔ جب عبداللہ بن علیؓ نے بنی امیہ کے اموال ضبط کئے تو یہ علاقہ بھی ان میں داخل تھا۔ امیر المؤمنین ابوالعباس نے یہ وادی سلیمان بن علی بن عبداللہ بن العباس کو جاگیر میں دے دی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محمد بن سلیمان اس کا مالک ہوا۔ جب محمد بن سلیمان کا انتقال ہو گیا تو خلیفہ ہارون الرشید نے بلوص اور اس کے تمام دیہات المامون رحمتہ اللہ علیہ کو جاگیر میں عنایت کئے۔ جو اس کے بعد اس کے بیٹے کو ملے''۔

(فتوح البلدان جلد اوّل ص ۲۴۴)

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ عربوں نے البلوص کو ذاتی محنت اور کوشش سے اس قدر زرخیز اور سیر حاصل بنا دیا تھا کہ یہ علاقہ ہمیشہ ہمیشہ محال خالصہ کے طور پر شاہی افراد کی جاگیر بنا رہا۔

وادی البلوص عہد حاضر میں

ہم نے میر صاحب داد ولد داد محمد بلوچ مقیم بغداد کے ذمہ لگایا تھا کہ وہ حلب جا کر وادی البلوص اور اس کے دیہات کی بابت رپورٹ کریں۔ کہ ''کیا اب بھی وہاں بلوچ آباد ہیں اور ان کی سیاسی پوزیشن کیا ہے؟'' ہماری درخواست پر انہوں نے ملک شام کا دورہ کیا اور اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا کہ:

”یُوجِدُ وادیَ البلُوص مابین مدَینة حَلب وَرِقّة ویُوجد فِیۃَ قَبِیلِتَین قَبیلۃَ البلُوص وَ قَبیلۃ البلوط وھذہ القَبیلتَین اَحسن واشجعُ قَبائِل فِی حلب“

”میں نے حلب اور رقہ کے مابین ایک وادی دیکھی ہے، جو وادی البلوص کے نام سے موسوم ہے۔ اس وادی میں دو قبیلے آباد ہیں۔ ایک قبیلہ بلوص ہے اور دوسرا قبیلہ البلوط، دونوں قبائل حلب کے جملہ قبائل میں زیادہ وجیہہ اور بہادر ہیں!“

ایک اور عنایت نامہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

”بَنی بلُوص وَبَنی بلُوط جملہ عرب ہستند وزبان عربی مے گویند!“

”بلوص اور بلوط دونوں قبائل عرب نژاد ہیں اور عربی زبان بولتے ہیں“ ان کی رزم آرائی اب بھی مسلمہ ہے۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے ؎

اَلشَام شَمَامتُو حَلبَ مَجمعُ الاَحباب

وَوادیٔ البُلوص مَجِلسُ الفرَسانٗ

”شام ایک باعظمت ملک ہے۔ حلب دوستوں کا شہر ہے۔ یعنی اس کے باشندے پیار و محبت سے رہتے ہیں اور وادی البلوص تو فوجی چھاؤنی ہے جس میں سپاہی رہتے ہیں!“۔

بنی بلوط

بنی بلوط کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔ یہ بنی بلوص ہی تھے ان کے اجداد و فارس کی طرف منتقل ہوئے تو اہل ایران نے بلوص کی ص کو مفرس کر کے ”چ“ بنا دیا اور یہ ”بلوچ“ کہلائے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ لوگ کتنا عرصہ فارس میں رہے۔ بہرحال ان پر ایرانی معاشرہ غالب آ گیا اور یہ بھی ”چ“ بولنے پر قادر ہو گئے اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ نوشیروان نے ان کا خون حلال سمجھ لیا اور یہ جان بچا کر پھر اپنے وطن میں آ گئے لیکن اب یہ بلوص نہیں بلکہ بلوچ

تھے۔ایک آدھ صدی تک یہ بلوچ کہلاتے رہے مگر اہل بلوص ان کا صحیح تلفظ ادا کرنے پر قادر نہ ہو سکے اور لفظ ''بلوص'' کو انہوں نے قبول نہ کیا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک نئے لفظ نے جنم لیا جو نہ بلوص تھا اور نہ بلوچ بلکہ بلوط تھا۔ پہلے بلوصیوں نے انہیں یہ نام دیا۔ کچھ عرصہ بعد یہ بھی اسی نام سے مانوس ہو گئے۔ چنانچہ اب جو دو قبیلے اس وادی میں آباد ہیں۔ایک قدیم عرب ہیں جو بلوص آ کر پھر کہیں نہیں گئے اور بلوص کہلائے۔ دوسرے وہ عرب ہیں جو بلوص سے ایران کو منتقل ہو کر بلوچ بنے اور پھر جب حالات نے انہیں واپس آنے پر مجبور کیا تو اہل بلوص نے انہیں بلوط کہہ کر پکارا کیونکہ وہ ''چ'' کا صحیح تلفظ ادا کرنے پر قادر نہیں تھے۔ چنانچہ یہ قبائل اب بنی بلوط سے موسوم ہیں۔

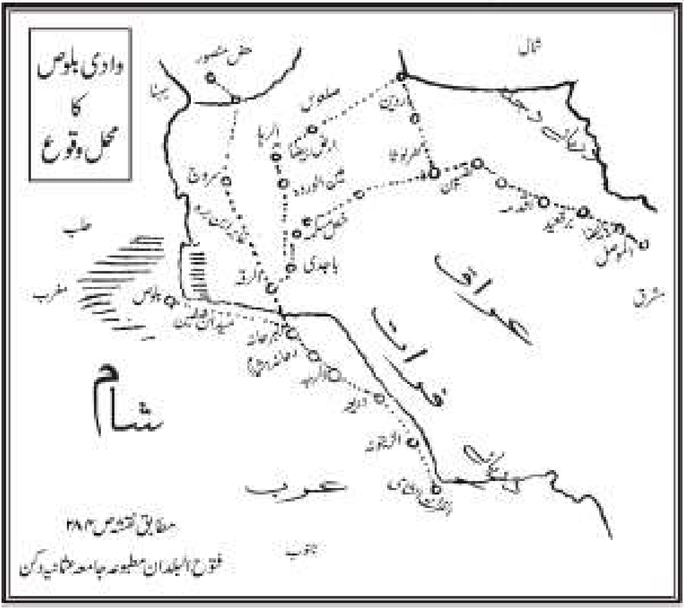

اُردن کی بلوچ آبادیاں

فیض محمد واڈیلہ لکھتے ہیں کہ ایک اردنی عرب میرے ہاں تشریف لائے۔ان سے اردنی بلوچوں کی بابت تبادلہ خیال ہوا، فرمایا:۔

''اردن کی حدود میں بلوچ بکثرت آباد ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر فوجی ہیں۔شجاعت اور غیرت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔اُردن کے بلوچ بہترین گھوڑ سوار ہیں۔ برق رفتاری میں جواب نہیں رکھتے''۔

میں نے زبان کے بارے میں پوچھا تو فرمایا:۔

''یہ لوگ ہمارے ساتھ عربی بولتے ہیں لیکن جب آپس میں بات چیت کرتے ہیں تو وہ ایسی زبان بولتے ہیں جسے ہم نہیں سمجھ سکتے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کوئی جداگانہ زبان ہے'' پھر کہا کہ ''یہ زبان کُردی'' جیسی ہے۔

لباس کا ذکر کرتے ہوئے کہا:۔

''پرانے آدمی شلوار پہنتے ہیں۔آج کل کے نوجوان انگریزی لباس پہننے لگے ہیں!''

میں نے پوچھا کہ اردن کے علاوہ بلوچ اور کہاں کہاں آباد ہیں؟۔فرمایا:۔

مُحل الّذی یَسکُنون فِیھَا بلُوش مَدِینةُ مَرکہٗ، الَمدینةُ الکَبیرہَ بعدُ قسم مِنھم یسکنُون فیِ حمَص، کذالک قِسم مِنھم فی حَلب۔سوُریہ۔

''بلوچ شہر مرکہ میں آباد تھے۔جو بڑا شہر ہے۔اس کے بعد ان میں سے کئی قبیلے حمص اور کئی حلب اور شام کو چلے گئے''۔

میں نے مرکہ کا محل وقوع دریافت کیا تو کہا۔**مَابین عَمان وزَرقا!یعنی**۔ ''عمان اور زرقا کے درمیان واقع ہے''۔

خلیج العرب کے قدیم بلوچ قبائل

خلیج العرب کے ساحلی علاقے میں کافی بلوچ قبائل آباد ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ہم حجاز سے آ کر یہاں آباد ہوئے ہیں اور ہمارے آباؤ اجداد سے کوئی مکران نہیں گیا۔ ان کی مادری زبان عربی ہے۔ بلوچی کا ایک حرف تک نہیں سمجھ سکتے۔ جیسا کہ مسقط کے شیخ سعید بن الشیخ راشد البلوشی ہیں۔ یہ بلوچ بن بلوچ ہیں اور ہوت قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر بلوچی سے نابلد ہیں۔ جب ہم آپس میں بلوچی میں بات چیت کرتے ہیں تو حیران ہو کر ہمیں تکنے لگتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ بلوچی بولیں، مگر نہیں بول سکتے۔ اس روایت سے مولانا دیر مانی کے اس دعویٰ کی تائید ہوتی ہے کہ میر جلال خان کے صاحبزادے میر ہوت ہی ہوت قبائل کے مورث نہیں۔ بلکہ ہوت قبائل تو میر جلال خان کی آمد سے بھی پہلے موجود تھے۔ ہوت عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی مچھلی کے ہیں۔ ''سبائِک الذہب'' کا یہ دعویٰ کہ ھیت من الحجاز اپنے اندر خاصا وزن رکھتا ہے ممکن ہے کہ عربوں کا کوئی قبیلہ جدہ کے قریب مچھلیاں پکڑتا ہوا اور پھر ساحل ساحل چلتا ہوا یمن اور مسقط وغیرہ کی طرف چلا آیا ہو!

اَل مری

''سبائک الذہب '' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اَل مری دراصل شام کے رہنے والے تھے اور اب تک حجاز میں بکثرت آباد ہیں۔ یہ لوگ عربی النسل ہیں اور حجاز سے ہی بلوچستان اور سندھ کو منتقل ہوئے ہیں۔

فیض محمد واڈیلہ لکھتے ہیں کہ اَل مری آپ کو عرب کے ہر گوشے میں ضرور ملیں گے کیونکہ یہ ایک بڑی قوم ہے۔ اَل مری من حیث القوم خانہ بدوش واقع ہوئے ہیں اور مویشی پال کر گزارہ کرتے ہیں۔ کوئی شخص ان کے جانور اونٹ یا بھیڑ بکریوں کو چُرانے کی جرأت نہیں کرتا کیونکہ اَل مری سراغرسانی میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ پاؤں کے نشان دیکھتے ہی اپنے دشمن کا پتہ لگا لیتے ہیں

اور پھر اس کی خیر نہیں ہوتی۔ اَل مری بہادری میں نظیر نہیں رکھتے اور بددیانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ لمبے لمبے بال پشت پر ڈالے، لمبی داڑھی کو سینے پر پھیلائے، بلوچی کرتا زیب تن کئے، شمشیر بدست ہر وقت مرنے مارنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

بنوجمال

فیض محمد واڈیلہ لکھتے ہیں کہ ایک دن اچانک میری نظر ایک یمنی کے لفافے پر پڑ گئی اس پر فلاں بن فلاں جمالی درج تھا۔ میں نے اس نوجوان سے پوچھا

یااخی فی بلادکم یُوجد قَبِیلة یَسمّون جَمالی؟	بھائی۔ کیا آپ کے ہاں جمالی نام کا کوئی قبیلہ ہے؟

اس نے معاً جواب دیا:۔

نَعم یَااَخی، عندنَا یُوجد قبائَلِ جُمالی، کثَیرھُم من الشُجاعَ والاَبطال۔	ہاں بھائی! ہمارے پاس جمالی قبائل بہت ہیں اور یہ لوگ دلیر، بہادر اور غیور عرب ہیں!

میں نے پھر سوال کیا:۔

یااخی واین یسکنون الجمالی؟	اے بھائی! جمالی کہاں رہتے ہیں؟

اس نے کہا:۔

یسکنون فی الیمن	وہ یمن میں رہتے ہیں!

میں نے کہا ان کے مسکن کی وضاحت کیجئے۔ کہا:۔ ''بنوجمال!''

(قدرے سکوت کے بعد اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور کہنا شروع کیا)

قَبیلِةَ جمالی مِنَ الیَمن بَسکنون عَددُ منھُم فِی خُولان	جمالی قبائل یمن کی درج ذیل بستیوں میں رہتے ہیں:۔ خولان!

وَ کَذالک عَدَدٌ منھم عنس!

فی عنس و کذالک عدد منھم

یَسکنُون فی مریس و کذالکَ عددٌ مریس!

مِنھُم فی سَوادیہ و کذالک سوادیہ!

عَددٌ مِنھُم فی رقاش رقاش!

سرجان مالکم کی تاریخ ایران سے پتہ چلتا ہے کہ نادرشاہ کے زمانے میں ترشیز پر جمالی قبیلہ متصرف تھا۔ اس گروہ کا سردار عبدالعلی خان تھا جو بڑا بہادر اور جنگجو انسان تھا۔ اس لئے نادرشاہ اس کی بڑی قدر کرتا تھا اور اس نے اسے کرمان شاہ اور ہرات کی گورنری دے رکھی تھی۔ عبدالعلی خان نے ترشیز کی حکومت اپنے بھائی خلیل خان کو دے دی تھی۔ اس نے عراق سے اپنے باقی تمام رشتہ داروں کو طلب کرلیا۔ وہ سب کرمان شاہ اور ہرات کی طرف روانہ ہو آئے اور یہاں سے بلوچستان اور سندھ تک پھیل گئے۔ سرجان مالکم کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔

"ترشیز کہ در شمال طبس افتادہ است در تصرف قبیلہ دیگر اعراب است کہ بہ میش مست معروف اند گویند ایں نام بدیں سبب بریں افتادہ کہ بجہتہ میشے باہم جنگ کرد۔ پیش ازانکہ ایں نام برایشاں اطلاق شود از قبیلہ جمالی محسوب مے شدند۔

امیر ایں گروہ عبدالعلی خان مردے بود بسپاہ گری مشہور و نادرشاہ ویرا محترم داشتے وہم در ایام سلطنت وے ایالت کرمان شاہ دہرات یافت بعد از فوت نادرشاہ (عبدالعلی خان) با قبیلہ وعشیرہ عراق را رہا کرد۔ برادرش خلیل خان کہ درآں وقت بر ترشیز استیلا یافتہ بود۔ دیر ابدانصوب دعوت نمود"۔

(تاریخ ایران جلد دوم (۱۲۱۔ از سرجان مالکم، مطبوعہ بمبئی)

اسی طرح ایرانی فاتحین وادئ سندھ کی کئی اقوام کو اپنے ملک میں لے گئے اور ان پر اعتماد کر کے فوج اور انتظامیہ کے بڑے بڑے عہدے تفویض کیے۔ یہ قومیں بھی بلوچوں میں مدغم ہو گئیں۔

سندھی اقوام کا بلوچوں میں ادغام

اَلاسَاورہOاِلزطّOالسَیاہَبجOالاَندَغار

(سیوڑہ) ۔ (جت)۔(سیاہ پادگ)۔(جدگال)

نوشیرواں نے جب بلوچوں پر عرصہ حیات تنگ کیا تو وہ جانیں بچانے کیلئے مختلف اطراف میں پھیل گئے۔ کئی ان دشوار گزار پہاڑوں میں جا گھسے جو کرمان میں سات آٹھ سلسلوں کی شکل میں دور دور تک پھیلے ہوئے تھے اور جبال قفص سے موسوم تھے۔ کئی مکران تک بڑھ گئے۔ اس وقت ان بلوچوں کی حیثیت شاہی مجرموں کی سی تھی۔ چونکہ فارس کی فوجوں سے کافی عرصہ تک برسر پیکار رہے تھے۔ اس لئے اہل فارس بھی انہیں دشمن سمجھتے تھے اور جونہی کسی فارسی کو بلوچ کا سراغ ملتا۔ وہ حکومت کے کارندوں کو اطلاع کر دیتا اور یہ لوگ دھر لئے جاتے۔ اس لئے اخفائے راز کے پیش نظر بلوچوں نے سوار، سیاہ بج، اندغار اور جاٹ کہلانا شروع کیا۔ یہ ہندی الاصل قومیں تھیں اور ایرانی حملہ آور انہیں وادی سندھ سے اپنے ہمراہ لائے تھے۔ چونکہ بہادر اور عقلمند لوگ تھے۔ اس لئے اکاسرہ نے انہیں بڑے بڑے عہدوں پر تعینات کر رکھا تھا۔ بلوچوں نے ان پر اعتماد کیا اور انہیں اپنے اندر جذب کر لیا۔ یہ قومیں اب بھی موجود ہیں۔ سوار و سیوڑہ کہلاتی ہیں۔ سورہ میانی (المنصورہ) اور ملتان شہر کے مابین سیوڑوں کی کافی آبادیاں رہتی ہیں۔ یہ لوگ محمد بن قاسم کے ہمراہ ملتان کی مہم پر آئے اور پھر یہیں آباد ہو گئے۔ کئی ان علاقوں میں پڑے ہیں۔ جہاں سے اسلامی لشکر گزرا تھا۔ ان کی موجودہ آبادیوں سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ بلا شبہ سوار یا اساورہ اسلامی لشکر کے وہ جانباز سپاہی تھے۔ جنہیں محمد بن قاسم نے قلعہ فتح کرنے کے بعد ان کی حفاظت پر مقرر کیا تھا۔ سیاہ بج، سیاہ پادگ کا معرب ہے۔ الزط اور الاندغار سے یہی جت اور جدگال مراد ہیں جو اب بلوچ قوم کا جزو لاینفک بن چکے ہیں۔ ان کے بلوچ قوم میں مدغم ہونے کی

عمر ایک ہزار سال سے زیادہ نہیں۔ اگرچہ بلوچ ابتلاء کے دور میں اپنے آپ کو ان قوموں سے موسوم کرتے رہے تاہم وہ سوار اور سیاہ بج وغیرہ سے ممیز ہی رہے کیونکہ ''سیاہ سوار'' کے نام سے جو بلوچ سردار کسریٰ کا فوجی افسر تھا۔ جب وہ فارسیوں سے کٹ کر اسلامی لشکر میں شامل ہوا تو ہرمزان سپہ سالار کسریٰ نے اسے یہ طعنہ دیا تھا کہ ''تُو تو ایک بلوچ تھا جو مکران کی پہاڑیوں میں جان کے خوف سے چھپا پڑا تھا۔ میں تجھے قعر گمنامی سے نکال لایا اور شہنشاہ سے سفارش کر کے اس مرتبے پر لا پہنچایا کہ آج چاند بھی تجھ پر رشک کرتا ہے۔ حالانکہ اگر شہنشاہ کو تیرے بلوچ ہونے کا علم ہو جاتا تو تیرے لئے جان سلامت لے جانا بھی مشکل ہو جاتا'' بہرحال یہ امر واقع ہے کہ سیاہ سوار اور اس کے رفقا بلوچ تھے اور انہوں نے اپنے آپ کو سوار مشہور کر رکھا تھا۔ ہرمزان سے اس کا تعارف مکران کی پہاڑیوں میں ہوا۔ عین ممکن ہے کہ ہرمزان اس جانب شکار کھیلنے گیا ہو اور سیاہ کی غیر معمولی بہادری سے متاثر ہو کر اسے اپنے ہمراہ لے آیا ہو۔

ملک الشعراء بہار مرحوم ایران کے چوٹی کے شاعر ہی نہیں تھے بلکہ اپنے دور کے بہت بڑے مؤرخ بھی تھے۔ انہوں نے تاریخ کی کئی کتابیں طبع کرائیں۔ جن میں سیستان کی تاریخ ہماری نظر سے بھی گزر چکی ہے۔ ہم نے اس متحفہ کے جستہ جستہ مقامات دیکھے ہیں۔ حقائق کے اظہار اور اسلوب بیان کے لحاظ سے اس کا پایہ بہت بلند ہے۔ اور پھر وہ ایرانی عالم ہے۔ اگر بلوچ ہوتا تو شاید کوئی اس کی بابت یہ کہہ سکتا تھا کہ اپنی قوم کو بڑھانے چڑھانے کے لئے اس نے ازخود یہ قصہ گھڑ لیا ہے۔ محض اس لئے ان کے مندرجات کو ساقط الاعتبار قرار دینا کہ وہ ملک الشعراء کیوں تھے، یا اس نے تاریخ کو نظم کیوں کیا۔ تاریخ اور بہار دونوں سے زیادتی ہے۔ ہر زبان میں تاریخ کی بہت سی ایسی کتابیں منظوم ملتی ہیں جو مؤرخین کے نزدیک ثقہ سمجھی جاتی ہیں۔

مثال کے طور پر عصامی کو ہی لے لیجئے۔ انہوں نے پاک و ہند کی تاریخ منظوم کی ہے۔ مولوی محمد شفیع مرحوم اور شیخ محمد اکرام جیسے محققین نے اس کے مندرجات پر بھروسہ کیا ہے اور اپنی

تصانیف کو ان کے حوالہ جات سے مزین کیا ہے۔ ویسے رطب و یابس سے تو نثر کا دامن بھی نہیں بچ سکا۔ داستان امیر حمزہ، باغ و بہار، فسانہ عجائب، فسانہ آزاد، گل بکاؤلی جیسے ہزاروں بے اصل قصے، نثر ہی میں تو ہیں۔ مبالغہ آرائی ایک الگ بیماری ہے۔ جو شخص اس کا مریض ہے۔ وہ یہ جراثیم نظم و نثر دونوں میں چھوڑتا ہے اور انہیں ''زیب داستاں'' کے لئے ضروری خیال کرتا ہے لیکن ملک الشعراء بہار کا دامن اس آلائش سے پاک ہے ان کی تصانیف، علم و ادب اور اسلامی تاریخ کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ ان سے استفادہ نہ کرنا اپنے آپ کو اسلاف کے علمی ورثہ سے محروم رکھنا ہے۔

سیاہ سوار کے جنگی کارنامے

مولانا قاضی عبدالصمد سربازی اور الحاج میر محمد بخش خان تالپور دونوں بزرگوں نے اساورہ پر کھل کر بحث کی ہے۔ مولانا کا موقف یہ ہے کہ اساورہ بلوچ تھے اور میر صاحب نے ثابت کیا ہے کہ اساورہ سندھی الاصل غیر بلوچ تھے۔ ہماری تحقیق یہ ہے کہ بلاشبہ اساورہ سندھی غیر بلوچ تھے۔ مگر سیاپادگ، جت اور جدگال کی طرح بلوچوں میں مدغم ہو گئے۔ سیاہ سوار جس کا ذکر عرب مؤرخین اور پھر ملک الشعراء بہار نے شاہنامہ نو بخت میں کیا ہے۔ بلا ریب و شک ایک بلوچ سردار تھا۔ جس نے اپنے آپ کو سوار مشہور کر رکھا تھا۔ ملک الشعراء بہار کی روایت کے مطابق ہرمزان اس نوجوان کو مکران سے اپنے ہمراہ شہنشاہ ایران کی خدمت میں لے گیا اور اسے فوج میں بھرتی کرا دیا۔ ایرانی لشکر میں پہلے سے کافی بلوچ موجود تھے۔ مگر انہوں نے کسی پر اپنا بلوچ ہونا ظاہر نہیں کیا تھا۔ سیاہ نے چند معرکوں میں ایسی بہادری دکھائی کہ شہنشاہ نے خوش ہو کر اپنے لشکر کا محکمہ اس کے سپرد کر دیا۔ اس عہدے پر فائز ہوتے ہی سیاہ نے بلوچوں کو بھرتی کرنا شروع کیا۔ جس سے بلوچوں کا ایک خصوصی دستہ بن گیا۔ گویا یہ سیاہ سوار کی پلٹن تھی۔ جسے عرب مؤرخین الاسادرہ سے موسوم کرتے ہیں۔ سیاہ اپنی غیر معمولی شجاعت اور بہادری کے سبب ایرانی امراء میں مقبول ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ شاہی دربار میں اس کا ذکر رستم تہمتن کی طرح ہونے لگا۔ چنانچہ بہار سیاہ کی بہادری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

چناں شد کہ روزے بہ نزدیک شاہ	شگفتی بسے گفتہ شد از سیاہ
کہ در جنگ دارد دل شیر بر	بہ نیرو بر آرد و مار از ہژبر
جو شمشیر خود بر کشد از نیام	نماند پلنگ دماں را کنام
بہ تنہا کند کار یک لشکرے	ہنرہائے او را سزد دفترے

(شاہنامہ نوبخت از ملک الشعراء بہار)

''ایک دربار شاہی میں سیاہ کی بہادری کا ذکر چل نکلا۔ امرائے دربار نے اس کی شجاعت کے کئی واقعات سنائے اور بتایا کہ جنگ میں سیاہ شیر ببر کا سا دل رکھتا ہے اور اپنی خداداد طاقت سے شیر کا بھی مغز نکال پھینکتا ہے اور جب اپنی تلوار کو بے نیام کرتا ہے تو چیتے اور شیر کے لئے کوئی جائے فرار نہیں رہتی۔ اکیلا شخص پورے لشکر کا کام دیتا ہے۔ وہ اتنا بہادر ہے کہ اس کے کارناموں کے لئے دفتر چاہیے''۔

المدائنی کہتا ہے کہ جب شہنشاہ یزدجرد نے اصفہان کا رخ کیا تو سیاہ سوار کو بلا کر لشکر جرار کے ہمراہ جس میں ستر سردار بڑے کار آزمودہ اور چوٹی کے بہادر بھی شامل تھے، اصطخر کی جانب کوچ کرنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی ہدایت کی کہ راستے میں جو شہر آئیں وہاں کے جنگ آزماؤں سے مزید فوج بھرتی کر کے اپنے ہمراہ لے جائے۔ پھر خود یزدجرد اس کے پیچھے روانہ ہوا۔ اصطخر پہنچ کر شہنشاہ ایک بڑے لشکر کے ہمراہ السوس کی طرف جس کا ابو موسیٰؓ محاصرہ کئے پڑا تھا۔ متوجہ ہوا اور ہرمزان سپہ سالار اعظم کو تستر کی طرف روانہ کیا سیاہ سوار الکلبانیہ میں اترا۔ اہل السوس نے یزدجرد کے امور کی پراگندگی اور اس کے فرار کا حال سن کر ابو موسیٰؓ سے صلح کی درخواست کی۔ انہوں نے صلح کر لی۔ سیاہ سوار الکلبانیہ میں ٹھہرا رہا۔ یہاں تک کہ حضرت ابو موسیٰؓ تستر پہنچ گئے۔ سیاہ نے کوچ کیا اور تستر و رامہرمز کے درمیان خیمہ زن ہو بیٹھا۔

سپاہ جس عظیم الشان جمعیت اور شان و شوکت سے آیا تھا مسلمانوں کو بھی اس کی فکر تھی کیونکہ

فارس کے منتخب اور چیدہ سردار اس کے ہم کاب تھے۔ مگر تائید الٰہی سے جو سامان ہو رہا تھا۔ وہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ فارس کے افسر اعلیٰ سیاہ نے ان سرداروں کو جو اس کے ساتھ اور ماتحتی میں تھے۔ جمع کر کے کہا کہ تم لوگوں کو معلوم ہے کہ ہم ہمیشہ سے سنتے چلے آئے ہیں کہ یہ لوگ (مسلمان) اس مملکت پر غالب آجائیں گے اور اصطخر کے شاہی محلات میں ان کے گھوڑے بندھیں گے۔ اس وقت ان کی فتوحات سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ یہ خیال کس قدر متیقن اور صحیح ہے۔ اب تم لوگ اپنے نفع نقصان پر غور کر لو۔ سب نے کہا کہ ہم آپ کے مشورے کے تابع ہیں۔ سیاہ سوار نے کہا تو پھر ہر شخص اپنے متبین اور خواص کا ذمہ دار بن جائے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ ہم ان کے مذہب (اسلام) میں داخل ہو کر ان جیسے (مسلمان) بن جائیں۔ سیاہ کی اس رائے کا اتفاق ہو گیا اور ایک بڑے سردار شیرویہ کو دس افسروں کے ساتھ حضرت موسیٰؓ سے تبادلہ خیال کرنے کے لئے بھیجا۔ شیرویہ نے یہ اپنی قوم کا پیغام پہنچایا کہ ہم برغبت مسلمان ہونا چاہتے ہیں۔ مگر اس شرط پر کہ:۔

۱۔ آپ کے ساتھ مل کر ہم اہل عجم سے تو مقابلہ کریں گے مگر عربوں سے نہیں لڑیں گے۔

۲۔ اگر کسی عربی نے ہم سے لڑائی کی تو آپ پر ہماری حفاظت لازمی ہو گی۔

۳۔ نیز یہ کہ بیت المال میں سے ہم کو وہ حصہ دیا جائے جو آپ کے اشراف اور سرداروں کو ملتا ہے۔

۴۔ اور یہ کہ عہدنامہ امیر المومنین کی تصدیق سے مرتب کیا جائے۔

حضرت ابو موسیٰ نے فرمایا کہ جب تم مسلمان ہوتے ہو تو ان شرائط کی کیا ضرورت ہے جو ہمارا حال ہے وہی تمہارا حال۔ وفد نے اسے تسلیم نہ کیا۔ اس پر حضرت ابو موسیٰ نے امیر المومنین کی خدمت میں یہ ماجرا لکھا۔ وہاں سے جواب آیا کہ جو وہ کہتے ہیں اس کو مان لو!

انھی ایام میں سیاہ سوار نے بلوچ قبائل کی طرف سے ایک بلوچ سردار کو نمائندہ بنا کر حضرت ابو موسیٰ اشعری کی خدمت میں روانہ کیا۔ یہ سردار حضرت ابو موسیٰ اشعری ؓ کی خدمت میں رات کو حاضر ہوا۔ حضرت ابو موسیٰ ؓ اور اس کے مابین جو گفتگو ہوئی۔ فیروز لولو پردے کی آڑ میں کھڑا سنتا رہا۔ فیروز وہی بدبخت ہے جس نے بعد میں حضرت فاروق اعظم کو شہید کیا تھا۔ ایرانی قوم پرست مؤرخ ملک الشعراء بہار ”گفت شنید“ کے اس واقعہ کو اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

شنید ایں سخن را کہ آں شارہ پوش — بداں دیگرے گویدا ے تیز ہوش

سیاہ سوارے کہ چوں او بجنگ — ندیدہ کسے ببر و شیر و پلنگ

چنیں با تو پیماں بہ بندد کہ رزم — سراسر شود لشکرت راچو بزم

چو فردا شود دستۂ زیں سپاہ — بیا رائی چوں تیرہ شد دشت دراہ

ببر سوئے وژآں چہ میسورتست — کہ پایاں شود رزم گہہ میسورتست

زگرداں یکے راگسارد سوار — کہ دژبان دژ را کند استوار

درِ دژ دماں برکشاید سپش — سیاہ آیدت باہمہ خویش وکس

شود باتو پیوستہ او بے درنگ — برآرد دمار از سواران جنگ

پس آنگہ بد و گفت اے اشعری — دلت شاد با دا بدیں کہتری

فیروز لولو جو در پردہ اسلام کا شدید دشمن تھا۔ اس نے یہ تمام باتیں قاصد کے ذریعے ہرمزان تک پہنچائیں اور تاکید کی کہ جس طرح بھی ممکن ہو سیاہ سوار کی دلجوئی کر کے اسے اسلام قبول کرنے سے روکیں۔ ورنہ اگر سیاہ سوار مسلمان ہو گیا تو وہ ایران اور ایرانیوں دونوں کیلئے وجہ مصیبت بن جائے گا۔ ملک الشعراء بہار نے فیروز کے پیغام کو اپنے الفاظ میں اس طرح موزوں کیا ہے۔

سیاہ سوارے کہ آزردہ باد — تنش خستہ باد و دلش مرد باد

چنیں روز بدر اشد او مایہ بس — بدو شاہ راگر بودو دسترس

فرستد یکے را کہ بارائے وراہ　　دلش راپشیماں کند از گناہ
دہد باد گشتنش سو ہر مزاں　　کہ صد در صد اندیشہ دارم ازاں
وگرنہ زنیزہ دراں کس بجنگ　　نباشد بریو و فسوں تیز چنگ
نہ نعماںؓ و نے کعبؓ و نے اشعریؓ　　نہ شعبہؓ نہ بو عبدہؓ نے دیگری
ند اندز کژی کسے راہ راست　　سیاہ سوار اے برادر بلاست
کنوں اشعری را بود رہنموںؓ　　کہ یک نیمہ زاں نیزہ داراں کنوں
فرستد سو شو ستر با سپاہ　　کہ یک سرکند کار ایں رزمگاہ
تو دانی اگر ایں بد اندیش وشوم　　تواں یا بدو دست و نیرو ببوم
بہ شورش اندر آید شود کار زار　　نہ وہ ماندہ از صد نہ صد از ہزار
بگو باسپہد کہ جائے درنگ　　نبا شد کنوں اے سپہدار جنگ
مرا مغز و اندیشہ ورائے و ہوش　　بگوید کہ باتو بگویم بکوش
بکوش و یکے چارہ کن باشتاب　　مباش از "سیاہ" اے سپہد بخواب
کہ ایں بد منش چوں رسد با سپاہ　　کند روز ایراں راسیاہ
کہ رہ داندز چارہ و چارہ زدرد　　تودرماں کن ایں را کہ پیش ازنبرد
شود بازو پوزش بخواہدز شاہ　　وگرنہ ببرُ سوئے یزداں پناہ

اس وحشت ناک اطلاع سے ہرمزان سخت فکر مند ہوا۔اس نے سیاہ سوار کو اپنے احسانات گنوائے اوراسے مختلف اسالیب سے مسلمانوں میں جذب ہونے سے روکا۔اس کے تاثرات کو بھی بہارؔ کی زبان سے سنیے۔

تو بودی بلوچی نشستہ براغ　　نہ چشمت جہاں دیدہ بود و نہ باغ
تنت رنجہ از باد سوزان ہند　　دو دیدہ پرُ ازخوں چو دریائے سندھ

پریشان و درویش و بے وقوت وزاد　　فروبستہ مژگان زخاشاک وباد

زنکران من آوردست پیش شاہ　　نہادم بسر ترگ و برترگ ماہ

"اے سیاہ سوار! تُو تو ایک بادیہ نشین بلوچ تھا۔ تیری آنکھوں نے نہ تو دنیا کو دیکھا تھا اور نہ ہی کوئی باغ تیری نظر سے گزرا تھا۔ تیرا بدن گرم لُو سے جھلس رہا تھا اور مشکلات کی کثرت سے تیری آنکھوں سے دریائے سندھ کی طرح آنسوؤں کا ایک سیلاب جاری تھا۔ بالکل پریشان، تہی دامن، زادراہ کا محتاج، خس وخاشاک اور گرد سے بچنے کے لئے تو نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ میں تجھے مکران سے شہنشاہ کی خدمت میں لے آیا اور تجھے ترقی واقبال کی اس بلندی پر پہنچایا کہ آج چاند بھی تجھ پر رشک کرتا ہے۔ کیا ان احسانات کا بدلہ یہی ہے جو تو ہمیں دینا چاہتا ہے؟"

سیاہ سوار ہرمزان کے احسانات کا ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے۔

خود ایدر گواہِ تو باشد سیاہ　　کہ دارد تن و جاں بہستی زشاہ

سخن ہائے نغز تو بے کم و کاست　　گواہی دہم سر بسر بود راست

چناں چو بگفتی بلوچی بُدم　　کہ ہرگز نہ بُد آگہی از خودم

ردے بودم اندر بیابان وراغ　　کہ جزماہ درشب بنودم چراغ

خوراکم گیاہ و شکارم ہژبر　　سرم را ہوا سائبان بود و اَبر

سریرم زمیں تکیہ گاہم بہ سنگ　　یکے زندگانی سراسر بہ تنگ

"آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ حرف بہ حرف صحیح ہے۔ بلا شبہ میں ایک بلوچ تھا اور زمانے کے نشیب وفراز سے قطعاً بے خبر، جنگل میں ایک درندے کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ رات کو سوائے چاند کے مجھے کوئی چراغ میسر نہ تھا۔ گھاس کھاتا اور شیر کا شکار کرتا تھا۔ سر پر بادل کا سایہ تھا اور زمین پر پتھر میرا تکیہ تھا۔ تو نے مجھ پر بڑا احسان کیا کہ اتنے مرتبے پر لے آیا اور میری یہ زندگی شاہ کی بھی ممنون احسان ہے لیکن اب معاملہ مذہب اور اعتقاد کا ہے اس لئے مجبوری ہے اور میں

آپ لوگوں سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہوتا ہوں۔‘‘

ہرمزآن الاہواز کا حاکم اور ایرانی سلطنت کا بہت بڑا رکن خیال کیا جاتا تھا۔ سر پر سنہری تاج رکھتا اور تخت پر جلوس کرتا تھا۔ پہلے یہ نائب سپہ سالار تھا جب قادسہ کی جنگ میں رستم مارا گیا تو ہرمزان اس کی جگہ سپہ سالار مقرر ہوا۔ مگر مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے وہ اس قدر خائف تھا کہ سیاہ سوار کو اور کچھ نہ کہہ سکا کیونکہ وہ ان مظالم سے بھی بخوبی واقف تھا جو ایرانی شہنشاہوں نے بلوچوں پر روا رکھے تھے اور جبکہ اسے یہ سلطنت چند ساعتوں کی مہمان نظر آتی تھی۔ وہ تن بہ تقدیر اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا!

زمکران من آوردمت پیش شاہ

بلوچ اسلامی لشکر یں

ہرمزان سے خط و کتابت جاری تھی کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی طرف سے اطلاع ملی کہ آپ کی شرائط امیر المومنین نے تسلیم کرلی ہیں۔اب آنے میں دیر نہ کیجئے۔ چنانچہ امیر سیاہ سوار مع تمام افسروں اور فوج کے مسلمان ہو گیا اور یہ سب تستر کے محاصرہ میں ابوموسیٰ کے ساتھ شریک ہوئے لیکن جس مستعدی اور بہادری کی توقع تھی وہ ان سے ظاہر نہ ہوئی۔

حضرت ابوموسیٰ نے سیاہ کو طلب کر کے اس کی وجہ دریافت کی۔ سیاہ سوار نے عرض کیا اوّل تو ابھی ہم اسلام کے احکام سے آپ کی طرح واقف نہیں ہیں۔ دوسرے بیت المال سے آپ نے ہم کو وہ حصہ نہیں دیا جس کے ہم مستحق تھے۔ حضرت ابوموسیٰؓ نے یہ کیفیت حضرت عمرؓ کو لکھ بھیجی۔ وہاں سے جواب آیا کہ ان کے ساتھ وہی معاملہ کرنا چاہیے جو خود مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے اور ان کے لئے مرتبہ اور کارکردگی کی بنا پر وظیفہ مقرر کیا جائے جیسا کہ خود مسلمانوں میں تفاوت درجات ملحوظ رہتا ہے۔ چنانچہ سیاہ اور اس کے ساتھ پانچ سرداروں کا نام اڑھائی ہزار والوں میں اور سو شخصوں کا نام دو ہزار والوں میں درج ہوا۔

جب یہ مرحلہ طے ہو چکا تو حضرت ابوموسیٰ نے ایک قلعے کا محاصرہ کیا سیاہ نے یہاں اپنی مردانگی اور خود تدبیری کے ایسے جوہر دکھائے کہ عرب بے اختیار عش عش کر اٹھے۔ بیان کرتے ہیں کہ سیاہ چونکہ قلعے کے نشیب و فراز سے واقف تھا اس لئے وہ رات کو تن تنہا خفیہ راستے سے قلعے میں گھس گیا اور پہرہ داروں کو قتل کر کے قلعے کا دروازہ کھول دیا۔ اس کے پیچھے مسلمانوں کا لشکر فوراً قلعے میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک خاص جگہ کا واقعہ ہے جس میں ہزارہا اہل فارس آنِ واحد میں مسلمان ہوئے۔

احمد بن یحییٰ بن جابر الشہیر بالبلاذری المتوفی ۲۷۹ھ کا بیان ہے کہ ابوموسیٰ اشعریؓ نے

الربیع بن زیاد کو البلکانیہ بھیجا۔ الربیع نے جنگ کی اور البلکانیہ فتح کرلیا۔ سیاہ سوار کے قبائل اسی قلعے میں تھے۔ جنہیں بلاذری ''الاساورہ'' سے موسوم کرتا ہے۔ انہوں نے امان طلب کی۔ ابوموسیٰ نے انہیں بھی امان دی اور وہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ بلاذری فرماتے ہیں کہ ایک روایت کی رو سے سیاہ سوار کے قبائل پہلے سے امان طلب کر کے ابوموسی سے جا ملے تھے اور تستر کے مقابلے میں شریک ہوئے تھے۔ (اشاعت اسلام از مولانا حبیب الرحمن مرحوم)

مولانا حبیب الرحمن اپنی گراں قدر تصنیف ''اشاعت اسلام'' میں سیاہ سوار اور اس کے قبائل کے قبول اسلام کا ذکر کرنے کے بعد حسب ذیل نتائج اخذ کرتے ہیں۔

ا۔ اسلام کی حقانیت اور مسلمانوں کے آنے اور ممالک عراق و شام پر مسلط ہو جانے کا علم ہر دو ملکوں کے اہل علم و عقل کو از روئے روایات مذہبی حاصل تھا اور قبل از ظہور اسلام بھی ان میں اس امر کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا۔ قیصر روم و شام ہرقل کو بھی جو اہل کتاب میں سے تھا، یہ علم تھا۔

۲۔ سیاہ سوار اور اس کے ساتھی اسلام کو مذہب حق سمجھ کر برغبت خوشی مسلمان ہوئے۔ خوف یا طمع زر کے باعث نہیں ہوئے کیونکہ جان و مال کی حفاظت اور اپنے مال و دولت پر بآزادی قابض رہنے کے ساتھ مصالحت کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اہل سوس بھی مصالحت کر کے محفوظ و مامون ہو چکے تھے اور اس کی ہزاروں مثالیں موجود تھیں کہ مسلمانوں نے جو عہد کیا اسے پورا کیا۔

باقی رہیں ان کی شرائط یہ بھی طمع زر کے سبب نہ تھیں۔ بلکہ مساوی حقوق کا مطالبہ انسانیت و شرافت کا مقتضی ہے۔ اس میں نہ طمع زر کو دخل ہے نہ حُبّ جاہ کو۔ ایران میں برضا ورغبت مسلمان ہو جانے کے بعد اسلامی فتوحات میں بلوچوں نے کیا کردار انجام دیا۔ وہ سیاہ سوار کے ایک واقعہ سے ہی ظاہر ہے۔ یہ شعر اسی کے حق میں کسی نے کہا ہے اور خوب کہا ہے

بہ تنہا کند کار یک لشکرے

ہنر ہائے اُو را سزد دفترے

البلاذریؒ نے بلوچوں کا ایک اور کارنامہ بھی فتوح البلدانؒ میں درج کیا ہے۔ لکھتا ہے کہ:۔

''اہل فارس میں سے بہادر سپاہیوں کی ایک جماعت الاساورہ کے ساتھ مل گئی جب انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے تو اس جماعت نے بھی الاساورہ کے ساتھ اسلام قبول کرلیا''۔

(فتوح البلدان)

فردوسیؒ شاہنامے میں بلوچ اقوام کو باغی اور انقلاب پسند بیان کرتا ہے۔ نوشیرواں کے زمانے میں ویلم، گیلان اور ماژندران کے بلوچوں نے صغدانیہ (ماوراالنہر) تک بغاوت کی جو آگ بھڑکائی تھی اگرچہ نوشیروان کی جابرانہ کارروائی سے یہ کچھ عرصہ کے لئے دب گئی تھی۔ لیکن یزدجرد کے زمانے میں پھر سلگ اٹھی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فتح قادسیہ اور مدائن کے بعد مجاہدین اسلام نے تخت کیانی کو ملیامیٹ کرکے درفش کاویانی کو سرنگوں کردیا۔

بصرہ میں بلوچوں کی آبادیاں

مملکت ایران فتح ہوجانے کے بعد سیاہ سوار نے بصرہ کو بلوچوں کی آبادی کیلئے منتخب کیا۔ البلاذری فتوح البلدان میں'' امر الاساورہ والزط'' کے ضمن میں لکھتا ہے کہ الاساورہ (بلوچوں) نے پہلے بنی الازد سے برادرانہ عہدو پیمان کیا۔ پھر پوچھا کہ بنی الازد اور بنی تمیم میں سے کون سا قبیلہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے خلفاء سے نسب میں زیادہ قرب رکھتا ہے اور دونوں سے کس کا اثر زیادہ ہے۔ کہا گیا بنی تمیم!

''پس انہوں نے تمیم سے برادرانہ عہد و پیمان کرلیا۔ بنی تمیم کے سردار اُن دنوں الاحنف بن قیس تھے''۔

(فتوح البلدان جلد ۲ ص ۷۹)

انہوں نے اپنے لئے نہر کھودی۔ جو ''نہر الاساورہ'' کے نام سے معروف ہے۔''

(فتوح البلدان جلد ۲ ص ۷۶)

ابوالحسن المدائنی نے کہا کہ ''شیرویہ الاسواری'' (جو کہ مشہور بلوچ سردار تھا) نے ارادہ کیا تھا کہ خالد بن المعمر کے پاس بکر بن وائیل میں اور بنی سدوس میں اترے لیکن سیاہ نے انکار کیا۔ اس لئے یہ لوگ بھی بنی تمیم میں اترے۔ اس زمانے میں البصرہ میں نہ بنی الازد تھے، نہ بنی عبد شمس!

صاحب فتوح البلدان لکھتے ہیں کہ السیابجہ اور الزط اور الاندغار یہ قومیں فارسیوں کے لشکر یں تھیں اور سندھ سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کو قید کرلیا گیا۔ جب انہوں نے وہ واقعہ سنا جو الاسادرہ سے ہوا تھا تو یہ قومیں بھی اسلام لائیں اور ابوموسیٰ کے پاس آئیں۔ انہوں نے ان کو البصرہ میں اتارا۔ جس طرح الاساورہ کو البصرہ میں اتارا گیا تھا۔

صاحب فتوح البلدان لکھتے ہیں:۔

''السیابجہ میں سے ایک جماعت البصرہ کے بیت المال کی مؤکل (محافظ) تھی۔ بعض کے نزدیک ان کی تعداد چالیس تھی اور بعض کہتے ہیں کہ چارسو تھی۔ طلحہ بن عبیداللہ اور زبیر بن عوامؓ جب بصرے میں آئے۔ ان دنوں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی طرف سے عثمان بن حنیفؓ الانصاری بصرہ کے عامل (گورنر) تھے۔ ان حضرات نے بیت المال پر تصرف کرنا چاہا۔ لیکن محافظین نے انکار کردیا کہ جب تک حضرت علیؓ نہ آئیں بیت المال سپرد نہیں کریں گے۔ طلحہ و زبیرؓؓ کے آدمیوں نے صبح سویرے ان پر حملہ کردیا اور انہیں قتل کردیا۔ حملہ آوروں کے سردار و

عبداللہ بن زبیر تھے اور السیابجہ کا سردار اس زمانے میں ابو سالمتہ الزطی تھا جو نہایت صالح انسان تھا''۔ (فتوح البلدان جلد ۲ ص ۸۱)

بصرے کے اس ہنگامہ نے بلوچوں کی بہادری اور دیانت داری کو اجاگر کردیا اور عرب ان کی دوستی پر اعتماد کرنے لگے۔ چنانچہ جب سواحل شام اور انطاکیہ کی سرحدوں کیلئے امیر معاویہؓ کو فرض شناس اور بہادر لوگوں کی ضرورت محسوس ہوئی تو مصاحبین نے بالاتفاق الاساورہ کا نام لیا۔ چنانچہ امیر معاویہ نے گورنر بصرہ کو لکھا کہ وہ الزط اور السیابجہ بلوچوں میں سے چیدہ چیدہ افراد دمشق روانہ کرے۔ چنانچہ انہیں حکومت کی طرف سے سواحل شام اور انطاکیہ کی سرحدوں پر آباد کردیا گیا۔ ان لوگوں نے اپنے فرائض کو اتنی عمدگی سے انجام دیا کہ خلیفہ بن ولید عبدالملک نے اپنے دور خلافت میں چند اور الزط قبائل کو انطاکیہ کی طرف منتقل کیا۔

بعض مؤرخین کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امیر معاویہ نے اپنے لڑکے یزید کی ماتحتی میں جو لشکر قسطنطنیہ کی مہم پر روانہ کیا تھا اس میں بھی الاساورہ، الزط اور السیابجہ کی کافی مقدار شامل تھی۔

صاحب فتوح البلدان کا بیان ہے کہ جب الاساورہ کے ساتھ الزط اور السیابجہ (یہ زندانوں کی محافظت اور پہرہ داری کا کام کرتے تھے۔ طبری السیابجہ) مل گئے تو بنی تمیم نے ان سے نزاع کی اور وہ ان سے برداشتہ خاطر ہو گئے۔ الاساور بنی سعد میں اور الزط والسیابجہ بنی حنظلہ میں چلے گئے اور ان کے ساتھ مل کر مشرکوں سے قتال کرتے رہے۔ پھر ابن عامر کے ساتھ خراسان کی طرف گئے لیکن جمل وصفین میں شریک نہیں ہوئے اور یوم مسعود تک انہوں نے کسی باہمی جنگ میں حصہ نہ لیا۔ یوم مسعود کے بعد الزبدہ میں شریک ہوئے اور فتنہ ابن الاشعث میں اس کے ساتھ ہو گئے۔ اس پر حجاج نے انہیں نقصان پہنچایا اور ان کے مکانات گرا دیئے۔ ان کے وظائف (اصل الفاظ ہیں وحط اعطیاتھم عطیات سے وظائف بھی مراد ہو سکتے ہیں اور ضیاع واقطاع بھی)

بند کردیئے ان میں سے بعض کو جلاوطن کردیا اور کہا:

"تم سے یہ شرط تھی کہ تم ہم میں سے ایک جماعت کے خلاف دوسری جماعت کی اعانت نہ کروگے"

(الطبری جلد اوّل)

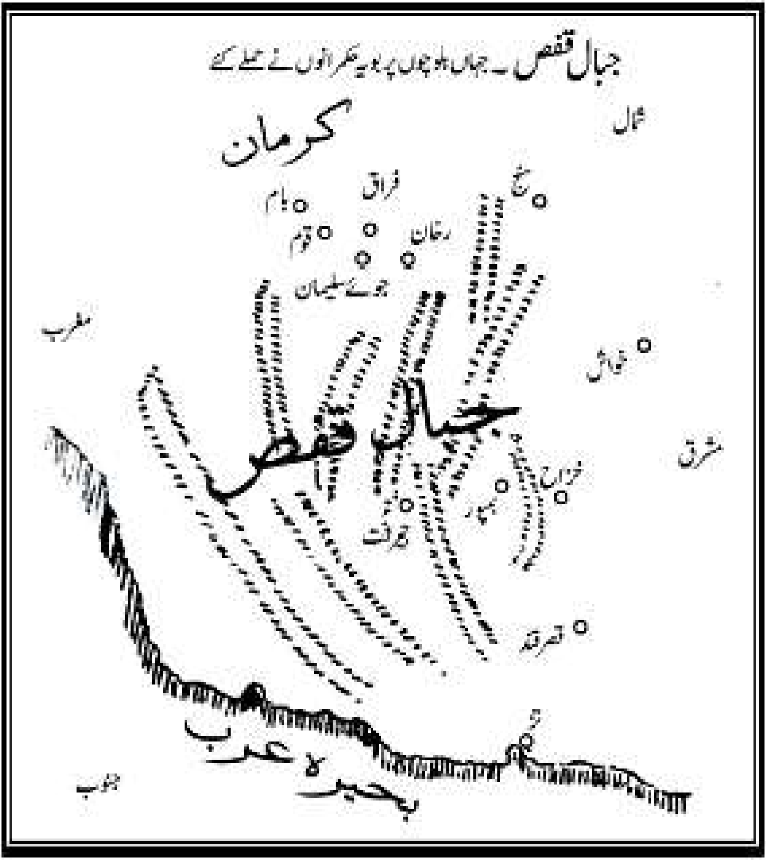

(یہ اشارہ اس معاہدہ کی طرف ہے جو الاساورہ نے حضرت موسیٰ اشعریؓ سے کیا تھا۔ معاہدے کی اصل عبارت یہ تھی۔ ”آپ کے ساتھ مل کر اپنی قوم اہل عجم سے تو مقابلہ کریں گے مگر عربوں سے نہیں لڑیں گے“)

صاحب فتوح البلدان کا بیان ہے کہ الاساورہ (بلوچ) جو الربذہ کی جنگ میں شامل ہوئے تھے۔ بڑے ماہر تیر انداز تھے۔ ان کا نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا تھا۔ اس لئے اپنے تیروں سے انہوں نے بہت سے آدمیوں کو ہلاک کرڈالا تھا۔ (فتوح البلدان جلد ۲ ص ۸۰)

نیز البلاذری فرماتے ہیں کہ:

”حجاج کے پاس سندھ کے زط (جدگال یا جت بلوچ) اور وہاں کی دوسری قومیں لائی گئیں۔ ان کے ساتھ ان کے بال بچے اور مویشی بھی تھے۔ حجاج نے انہیں کُسکر کے نشیبی علاقے میں آباد کردیا“۔

پھر یہ لوگ البطیحہ میں پھیل گئے۔ یہاں ان کی نسلیں بڑھیں پھر بھگوڑے علاقوں میں سے ایک قوم ان کے پاس پناہ گیر ہوئی۔ باہلہ کے موالی اور محمد بن سلیمان بن علی کے نہیالی قرابتدار اور دوسرے لوگ ان کے پاس جمع ہوئے اور یہ سب آپس میں شیر وشکر ہو گئے۔

(فتوح البلدان جلد دوم صفحہ ۸۰)

بعد کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ کافی طاقت کے مالک ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ حکومت کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اس لئے معتصم باللہ کو انتدابی کارروائی کرنا پڑی۔ اس نے ان پر پانی بند کرادیا اور اس قدر تنگ کیا کہ وہ بدون جنگ پکڑ لئے گئے اور چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں مدینۃ السلام لائے گئے۔ ان میں سے بعض کو خانقین بھیج دیا گیا اور باقی عین زربہ اور ثغور میں پراگندہ کردیئے گئے۔ (فتوح البلدان جلد ۲ ص ۸۰۔۸۱)

بلوچ کرمان کی وادیوں میں

نوشیرواں کے حملے کے وقت سے ہزاروں بلوچ جبال قفص میں گھسے پڑے تھے۔ اگرچہ یہ مقام ایران کے قلب میں واقع تھا۔ مگر دشوار گزار ہونے کے سبب مقابلتاً زیادہ محفوظ تھا۔ نیز ان دنوں ساسانی سلطنت عورتوں اور بچوں کا کھلونا بن چکی تھی۔ اس مملکت کو نوشیرواں جیسا بادشاہ پھر نصیب نہ ہوا۔ جو ملک کو سنبھالتا۔ بلوچوں کے زخم تازہ تھے۔ انہوں نے ساسانیوں کی سیادت کو کبھی تسلیم نہ کیا اور موقع کے منتظر رہے۔ یہاں تک کہ اسلام نے ہرمز پہنچ کر قصر شاہی پر اس زور سے دستک دی کہ مملکت ایران کے تمام قلعے ہل گئے اس وقت بلوچوں نے بھی اپنی غاروں سے جھانک کر دیکھا اور اطمینان کا سانس لیتے ہوئے باہر نکلے۔ ایران کا وہ ملک جس کے مقتدر شہنشاہ نے بلوچوں کو روندا تھا۔ اب اس کا ملک عرب مجاہدین کے قدم چوم رہا تھا اور اس کی اولاد چوہوں کی طرح جائے پناہ ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ ایران کو مسخر کرنے کے بعد عرب آگے بڑھے اور انہوں نے کرمان کو بھی اپنی امان میں لے لیا۔ اس طرح جو ملک بلوچوں کے لئے پہلے اجنبی تھا اب ان کا وطن بن گیا۔ انہوں نے اپنی بگڑی ہوئی حالت سدھاری اور جبال قفص کی بے آب و گیاہ وادی کو محنت شاقہ کے بعد کاشت کے قابل بنالیا اور دو صدی کے عرصہ میں ہی پہلے کی طرح یہ لوگ جنگی طاقت بن گئے۔

چنانچہ شیخ شہاب الدین ابوعبداللہ یاقوت حمصوی بلوچوں کا تعارف اس طرح سے کراتا ہے۔

بَلُوصِ جیَل کالاکراد ولَھم بلادَ وَاسعة بین فاَرس و کِرمَان تَعرف بَھِم فِی سُفح جَبال اَلقفُس وھم ارلوباس وَقُوة وعَدد و کثَرہ۔وَلا تخافَ القفُص وَھُم جَیل آخر ذکروافی مرَضُعھُم مع شَدة بِاَسھم مِن اَحدَالامن البلُوص۔

(معجم البلدان جلد ۲ ص ۲۸۱)

''بلوچ کردوں کی طرح ایک قوم ہے۔ان کی رہائش کے لئے فارس اور کرمان کے درمیان وسیع علاقے ہیں جو ان سے مشہور ہیں۔ یہ جبال القفص کے میدانی اور پہاڑی علاقوں میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ نہایت جنگجو اور طاقت ور ہیں۔ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اور قفص یعنی کوچ سوائے بلوچوں کے کسی سے نہیں ڈرتے۔ باوجودیکہ وہ خود بھی ایک جنگجو قوم ہے''۔

بلوچوں کا جو قافلہ حمص (جو لوگ حمص سے آئے تھے حمصوی کہلاتے تھے۔اب امتداد زمانہ سے یہ لفظ حمزئی بن گیا ہے!) اور وادی البلوص سے روانہ ہو کر جبال القفص میں پناہ گزین ہوا تھا۔اس نے تقریباً پانچ صدیوں کا عرصہ اس وادی میں بسر کیا۔ یہاں بھی ان پر ہزاروں انقلاب آئے اور سامراجی طاقتوں نے انہیں آرام سے اوقات بسر کرنے کا موقع نہ دیا۔

طبری کے بعد جن ثقہ مؤرخین نے کرمان اور جبال قفص کے بلوچوں کا تفصیل سے حال درج کیا ہے۔ ان میں ابو شجاع اوہواری، بلال بن محسن اور ابن مشکا دھی کا بڑا مقام ہے۔ابوشجاع اوہواری، خلیفہ مقتدی باللہ کا وزیر تھا۔ بلال بن محسن بھی کچھ عرصہ بغداد میں وزارت اور سیکرٹری شپ کے عہدوں پر ممتاز رہا۔ابن مشکا دھی اپنے دور کا مدبر اور ادیب شہیر خیال کیا جاتا ہے۔اوّل الذکر دو مؤرخین نے خلیفہ متکفی اللہ اور خلیفہ مطیع اللہ کے حالات ۳۲۶ھ سے لکھنے شروع کئے جنہیں مشکا دھی نے ۳۶۹ھ تک مکمل کیا۔ یہ تاریخ عربی میں تھی۔ مسٹر ڈی ایس مار گولیتھ نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور دو جلدوں میں طبع ہوئی۔ جہاں قفص کے بلوچوں سے سامراجی طاقتوں کی جو جھڑپیں ہوئیں اور نوشیروان سے بھی بڑھ کر سامراجیوں نے شمع آزادی کے ان پروانوں سے جو غیر انسانی سلوک کیا۔اس کی روئیداد ان مؤرخین نے تفصیل سے لکھی ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بلوچ قوم کو حصول آزادی کے لئے کتنی قربانیاں دینی پڑی تھیں۔زمانے کی سیاست کا یہ پہلو کتنا داغدار ہے کہ اگر کوئی کمزور جہد البقا کے ارادے سے پھڑ پھڑانے کی کوشش کرتا ہے تو اسے بغاوت اور ڈکیتی سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن جب کوئی

بڑی طاقت کسی کمزور کو ختم کرنے کا منصوبہ بناتی ہے تو اسے انتدابی کارروائی کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ ازل سے یوں ہی چلا آتا ہے۔ لاکھوں چھوٹی ریاستوں کو بڑی سلطنتیں اس طرح ہڑپ کر گئیں گویا وہ بڑی مچھلیاں تھیں اور ان کا پیدائشی حق تھا کہ چھوٹی مچھلیوں کو اپنا نوالہ بنائیں۔ اسی جدوجہد میں لاکھوں سرباز مجاہد، قوم اور ملک پر سے تصدق ہو گئے۔ کشمیر، فلسطین اور ناگاؤ کی سرزمین میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہمارے سامنے ہے اور مراکش اور الجیریا وغیرہ پر جو گزرا ہے وہ چند سالوں کی بات ہے۔ ہمارے ذہن اسے بھول نہیں سکتے اور تاریخ کے اوراق شمع حریت کے ان جیالے پروانوں کے تذکروں سے ہمیشہ درخشاں رہیں گے۔

ہرگز نمیرد آنچہ دلش زندہ بعشق

ثبت است برجریدہ عالم دوامِ ما

دولت بویہ ویلمی کا آغاز

اب ذیل میں ہم اس حکومت کا ناظرین کرام سے تعارف کراتے ہیں۔ جس نے بلوچوں کو صفحہ دہر سے مٹانے کی انتہائی ظالمانہ کوشش کی۔ یہ حکومت دولت بویہ دیلمی تھی۔

ابوشجاع بویہ نامی ایک مفلس ماہی گیر ویلم میں رہتا تھا جو مچھلیاں پکڑ کر اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ وہ اتنا قلاش تھا کہ اس نے غریبی کے سبب اپنے تینوں لڑکوں کو اپنے سے جدا کر کے سلطان مرواویح کی فوج میں بھرتی کرا دیا تھا۔ خدا کو کچھ اور منظور تھا اور انہی تین ماہی گیروں نے بغداد اور اصفہان کے محلات میں لمن الملک الیوم کا نعرہ لگانا تھا۔ چنانچہ اقبال نے یاوری کی اور یہ تینوں سپاہی معمولی سپاہی سے ترقی کر کے بادشاہت کے مرتبے پر جا پہنچے۔ مگر ”عاقبت گرگ زادہ گرگ شود“ کے مصداق انہوں نے عنان اختیار سنبھالتے ہی اپنے پر پرزے

نکالنے شروع کئے اور خلق خدا کا ناک میں دم کر دیا۔

مرواد یح، طبرستان، ہمدان اور اصفہان کا حکمران تھا۔ ابوشجاع بویہ کے تینوں بیٹے علی احمد اور حسن بطور سپاہی کے بھرتی ہوئے اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے بڑے مرتبے پر پہنچ گئے۔ سلطان مرواد یح نے علی بن بویہ کو جو سب سے بڑا تھا کرخ کی حکومت عطا کی۔ علی اپنے بھائیوں کو بھی ہمراہ لے گیا۔ اس نے کرخ پہنچ کر تھوڑے ہی دنوں میں ایسا قبضہ جمایا کہ مرواد یح کو اس کا وہاں سے علیحدہ کرنا مشکل ہو گیا۔ علی بن بویہ نے صرف کرخ پر اکتفانہ کیا بلکہ اس نے لشکر جمع کر کے گرد و پیش کے قلعوں پر بھی چڑھائی کر دی اور یکے بعد دیگرے کئی قلعے فتح کر لئے۔ کچھ عرصہ بعد اس نے اصفہان پر بھی قبضہ کر لیا۔ یہ کیفیت دیکھ کر مرواد یح کو اپنی فکر پڑ گئی۔ اس نے علی بن بویہ کو لکھا کہ ویلم کا لشکر میرے پاس بھیج دو۔ علی بن بویہ نے اس کے حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے بھائی حسن بن بویہ کی امداد سے مرواد یح کے گورنروں کو شکست دے کر پورے فارس پر قبضہ کر لیا اور دولت بویہ کی بنیاد ڈالی۔ اس خاندان نے ایک ایسی حکومت قائم کی جو عرصے تک قائم اور برقرار رہی۔

حسن اتفاق اور بخت کی یاوری دیکھئے کہ جب علی بن بویہ نے شیراز پر قبضہ کیا تو اس کی حالت یہ تھی کہ فوجیں تنخواہیں طلب کرتی تھیں مگر اس کا خزانہ خالی تھا اور یہ خوب جانتا تھا کہ اگر سپاہیوں کو تنخواہیں نہ ملیں تو وہ باغی ہو جائیں گے۔ وہ اسی فکر میں غلطاں و پیچاں ایک کمرے میں چت لیٹا پڑا تھا اور چھت کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا کہ دفعتہ چھت سے ایک سانپ گر پڑا۔ علی بن بویہ نے حکم دیا کہ اس مکان کی چھت گرا دی جائے۔ جب چھت گرائی گئی تو اس میں سے سونے کے سکوں سے لبریز صندوق برآمد ہوئے۔ اس خزانہ کے ہاتھ آنے سے علی بن بویہ کو بڑی مسرت ہوئی اور اس نے تمام لشکر کی تنخواہیں تقسیم کر دیں!

دوسرے دن ایک اور عجیب اتفاق ہوا علی بن بویہ نے کپڑا سلوانے کیلئے ایک درزی کو طلب کیا۔ جونہی سپاہی درزی کو لے کر حاضر ہوئے وہ شدت خوف سے کانپنے لگا اور چلا کر بولا

حضور! خدا کی قسم مجھے ان صندوقوں کا کچھ علم نہیں ہے۔ میں نے انہیں نہیں دیکھا۔ علی بن بویہ حیران ہوا۔ اس نے درزی کے مکان سے صندوق منگوا کر دیکھے تو وہ اشرفیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ جو خزانہ چھت سے برآمد ہوا یا جو دولت درزی کے گھر سے ملی ہے یہ مرواذیح کے بھائی مظفر بن یاقوت کی تھی۔ جو جلدی میں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکا تھا۔ اس سے بھی حیرت انگیز واقعہ اور یہ ہوا کہ ایک روز علی بن بویہ گھوڑے پر سوار چلا جا رہا تھا کہ اس کے گھوڑے کے سم زمین میں دھنس گئے۔ علی بن بویہ نے اس جگہ کو کھدوایا تو بہت بڑا خزانہ برآمد ہوا۔ انہی دنوں میں اسے دولت صفاریہ کا خزانہ بھی مل گیا۔ جس کی مقدار پانچ لاکھ دینار تھی۔ اس طرح علی بن بویہ کے ہاتھ بڑی دولت آ گئی اور وہ اخراجات سے مستغنی ہو گیا!

۳۲۳ھ میں علی بن بویہ نے خلیفہ راضی باللہ کی خدمت میں درخواست کی کہ اگر مجھے فارس کی سند حکومت عطا کی جائے تو ایک کروڑ اسی لاکھ درہم سالانہ خراج دربار خلافت میں بھیجا کروں گا۔ خلیفہ نے سند حکومت، خلعت اور سیاہ پرچم بھیج دیا اور علی کو عماد الدولہ، حسن کو رکن الدولہ اور احمد کو معز الدولہ کے خطابات مرحمت کئے۔

مرواذیح مر چکا تھا اور اس کا بھائی بشم گیر تاب مقاومت نہ لا کر آذربائیجان کو منتقل ہو گیا۔ بویہ برادران کے لئے اب میدان صاف تھا۔ چنانچہ حسن بن بویہ اصفہان پر، احمد بن بویہ اہواز پر اور علی بن بویہ فارس پر حکومت کرنے لگے۔ اس طرح فارس، اصفہان اور اہواز پر بیک وقت بنی بویہ کی حکومتیں قائم ہو گئیں۔

۳۳۲ھ میں احمد بویہ نے واسط پر قبضہ کر لیا۔ ان دنوں بغداد کا خلیفہ برائے نام رہ گیا تھا۔ تمام صوبیدار خودمختار ہو چکے تھے۔ بغداد اور اس کے مضافات تک خلافت محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ احمد بن بویہ کے حوصلے بڑھ چکے تھے۔ اس نے جب دارالخلافت کا نقشہ بگڑا ہوا دیکھا تو

لپک کر بغداد پر قبضہ کرلیا۔ خلیفہ متکفی باللہ نے اسے ملک کا خطاب دیا اور اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔ احمد بن بویہ نے اپنے نام کے سکے مسکوک کرائے اور امور خلافت کے سیاہ وسفید کا مالک بن بیٹھا۔ متکفی باللہ نے اس کے جال سے نجات پانے کی کوشش کی تو احمد بن بویہ نے اس کی آنکھیں نکلوا کر قید کر دیا اور اس کی جگہ مطیع باللہ کو تخت پر بٹھایا۔ احمد بن بویہ اسے سو دینار روزانہ تنخواہ دیتا تھا۔ امور سلطنت میں اسے دخیل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ ۳۵۰ھ میں معزالدولہ احمد بن بویہ نے اپنے لئے ایک عظیم الشان قصر تعمیر کرایا جو خلفائے عباسیہ کے محلات پر چشمک زنی کرتا تھا۔ (تاریخ عالم اسلام جلد ۲ ص ۷۶۰)

۹ ذی الحج ۳۵۵ھ کو معزوالدولہ احمد بن بویہ نے عمان پر لشکر کشی کر کے قرامطہ کو شکست دی۔ ہزاروں قرمطہ قتل کئے اور ان کی نواسی کشتیاں جو سمندر میں لنگر انداز تھیں۔ سب جلا کر غرق کر دی گئیں۔ معزالدولہ ربیع الثانی ۳۵۶ھ میں مر گیا۔ اس نے بغداد میں ۲۲ سال حکومت کی اور مرنے سے پہلے اپنے بیٹے بختیار کو ولی عہد مقرر کیا۔

عضدالدولہ ملک بختیار بویہ

خلافت عباسیہ اتنی کمزور ہو چکی تھی اور خلیفہ اتنا بے بس تھا کہ معزالدولہ نے جو چاہا وہ اس میں کچھ دخل نہ دے سکا۔ معزالدولہ نے اپنے بیٹے کو ولی عہد بنایا اور وہ تخت نشین بھی ہو گیا لیکن مطیع اُف تک نہ کر سکا۔ عضدالدولہ نے خلیفہ مطیع باللہ کی تنخواہ بدستور جاری رکھی مگر ۳۶۲ھ میں اس نے خلیفہ کی تنخواہ بند کر دی اور اس کا نام بھی خطبہ سے نکال دیا۔ ۳۶۳ھ میں عزالدولہ کے سپہ سالار سبتگین نے بغاوت کر دی اور عضدالدولہ کے قصر کو لوٹ کر اس کے اہل وعیال کو گرفتار کر کے واسط بھیج دیا۔ خلیفہ مطیع چونکہ مفلوج ہو چکا تھا اس لئے اسے معزول کر کے اس کے بیٹے طائع

للہ کو تخت نشین کیا۔ ۳۶۴ھ میں سبکتگین کا واسط میں انتقال ہو گیا اور عضد الدولہ نے دوبارہ بغداد پر قبضہ کر لیا۔

عضدؒ الدولہ بن رکن ؒالدولہ حسن بویہ کا غلبہ

اسی سال عضد الدولہ پسر رکن الدولہ حسن بویہ بغداد کے اقتدار اعلیٰ کا مالک بن بیٹھا اور عز الدولہ کی حیثیت نائب السلطنت کی سی رہ گئی۔ عضد الدولہ نے نگرانی کے لئے ابوالفتح کو بغداد میں چھوڑا اور خود فارس میں چلا آیا۔ کسی زمانہ میں خراسان بغداد کا ایک ادنیٰ صوبہ تھا لیکن اس زمانے میں خراسان کی حکومت زبردست تھی اور بغداد اس کا صوبہ بن کر رہ گیا تھا اور خلیفہ کی حیثیت ایک قیدی سے زیادہ نہ تھی۔

۳۶۶ھ میں رکن الدولہ حسن بویہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے انتقال پر اس کا بیٹا عضد الدولہ تخت نشین ہوا۔ ۳۶۷ھ میں عضد الدولہ سے جنگ کی۔ اسے شکست دے کر قتل کر ڈالا اور عضد الدولہ عراق اور فارس کا بلاشرکت غیرے مالک بن گیا اور ۳۷۲ھ میں خود بھی جبار مطلق کے حضور پیش ہونے کے لئے اس جہان سے رخصت ہو گیا۔

اس مختصر تعارف سے بویہ حکمرانوں کی ریاستی قوت اور شوکت کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ جب انہوں نے خلفائے بغداد اور سلاطین موصل، فارس اور خراسان کو کچو کے دے کر اپنا مطیع بنا لیا تھا تو جاگیردار اور قبائلی سردار کس باغ کی مولی تھے۔

بلوچوں پر بویہ برادران کے بزدلانہ حملے

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں بلوچ، نوشیرواں کے زمانے سے جبال قفص میں آباد تھے۔ اگرچہ ان کی بود و باش قبائلانہ تھی۔ مگر اپنی آزادی کو وہ ہر قیمت پر برقرار رکھے چلے آتے تھے۔ بویہ حکمرانوں کے زمانے میں تمام بلوچ قبائل کے سردار امیر علی بن زنجی تھے جو عوام میں ابن

کلا دھی مشہور تھے۔

امیر علی اور اس کی قوم کے لوگ اگرچہ جنگجو اور بڑے بہادر تھے۔ مگر گردو پیش کے طاقتور سلاطین سے بگاڑ پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ جب بھی ان پر حملہ کرتے یہ انتہائی ملائمت سے پیش آتے اور معقول خراج ادا کر کے صلح کر لیتے تھے۔ بااین ہمہ نہ تو کبھی امیر علی بن زنجی نے کسی سلطان کے دربار میں حاضری دی تھی اور نہ کبھی اس کی قوم کا کوئی فرد کسی حکمران کی حضوری میں پیش ہوا تھا۔ عمادالدین علی بن بویہ نے جب صوبہ فارس پر اچھی طرح سے نظم اور ضبط قائم کر لیا تو اس نے اپنے چھوٹے بھائی احمد بن بویہ کو ایک بہت بڑا لشکر دے کر کرِمان کی مہم پر روانہ کیا۔

(تاریخ ابن مشکا دھی ترجمہ مسٹر ڈی ایس مار گولوئیتھ)

جونہی بویہ اس صوبہ کے دارالحکومت جیرفت کے قریب پہنچا۔ امیر علی بن زنجی کا سفیر حملہ آور سے تبادلہ خیال کرنے کے لئے شہر سے برآمد ہوا۔ امیر علی قفص اور بلوچ قبائل کا ہر دلعزیز حکمران تھا۔ اس کے آباؤ اجداد نے ان تمام علاقوں پر حکمرانی حاصل کر لی تھی۔ جن پر یہ قوت بازو سے قابض چلا آتا تھا۔

ابوالحسن احمد بن بویہ نے بلوچوں کے سفیر سے کھل کر باتیں کیں اور پھر اپنا سفیر امیر علی کی خدمت میں بھیجا تاکہ امیر سے جیرفت میں داخلہ کی اجازت طلب کرے۔ امیر علی نے نہ صرف اجازت دی بلکہ تمام سرداران قبائل کو جلو میں لے کر احمد بن بویہ کے استقبال کو نکلا اور ایک لاکھ درہم بطور نذرانہ پیش کئے۔ نیز دس لاکھ درہم سالانہ خراج کے طور پر ادا کرنے کا وعدہ کیا اور احمد بن بویہ کا نام اپنے نام کے ساتھ خطبوں میں شامل کیا۔ احمد بن بویہ خوش ہو گیا کہ بغیر خونریزی کے مقصد حاصل ہو گیا۔ یہ جیرفت سے رخصت ہو کر آنے کو تھا کہ اس کے سیکرٹری کو جو بھینگا ہونے کے سبب ''کوردیپر'' مشہور تھا۔ خبث باطنی کی وجہ سے یہ مصالحت پسند نہ آئی۔ اس نے رازدارانہ طور پر کہا۔

”حضور! آپ کیا کر رہے ہیں۔ایسے مواقع کیا بار بار آتے ہیں۔رات کو شب خون مار کر جیرفت پر قبضہ کر لیجئے اور بلوچوں کو چوہوں کی طرح مار مار کر بھگا دیجئے۔اس وقت جیرفت میں بلوچوں کا کوئی لشکر موجود نہیں، اور نہ ہی اتنے تھوڑے عرصے میں وہ فوج جمع کر سکتے ہیں!“ احمد بن بویہ نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور اس دور کے حکمرانوں کی طرح عہد شکنی کر کے شب خون مارا مگر یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ بلوچ اپنی حفاظت کیلئے پوری طرح تیار ہیں طرفین میں خوفناک جنگ ہوئی اور بویہ کی فوج سے چند اشخاص بمشکل اپنی جان بچا سکے۔بلوچوں نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے اور بچے کھچے فوجیوں کو گرفتار کر لیا۔اس جنگ میں احمد خود بھی بری طرح زخمی ہوا اور اس کا دایاں ہاتھ کٹ گیا اور بائیں ہاتھ کی چار انگلیاں قلم ہو گئیں۔سر اور جسم کے دوسرے حصوں پر کاری زخم آئے۔وہ شدید مجروح ہو کر لاشوں کے ساتھ ڈھیر ہو گیا۔اس لئے تاریخ میں دائیں ہاتھ اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں کے کٹ جانے کی وجہ سے احمد الاقطع کے نام سے مشہور ہوا۔سویرے امیر علی نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ دشمن کی لاشوں میں احمد کی لاش تلاش کریں۔اتفاق سے نیم جان لاشوں میں احمد زندہ مل گیا چونکہ جنگ ختم ہو چکی تھی اور دشمن اس وقت قابل رحم حالت میں سامنے پڑا تھا۔بلوچی رگ حمیت جوش میں آئی اور اس نے ایک مرد مومن کی طرح اپنے دشمن کی تیمار داری اپنے ذمے لے لی اور دوسرے زخمیوں کی دیکھ بھال اپنے لشکریوں کے سپرد کی۔ صحت یاب ہونے پر ان سب کو حراست میں لے لیا گیا۔

احمد بن بویہ کے بڑے بھائی علی بن بویہ حاکم اصفہان کو پل پل کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ جونہی اسے بھائی کے صحت یاب ہونے کی اطلاع ملی۔اس نے ایک وفد سفارت کے طور پر جیرفت روانہ کیا۔جس کی قیادت قاضی شیراز ابو عباس کے سپرد تھی۔اس وفد میں بویہ حکومت کے بہت سے دوسرے معتمدین بھی شامل تھے۔امیر علی نے وفد کی بڑی عزت کی اور احمد بن بویہ اور اس کے رفیقوں کو قیمتی خلعتیں اور زادراہ کے تمام ضروری سامان کے ساتھ وفد کے ہمراہ

کر دیا۔ بجائے اس کے کہ احمد بن بویہ، امیر علی ابن کلادھی کا شکر گزار ہوتا کہ اس نے قریب المرگ دشمن کی جان بچائی تھی۔ اسے خلاع فاخرہ سے نوازا اور عزت کے ساتھ واپس کر دیا تھا۔ اپنی وعدہ خلافی اور کور چشمی سے نادم ہونے کی بجائے گھر پہنچتے ہی شیر ہو گیا اور بلوچوں کو نیست و نابود کرنے کے منصوبے سوچنے لگا۔

ابن بویہ کا دوسرا حملہ

۹۳۷ھ میں احمد بن بویہ نے مقابلے کے لئے بہت بڑا لشکر جمع کیا اور بڑے کر دفر سے بلوچوں کو صفحہ دہر سے مٹانے کے ارادے سے روانہ ہوا۔ مگر امیر علی بھی جھلائے ہوئے دشمن کی چالوں سے غافل نہیں تھا۔ اس نے حریف کو سرحد پر روکا اور اس تیزی و تندی سے اس پر حملہ کیا کہ اسے سنبھلنے نہ دیا۔ اس کے تمام لشکر کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا اور احمد بن بویہ ذلت آمیز شکست اٹھا کر اصفہان بھاگ گیا۔

ابن بویہ کا تیسرا حملہ

تیسری مرتبہ ابن بویہ نے بڑے ساز و سامان اور پوری قوت سے بلوچوں پر حملہ کیا۔ اس دفعہ ابن بویہ کا پلڑا بھاری رہا اور بلوچوں کو شکست ہوئی۔ مگر ان کی جنگی چالوں سے وہ اس قدر خائف تھا کہ جیرفت کی طرف پیشقدمی کرنے کی بجائے اس فتح کو غنیمت جان کر خوشی کے شادیانے بجاتا ہوا واپس روانہ ہوا۔ مگر امیر علی نے اسے گھر تک بخیریت نہ پہنچنے دیا۔ اس نے اپنے تیز رو پیادوں کی مدد سے جو کافی فاصلہ دوڑنے کی مہارت رکھتے تھے۔ احمد بن بویہ کی فوج پر شب خون مارا۔ اس رات بارش کی وجہ سے آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس لئے ہر طرف تہ بہ تہ اندھیرا چھا رہا تھا اور دوست دشمن میں تمیز نہیں ہو سکتی تھی۔ صرف اپنی اپنی زبانوں سے وہ اپنے پرائے کو پہچان سکتے تھے۔ اس لئے بلوچ حملہ آوروں نے ابن بویہ کی فوج کے غالب حصے کو تہہ تیغ کر کے مال غنیمت لوٹا اور واپس چلے آئے۔

عضدّ الدولہ کی یلغاریں

عضدّ الدولہ حسن بویہ کا بیٹا تھا۔اس نے ولی عہدی کے زمانے میں ۳۵۷ھ بمطابق ۹۶۸ء ابوعلی بن الیاس کو شکست دے کر کرمان کے شہر بروسیر پر قبضہ کر لیا تھا اور بلوچوں کو چاروں طرف گھیر گھار کر ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔انہوں نے ہر قسم کی صعوبتیں برداشت کیں لیکن عضدّ الدولہ کی اطاعت قبول نہ کی۔علی بن الیاس چونکہ عرب نژاد تھا اس لئے اس سے بلوچوں کو دلی عقیدت تھی۔جب کبھی وہ بویہ کیخلاف اعلان جنگ کرتا بلوچ من حیث القوم اس کے لشکر کی صف اوّل میں نظر آتے تھے۔

ابوسعید بلوچ

۳۵۹ھ بمطابق ۹۷۰ء عضد الدولہ نے قرقیر بن جستر کو بڑی بھاری فوج کے ساتھ سلیمان بن الیاس پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا۔ابوسعید بلوچ حاکم جیرفت کو اطلاع ہوئی تو وہ اپنی قوم کے رزم آراء بہادروں کو لے کر سلیمان کی مدد کو بڑھا۔جیرفت اور بم کے درمیان خونریز جنگ ہوئی۔جس میں سلیمان بن الیاس مارا گیا اور اس کی فوجیں تتر بتر ہوگئیں۔مگر ابوسعید میدان جنگ میں ڈٹا رہا۔مشکادھی بلوچوں کی پامردی اور غیر معمولی شجاعت کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

”قبیلہ منوجان اور دیگر کوچ اور بلوچ (قفص اور بلوچ) جو ابوسعید بلوچ کے زیر کمان جمع تھے۔انہوں نے عہد کیا کہ زندگی کے آخرین لمحات تک دشمن سے مقابلہ کریں گے“۔

(تاریخ ابن مشکادھی ترجمہ ڈی ایس مارگولیتھ)

عضد الدولہ کو ابوسعید کے اس عزم کا پتہ چلا تو عابد بن علی کے زیر کمان قرقیر کی مدد کے لئے مزید تازہ دم فوج روانہ کی۔دونوں فوجوں نے مختلف اطراف سے جیرفت کو نرغے میں لے لیا۔یہ خونیں جنگ ۱۰ صفر ۳۶۰ھ مطابق ۱۳ دسمبر ۹۷۰ء بروز بدھ جیرفت کے نواح میں لڑی گئی۔

بلوچ بڑی جوانمردی سے لڑے۔ مگر ایک کا دس سے مقابلہ تھا۔ پے بہ پے جنگوں نے انہیں کافی کمزور کر دیا تھا۔ طویل محاصروں نے ان کی رسد بھی ختم کر دی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ تازہ دم افواج قاہرہ کا مقابلہ نہ کر سکے اور پروانہ وار داد شجاعت دیتے ہوئے قوم اور ملک پر سے تصدق ہو گئے۔ اس جنگ میں ابو سعید بلوچی کے دو بیٹوں کے علاوہ پانچ ہزار بلوچی سپاہی شہید ہوئے۔ نیز اس کے بہت نامی گرامی امراء اور مصاحب بھی جن میں ابوالفوارس منوجانی اور ابواللیث جیسے بہادر سردار شامل تھے۔ دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔

عابد بن علی کو جب اس امر کا یقین ہو گیا کہ بلوچوں کے صف شکن سورماء جنگ میں کام آچکے ہیں اور ان کے ملک میں سوائے لاوارث بچوں اور بیوہ عورتوں کے کوئی نہیں رہا تو وہ بڑی رعونت سے آگے بڑھا اور بلوچوں کے گھروں کو پامال کرتا ان کے سامان کو لوٹتا عورتوں اور بچوں کو تلوار کے گھاٹ اتارتا ہرمز تک پہنچ گیا۔ اس کے بعد ''تیز'' سے مکران تک کا تمام علاقہ اس نے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ زاں بعد عابد بن علی قرب وجوار کے دوسرے بلوچ قبائل کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ خرمی اور خاشکی قبیلوں کے لوگ تھے۔ یہ نہ صرف خشکی بلکہ بحری راستوں پر بھی قابض تھے۔ عابد نے انہیں پے بہ پے کئی شکستیں دیں۔ بہت سے بلوچ ان جنگوں میں تہ تیغ ہوئے۔ ان کا بہادر سردار ابی علی بن خلیل بھی مردانہ وار لڑتا ہوا مارا گیا۔

یہ بویہ ملوک کے انتہائی عروج و اقبال کا زمانہ تھا۔ ان کی سطوت و جبروت اور ان کی فتح مندیوں کی تمام بلاد اسلامی علی الخصوص مشرقی ممالک اسلام میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ ان کے نام کے سکے مسکوک ہوتے تھے۔ ان کا نام خطبات میں لیا جاتا تھا۔ ان کے دروازوں پر دن میں تین بار نوبت بجتی تھی۔ خلیفہ بغداد ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ عراق، فارس اور بخارا کے سیر حاصل صوبے ان کے قبضے میں تھے۔ اس وقت ان سب کی طاقت بلوچوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے پر صرف ہو رہی تھی۔

آخری معرکہ

۳۶۱ھ میں عضد الدولہ نے فوج کو از سرِ نو منظم کیا اور گھٹا اور برق و باد کی طرح کرمان کی طرف بڑھا۔ ان دنوں علی بن باریزی بلوچوں کا سردار تھا۔ اس نے جب حرب و ضرب کا اتنا بڑا سیلاب اپنی طرف شدت سے بڑھتے دیکھا تو اس نے بلوچوں کو میدان میں لڑنے کی بجائے اپنے محفوظ ٹھکانوں میں چلے جانے کا حکم دیا اور اپنے علاقہ کی ہر طرف سے مضبوط ناکہ بندی کرادی۔

عضد الدولہ سرجان پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ بلوچ مختلف اضلاع میں پھیل گئے ہیں اور سرکاری قافلوں کو اس علاقے سے گزرنے میں خاصی دشواریاں پیش آرہی ہیں۔ اس نے دیلمی، گیلانی، ترک، عرب، کرد، جاٹ اور سیف الدولہ کے پرانے سپاہیوں پر مشتمل ایک بڑی فوج عابد کو دے کر بلوچوں کے ٹھکانوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ عابد نے جاتے ہی باریزی پہاڑیوں پر حملہ کر دیا۔ تمام ناکے بند کر دیئے اور پانی کے تمام چشموں اور چراگاہوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ ۱۱ ربیع الاوّل ۳۶۱ھ مطابق ۸ جنوری ۹۷۱ء بروز پیر طلوعِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک بلوچوں نے انتہائی بے جگری اور پامردی سے عابد کی بے پناہ فوج کا مقابلہ کیا اور شام کو جب جنگ ختم ہوئی تو تمام شمشیر زن بلوچ شہادت کی خلعت پہن کر اپنے خالق و مالک کے حضور پہنچ چکے تھے۔ ان کا سردار جو ابن ابی الرجل البلوصی کے نام سے مشہور تھا۔ دادِ مردانگی دیتا ہوا زندہ گرفتار ہوا اور اپنے رفیقوں کے ہمراہ قتل کر دیا گیا۔ اب عابد نے دوبارہ خاشکی اور اس قسم کے دوسرے حریت پسند قبائل کو مرکزِ توجہ بنایا۔ یہ لوگ قبائل قفص کی پہاڑیوں (موجودہ بشکرد کا علاقہ) کے اس پار تیز، مکران اور اومان کے ساحلی علاقوں میں آباد تھے۔ عابد نے اپنے بھائی کے زیر کمان "سیراف" سے ترکی، دیلمی وغیرہ سپاہیوں پر مشتمل فوج سمندری اور خشکی کے راستوں سے روانہ کی اور کچھ خشکی کے راستے سے پہنچیں لیکن بلوچوں کے مسکن اتنے محفوظ مقامات میں تھے کہ ان پر حملہ کرنا آسان کام نہیں تھا۔ ان کے ہاں جانے کا صرف ایک راستہ تھا اور وہ نہایت

دشوار گزار درے سے گزرتا تھا۔اس درے کی ہیئت کچھ اس قسم کی تھی کہ اس میں چند نفوس بہت بڑے لشکر کا آسانی سے مقابلہ کر سکتے تھے۔عضد الدولہ جیسے زبردست تاجدار نے اس موقعہ پر بلوچوں کو ختم کرنے کیلئے ایسا بزدلانہ طریقہ اختیار کیا جس پر ندامت کے سبب انسانیت کا سر جھک جاتا ہے اور مؤرخین اس واقعے کو انتہائی حقارت سے بیان کرتے ہیں۔اس کمینے حربے سے عضد الدولہ نے اگرچہ تھوڑے سے عرصہ کے لئے اپنے لئے فتح و مسرت کا سامان پیدا کر لیا لیکن تاریخ کے اوراق میں اس کا نام ہمیشہ ضحاک اور نمرود جیسے ظالموں کی فہرست میں لکھا جائے گا۔

مشکادھی لکھتا ہے کہ عضد الدولہ نے بلوچوں کو پیغام بھیجا کہ جب تک خراج وصول نہیں ہوگا وہ ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔بلوچوں نے نہایت عاجزی اور مسکینی سے جواب دیا کہ مسلسل جنگوں نے ان کا کچومر نکال دیا ہے۔ریوڑ پہلے سے آپ نے غصب کر لئے ہیں اجناس کے انبار آپ کا لشکر اٹھا کر لے گیا ہے۔ہمارے بال بچے فاقے کر رہے ہیں۔آپ کا خراج کہاں سے ادا کریں۔ہاں اگر آپ کچھ مہلت عنایت کریں تو ہم خراج ادا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں ہونے دیں گے۔

عضد الدولہ نے دوبارہ پیغام بھیجا کہ اگر تمہارے پاس اور کچھ نہیں تو ہر گھر سے ایک کتا ہی دلا دو۔بلوچوں نے اسے بالک ہٹ، تریا ہٹ کی طرح راج ہٹ سے تعبیر کیا اور کتے دینے پر آمادہ ہو گئے۔عضد الدولہ نے اپنا آدمی بھیجا جس نے خیموں کا شمار کیا اور ہر خیمے سے ایک ایک کتا وصول کر لیا۔

کتوں کا خاصا ہے کہ وہ کسی بھی حالت میں اپنے مالک کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔انہیں کتنا دور کیوں نہ چھوڑا جائے جب بھی انہیں موقعہ ملتا ہے وہ سیدھے مالک کے پاس جا پہنچتے ہیں کتوں کی اس سرشت سے عضد الدولہ واقف تھا۔اس نے تمام کتوں کو جمع کرنے کے بعد حکم دیا کہ

ان کی گردنوں میں پٹوں کے ساتھ آتشگیر مادہ باندھ دیا جائے حکم کی تعمیل ہوئی۔ تمام کتے درے کے پاس لائے گئے۔ آتش گیر مادے کو آگ لگادی گئی اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد یکے بعد دیگرے کتوں کو اس طرح چھوڑا گیا کہ وہ درہ پار کر کے سیدھے مالکوں کے گھروں میں پہنچنے لگے۔ جب کتے درہ پار کر رہے تھے رات کا وقت تھا۔ آتشگیر مادے کے جلنے سے عجیب خوفناک منظر پیدا ہو گیا تھا۔ بلوچوں نے سمجھا کہ شاید دشمن کی فوج ان پر حملہ کرنے کے لئے درہ پار کر رہی ہے۔ وہ بھی مقابلے کے لئے درے کی طرف دوڑے۔ کتوں نے جونہی مالکوں کو آتے دیکھا تو وہ آتشگیر مادے سے نجات پانے کے لئے اپنے مالکوں سے لپٹ گئے اور اپنی گردنوں کو مالکوں کے کپڑوں سے رگڑنے لگے نتیجہ کے طور پر مالکوں کے کپڑوں کو بھی آگ لگ گئی اور جب وہ کتوں سے پیچھا چھڑا کر خیموں اور مکانوں کی طرف بڑھے تو کتے بھی دوڑ کر خیموں میں گھس گئے اور اپنی گردنوں کو خیموں اور قناتوں سے رگڑنے لگے جس سے خیمے جل اٹھے اور دیکھتے ہی دیکھتے بلوچوں کا تمام مال و اسباب جل کر راکھ ہو گیا۔ بہت سے لوگ آگ کی لپیٹ میں آکر چل بسے اور باقیوں کو عضدالدولہ کی فوج نے دھر لیا۔ اس سراسیمگی کے عالم میں بھی بلوچ بہادرانہ وار آگے بڑھے اور شجاعت و بسالت کے جوہر دکھا کر بلوچی حمیت پر سے تصدق ہو گئے اور یہ وادی بلوچوں کے وجود سے خالی ہو گئی۔

تاسحر تو نے نہ چھوڑی اے بادِ صبا!
یادگار رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

عضدالدولہ کی اس شرمناک حرکت پر مشکادھی کا تبصرہ

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ مشکادھی صرف مؤرخ ہی نہیں تھا بلکہ کافی عرصہ تک وہ بویہ خاندان کے فرمانرواؤں کا وزیر بھی رہ چکا تھا اور حاکم وقت کے دربار کا وزیر خاص ہونے کے باعث

اسے اس دور کے صحیح حالات معلوم کرنے کے تمام ذرائع میسر تھے۔ وہ عضدالدولہ کی وحشیانہ حرکت کو دیکھتے ہوئے انتہائی نفرت سے اپنی رائے کا اظہار اس طرح سے کرتا ہے:۔

"انتقام کے یہ طریقے اس قسم کے ہیں جنہیں ہر خدا ترس انسان اور طاقت ور حکمران حقارت کی نظر سے دیکھے گا اور خدا سے خوف کھانے والا اور مذہب پر ایمان رکھنے والا شخص ان حرکات کو نہایت عظیم جرم قرار دے گا اور طاقت ور حاکم اسے کمزوری اور کم ہمتی پر محمول کرے گا۔ ایسے مکروہ حربے بے گناہوں کو سزا دینے کے مترادف ہیں!"

مؤرخین کی غلط بیانیاں

بویہ حکمرانوں کے زمانے میں بلوچوں پر جو ظلم وتشدد ہوا اس کی ایک ہلکی سی جھلک ناظرین کرام ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ انہیں ختم کرنے کے کئی منصوبے سوچے گئے۔ ان کی ناکہ بندی کی گئی ان کے علاقے میں میٹھے پانی کے جو چشمے جاری تھے۔ ان پر پہرے بٹھا دیئے گئے۔ بعض کے رخ تبدیل کر دیئے گئے۔ اگر دشوار مقامات میں یہ نہ ہو سکا تو ان میں زہر ڈال دیا گیا۔ بلوچوں کے خوردنی اجناس کے انبار جہاں کہیں تھے لوٹ لئے گئے اور جنہیں نہ لوٹ سکے انہیں جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔ بلوچوں کے ریوڑوں کو اپنے قبضے میں لے لیا گیا اور ایسی صورتحال پیدا کر دی گئی کہ بلوچوں کے پاس نہ کھانے کو کچھ تھا اور نہ پینے کو۔ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے غاروں میں پڑے سسک رہے تھے۔ ان کے مرد دن میں چھپے رہتے اور رات کو غاروں سے نکلتے مگر سوائے درختوں کے پتوں کے انہیں کھانے کو کچھ نہ ملتا۔ اس پر ہر وقت دشمنوں کی خون آشام تلواروں سے واسطہ پڑتا تھا۔ دشمن کے جاسوس جگہ جگہ بلوچوں کی ٹوہ لگاتے پھرتے تھے کرمان کا تمام علاقہ قفص کی سالم وادی کربلا بنی ہوئی تھی۔ بلوچوں کی قتل گاہ تھی۔ جہاں بویہ حکومت کے کتے انہیں سونگھتے پھرتے تھے۔ جو علاقہ میدان جنگ بنا ہوا ہو جہاں کے باشندے

پانی کی ایک ایک بوند کو اور جن کے معصوم بچے کھجور کے چھلکوں کو ترس رہے ہوں۔ اگر ایسے عالم میں دشمن کا کوئی قافلہ گزرے اور منت سماجت کے باوجود ان گرفتار مصائب کو پینے کے لئے پانی اور کھانے کو کھجور کا چھلکا تک نہ ملے تو ان بھوکے پیاسے محصورین کے لئے سوائے اس کے اور چارہ ہی کیا رہ جاتا ہے کہ ایسے ظالموں سے بالجبر پانی کے وہ مشکیزے اور کھجوروں کے تھیلے چھین لیں اور اگر کوئی جاسوس جاسوسی کرتا پکڑا جائے تو عبرتناک سزا کے سوا اور کیا سلوک کیا جاسکتا ہے۔ آج کل کے تہذیبی دور میں جاسوسوں سے کیا سلوک ہوتا ہے اور جنگ کے مہیب شعلوں کی لپیٹ میں آئے ہوئے بے بس انسان دشمن کے قافلوں اور کاروانوں سے کیا برتاؤ کرتے ہیں۔ یہی صورتحال اس دور میں جبال قفص اور کرمان کے بلوچوں کی تھی۔ جاسوسوں کو وہ مار ڈالتے تھے اور اگر کوئی قافلہ ان کے علاقے سے گزرتا تو اپنے قبائل کے ہزاروں نیم جان بوڑھوں بچوں کی جانیں بچانے کے لئے ان کی خوردنی اجناس اور پانی کے مشکیزوں کو اپنے قبضے میں لینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

اس زمانے میں جو سیاح اور مؤرخ اس طرف سے گزرے انہوں نے شاہی کاروانوں اور قافلوں کے ساتھ سفر کیا اور جہاں بلوچوں کے ہاتھ لگے انہوں نے اپنی اور اپنے کنبے کی جانیں بچانے کیلئے ان کا زاد راہ چھین لیا۔ اگر کوئی شخص جاسوسی کرتا ہوا پکڑا گیا تو اسے بھی ختم کر دیا گیا۔ مگر افسوس ہے ان مؤرخین کی دیانت پر اور تف ہے ان کی قلمی عصمت پر، کہ انہوں نے ہنگامی حالات کو امن کے ایام پر محمول کرلیا اور پوری قوم کو بدنام کرنے کی مذموم کوشش کی اور بلوچوں کی ان روایتی مہمان نوازیوں کو بھول گئے جن کی روشن مثالیں آج بھی بلوچستان کے چپہ چپہ پر دیکھی جاسکتی ہیں۔

ابن ہوقل، علامہ بشاری اور مقدسی کے مشاہدات

کرمان اور بلوچستان کی وادیوں کو جن سیاحوں نے اچھی طرح کھنگالا ہے ان میں ابن ہوقل المقدسی، علامہ بشاری اور ناصر خسرو خاص مقام رکھتے ہیں۔اول الذکر کا زمانہ سیاحت ۹۵۷ء تا ۹۷۶ء ہے یہ وہ دور ہے جس میں بو یہ حکمران نے بلوچوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔

ابن ہوقل صوبہ کرمان کا حدود اربعہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس کے مشرق میں مکران اور اس کا ملحقہ علاقہ ہے جو تمام ریگستان ہے اور بحرین یعنی سمندروں تک بلوچوں کی سرحد سمجھی جاتی ہے کرمان کے مغرب میں فارس ہے اور شمال میں خراسان اور سجستان ہے۔جنوب میں بحر فارس (خلیج العرب) ہے اور اس کے علاوہ سیراگان اور فارس کا کچھ علاقہ ہے۔

ابن ہوقل کرمان کے تمام شہروں کا ذکر کرنے کے بعد اس علاقے کے پہاڑی سلسلوں کی کیفیت بیان کرتا ہے۔لکھتا ہے کہ قفص کا پہاڑ جنوب میں ساحل سمندر کے نزدیک ہے۔شمال میں جیرفت کی سرحد کے پاس رودان اور کوہستان کا علاقہ ہے جو ابو غنم کے نام سے بھی مشہور ہے۔یہ مشرق میں خواص، قفص اور مکران تک پھیلا ہوا ہے یہ تمام علاقہ محض ریگستان ہے۔ جنوب میں بلوچوں اور سیرجان کی سرحد واقع ہے۔ ہر پہاڑ کا ایک علیحدہ سردار ہے جو حاکم وقت سے ایک مقررہ رقم پاتا ہے۔اس کے باوجود یہ لوگ کرمان کی سڑکوں پر لوٹ مار کرتے رہتے ہیں اور دل کھول کر ڈاکے ڈالتے ہیں۔لوٹ مار کا یہ سلسلہ فارس اور سجستان تک پھیلا ہوا ہے عموماً یہ لوگ پیدل قافلوں کو لوٹ لیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ عربی النسل ہیں اور لوٹ مار کے ذریعے سے انہوں نے بے پناہ دولت جمع کر لی ہے۔

آگے چل کر پھر لکھتا ہے:۔

”بلوچ قفص کے پہاڑوں میں رہتے ہیں۔جنہیں فارسی زبان میں کوچ یا کوج کہا جاتا

ہے۔ بلوچ سڑکوں پر ڈاکہ زنی کرتے ہیں اور کسی حکمران کی مطلق پرواہ نہیں کرتے''۔

مولانا عبدالحکیم صاحب شرر تاریخ سندھ جلد دوئم کے صفحہ ۱۲۱ پر تحریر فرماتے ہیں کہ

''قفص سے افغان مراد ہیں اور بلوص سے بلوچ...''

''علامہ بشاری اپنی کتاب احسن التقاسیم فی معرفتہ الاقالیم میں لکھتے ہیں کہ:۔

''ہندوستان جانے کے سب راستے قفص (افغان) نام ایک قوم کی وجہ سے مخدوش ہیں جو کوہستان مکران سے نکل کر سب اطراف کو جاتے ہیں۔ ان لوگوں میں ذرہ بھر بھی نیکی نہیں۔ چہروں سے وحشت برستی ہے دل سخت ہیں اور اس کے ساتھ ان میں شجاعت ہے اور انسان ان سے مرعوب ہوجاتا ہے۔ کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑتے۔ جوان کے ہاتھ میں پھنس گیا اس کے مال ہی پر قناعت نہیں کرتے بلکہ خوامخواہ مار بھی ڈالتے ہیں اور قتل بھی اس بے رحمی سے کرتے ہیں کہ پتھروں سے آدمی کا سر کچل دیتے ہیں۔ جیسے سانپ کا سر کچلا جاتا ہے۔ ان کے قتل کرنے کی یہ وضع ہوتی ہے کہ انسان کا سر پکڑ کر کسی چٹان پر رکھا اور دوسری سلوں سے کچل ڈالا۔ میں نے اس قوم کے ایک شخص سے پوچھا کہ میاں تم تلوار سے کیوں قتل نہیں کرتے تو اس نے جواب دیا کہ کون اپنی تلوار کو خراب کرے۔''

''یہ لوگ پہاڑوں اور گھاٹیوں میں رہتے ہیں اور دشمنوں کو اپنے تک نہیں پہنچنے دیتے''

علامہ بشاری کی یہ نوازش قفص قوم پر ہے۔ جسے مولانا شرر ''افغان'' قوم سے تعبیر کرتے ہیں۔ علامہ بشاری کی آخری سطور سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قفص یا افغان قوم کا یہ سلوک اپنے دشمنوں سے تھا اور وہ ڈاکے بھی اپنے دشمنوں پر ڈالتے تھے۔

المغازہ

مکران اور کرمان کے درمیان آٹھ سو میل لمبا اور سو دو سو میل چوڑا وسیع اور عریض ریگستان

واقع ہے۔ جو شکل کے اعتبار سے شیشے کے اس گلاس سے کافی مناسبت رکھتا ہے۔ جس کی گردن بہت تنگ ہو اسے المغازہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وسطی زمانے میں جغرافیہ دانوں نے اس کی حدود اربعہ کا ذکر بڑی احتیاط سے کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مغرب اور جنوب مغرب کی سمت یہ ریگستان صوبہ جبال سے ملتا ہے جو یزدکا ایک حصہ ہے۔ اسی طرح جنوب مغرب میں یہ ریگستان کرمان سے بھی جا ملتا ہے۔ جنوب میں مکران کے ساحلی پہاڑوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے مشرق اور شمال مشرق میں خراسان، کرمان اور سجستان واقع ہیں۔ ابن ہوقل اسے یاغستان کا نام دیتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ یہ ریگستان کسی خاص صوبے کا حصہ نہیں تھا۔ اس میں صرف تین گاؤں آباد تھے۔ ان کے علاوہ اس دشت بیدار میں اور کوئی آبادی نہ تھی۔

مقدؔسی لکھتا ہے۔

''یہ ریگستان سمندر کی طرح وسیع ہے اور جس سمت سے چاہیں اسے عبور کر سکتے ہیں۔ اگر مجوزہ راستے سے سفر کریں تو آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو گی کیونکہ ہر پڑاؤ پر پانی کے تالابوں اور بندوں کا خاص انتظام ہے اور ان کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کی جاتی ہے''۔

المقدؔسی نے خود اس ریگستان کو طے کیا ہے اور کم و بیش ستر دن وہ اس صحرائے بسیط میں سرگردان رہا ہے۔ وہ بہت سے ڈھلوانوں سے گزرنے والے دروں اور شدید سردی کا ذکر بھی کرتا ہے۔ اس زمانے میں پورے ریگستان پر بلوچوں کا قبضہ تھا۔ وہ ڈاکہ زنی میں طاق تھے اور مسافروں کو لوٹ لیتے تھے۔ اس کے مطابق یہ بلوچ قفص کے پہاڑوں میں رہتے تھے جو کرمان میں پھیلا ہوا تھا۔

المقدؔسی کی یہ رپورٹ بھی اس ہنگامی دور کی نشاندہی کرتی ہے جب عضدالدولہ کی فوجیں درندوں کی طرح بلوچوں کو لوٹ کھسوٹ رہی تھیں۔ ان کے ذخائر کو نذر آتش کر دیتی تھیں۔ ان

کے چشموں اور تالابوں میں زہر ڈال دیتی تھیں۔ ایسے حالات میں جبکہ لاکھوں کی تعداد میں غاروں اور وادیوں میں چھپے ہوئے بلوچ پانی کی ایک ایک بوند کو ترس رہے تھے جبکہ ان کے پاس کھانے کو کھجوریں تک نہ تھیں۔ اگر مل جاتیں تو اس خطرے کے پیش نظر کہ کہیں ان میں بھی زہر نہ جذب کی گئی ہو ہاتھ نہیں لگاتے تھے وہ صرف اسی غذا کو ہی قبول کر سکتے تھے جو کسی زمانے میں اپنے لئے جمع کر رکھی ہو اور یہ قافلے والوں کا ہی مال ہو سکتا تھا اور جب انہیں بے ضرر خوراک نہ ملتی تو وہ درختوں کے پتوں اور پھلوں پر ہی گزارہ کر لیتے تھے۔ المقدسی کا یہ فقرہ بلوچوں کی بے بسی، بے چارگی اور بے مائیگی کا کتنا بڑا ثبوت ہے کہ:

"ان کی اپنی غذا نلک (Nalik) یا سڈُور (Sidor) درخت کا پھل ہوتی تھی۔ یہ لوگ بھوک اور پیاس کی برداشت میں ضرب المثل تھے"۔

حالانکہ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے احمد بن بویہ کو شکست دینے کے بعد اس کی نیم جان لاش کو ڈھونڈ کر تیمارداری کی اور اس کے بے شمار رفیقوں کی بھی مرہم پٹی کی اور خلاع فاخرہ دے کر بڑے احترام سے رخصت کیا لیکن جب چاروں طرف سے ان کی ناکہ بندی کر دی گئی تو پھر قوت لایموت کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے کے سوا ان کے لئے اور چارہ کار ہی کیا تھا۔ اسے "لوٹ مار" کا نام دینا ان بے بس لوگوں سے زیادتی ہے۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ جن دنوں ابن ہوقل جبال قفص سے گزر رہا تھا اس زمانے میں بویہ حکمران بری طرح سے بلوچوں کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ آئے دن بویہ افواج جیرفت پر چڑھ دوڑتی تھیں اور کشت وخون کا بازار گرم ہو جاتا تھا۔ دشمن بلوچوں کو صفحہ دہر سے مٹانے کے لئے انتہائی شرمناک چالیں چل رہا تھا۔ کہیں کتوں کی گردنوں میں آتشگیر مادے باندھ کر بلوچوں کے خیموں کی طرف دھکیل دیا جاتا تھا اور کہیں سیبوں میں زہر جذب کر کے قافلے کی صورت میں یہ سامان بلوچی آبادیوں کی طرف منتقل کر دیا جاتا تھا۔ ایسے حالات میں بلوچوں کا مسافروں کی آمدورفت پر کڑی نظر رکھنا ضروری تھا۔

وہ مسافروں کے لئے پروانہ راہداری (پاسپورٹ) جاری کرتے تھے لیکن جو یہ پروانہ حاصل کئے بغیر ان کے ملک میں گھس آتا اسے گرفتار کر لیتے اور اگر اس پر جاسوسی کا شبہ ہوتا تو قتل بھی کر دیتے تھے۔ اسی طرح اگر بلوچ اپنی حدود سے باہر جاتا تو اسے بویہ حکومت گرفتار کر کے قتل کر دیتی تھی۔ ابن ہوقل سرکاری ملازمین اور سرکاری قافلوں کے ہمراہ سفر کرتا رہا ہے اور بلوچ اس حکومت کے جانی دشمن تھے۔ اس لئے بلوچوں نے جہاں حکومت کے کارندوں کو لوٹا کھسوٹا، ممکن ہے کہ وہاں ابن ہوقل کو بھی کچھ خراشیں پہنچی ہوں۔ یہ ابن ہوقل کی اپنی غلطی ہے کہ اس نے یہ صورت کیوں اختیار کی۔ اس میں بلوچوں کا کیا قصور ہے۔ دوست کا دوست، دوست اور دشمن کا دوست، دشمن آج کل پاسپورٹ کے بغیر کوئی کسی ملک میں جا سکتا ہے؟۔ اگر کوئی ایسی حماقت کرے تو کیا اس ملک کی حکومت اسے گرفتار کر کے جیل میں نہیں ڈال دیتی اور اس کے سامان کو ضبط نہیں کر لیتی! بالخصوص ایسے علاقوں میں، جو جنگ کی لپیٹ میں آ چکے ہوں۔ ناگا اور میزو قبائل کے علاقوں کو ہی دیکھ لیجئے۔ کیا اُردن میں کوئی اسرائیلی آ سکتا ہے؟ آزاد کشمیر میں کسی بھارتی کو گھسنے کی اجازت ہے؟ اگر نہیں تو پھر شریف بلوچوں کو اس جرم میں ہدف ملامت بنانا کہاں مناسب ہے!۔

آپ ہی ذرا اپنے طرز عمل کو دیکھیں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

ایک اور کجکلاہ کی یلغار

۳۶۱ھ میں بلوچوں کے گھروں کو نذر آتش کیا گیا۔ انہیں اپنی طرف سے عضد الدولہ نے ختم ہی کر دیا تھا اور ۳۷۲ھ میں خود بھی کیفر کردار کو پہنچ گیا۔ اس کے جانشین یا تو کمزور تھے یا اتنے سفاک نہیں تھے۔ بہر حال بلوچوں کو دوبارہ پنپنے کا موقع مل گیا اور پچاس برس کے مختصر عرصہ میں انہوں نے اتنی قوت پیدا کر لی کہ سلطان محمود غزنوی سا صف شکن سلطان ان کو اپنے لئے خطرہ

محسوس کرنے لگا۔ سلطان کا شمار دنیا کے مشہور فاتحین میں ہوتا ہے۔ اس نے متھرا، قنوج اور سوم ناتھ کے قلعوں کو زور بازو سے فتح کیا۔ مگر کرمان کے بلوچوں کو بزور شمشیر فتح نہ کرسکا۔ انہیں عضدالدولہ کی طرح حکمت عملی سے ختم کیا گیا جو ایک بہادر جرنیل کیلئے کوئی قابل فخر کارنامہ نہیں!

بلوچ اپنی ریاست کے مالک ومختار تھے۔ وہ گوارا کرنے کیلئے تیار نہیں تھے کہ کوئی حاکم ان کے ملک سے ان کی حاکمیت کو تسلیم کئے بغیر درانہ وار گزر جائے۔ ان کی سرحدی چوکیوں پر ایسے افسر مقرر تھے جو قافلوں کو ریاست سے گزرنے کے اجازت نامے دیتے تھے۔ ایسے قافلوں کی پوری حفاظت کی جاتی تھی اور وہ بخیر وخوبی ریاست سے پار گزار دیئے جاتے تھے۔ مگر جو قافلے سامراجی حکام کے بل بوتے پر گزرنے کی کوشش کرتے۔ ان سے بلوچ نبرد آزما ہوتے اور ان کا سامان چھین لیتے تھے۔ بلوچوں کے پہلو بہ پہلو ایک اور قوم کوچ بھی آباد تھی۔ جنہیں مولانا عبدالحلیم شرر مغل بتاتے ہیں لیکن عام مؤرخین کا تاثر یہ ہے کہ یہ لوگ بنو فاطمی سادات اور بنو عباس اور بنو امیہ کے وہ خاندان ہیں کہ جب حکومتیں انہیں صفحۂ دہر سے مٹانے پر تل گئیں تو وہ جانیں بچانے کیلئے ان پہاڑوں میں آچھپے۔ بلوچوں نے انہیں پناہ دی اور انہیں اپنے اندر جذب کرلیا۔ یہ صرف بنوامیہ اور بنوعباس پر ہی منحصر نہیں۔

جب ہم تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جن خاندانوں سے حکومت کوئی انتقام لیتی ہے تو وہ صفحۂ دہر سے حرف غلط کی طرح ناپید ہوجاتے ہیں۔ مہلب، قتیبہ، ابن اشعث، موسیٰ بن نصیر اور ان جیسے سینکڑوں سپہ سالاران اسلام کی اولاد کیا ہوئی؟ کیا وہ سب قتل ہوگئے یا انہیں زمین نگل گئی؟ اس کا صرف ایک ہی جواب ہے کہ وہ گمنامی کے عالم میں انہیں قبائل میں جذب ہوگئے جو جبال قفص اور ان جیسی دوسری پہاڑیوں میں رہتے تھے۔ عین ممکن ہے کہ انہوں نے کوچ، کوفج یا قفص کا نام اپنا لیا ہو۔ یا دوسرے لوگوں نے انہیں اس نام سے موسوم کیا ہو۔ بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس وادی میں بڑے بہادر لوگ رہتے تھے اور وہ بڑے خود

دار تھے۔ بلوچ اور کوچ دونوں ایک دوسرے کے حلیف تھے اور صدیوں سے ان کے مابین بھائی چارہ چلا آتا تھا۔

رباط دیر کچین

رباط دیر کچین ایک زبردست پڑاؤ تھا اور کوچ و بلوچ دونوں کی سرحدوں پر واقع تھا۔ایک دفعہ سلطان کا شاہی لشکر کوچ بلوچ کی ریاست سے گزرا۔اس میں دس ہزار فوجی تھے۔ سرکاری سامان اور متعدد تاجر لوگ اپنے مال و اسباب سمیت لاقانونی طور پر بلوچوں کی ریاست کو پار کرنا چاہتے تھے۔سرحدی افسر رابطہ نے انہیں اجازت نامہ لینے کے لئے کہا۔مگر انہوں نے قطعاً پرواہ نہ کی اور ان کی ریاست میں داخل ہو گئے۔ بلوچ اور کوچ سرداروں کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے اسے اپنی اہانت تصور کیا۔ چنانچہ جب یہ لشکر ''رباط دیر کچین'' میں اترا تو بلوچ اور کوچ نے متفقہ طور پر اس لشکر پر حملہ کر دیا۔شاہی لشکر کو اپنے اسلحہ اور اپنی کثرت پر ناز تھا مگر کوہستانی عقابوں کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔ ہزاروں مارے گئے اور ہزاروں بھاگ گئے۔ بلوچوں نے ان کا مال و اسباب اپنے قبضے میں لے لیا۔اس قافلے میں ایک بڑھیا کا جوان لڑکا بھی تھا جو تجارت کا مال لے کر عراق کو جا رہا تھا۔جب اس کے مارے جانے کی اطلاع بوڑھی ماں کو ملی تو وہ کالے کوسوں کا سفر کر کے غزنی پہنچی اور برسر دربار سلطان سے کہا۔

''اے سلطان! تیری بادشاہی میں بلوچوں نے میرا بیٹا مار ڈالا ہے اور مال لوٹ لیا ہے۔میرا انصاف کر!''

سلطان نے جواب دیا:

''بی بی! بلوچوں کے حملے کا حال میں سن چکا ہوں مگر میں یہ نہیں جانتا کہ ''رباط دیر کچین'' کہاں ہے؟''

بڑھیا بولی:۔

''اے سلطان! تو اس قدر ملک فتح کر۔جس کے جغرافیہ سے واقف ہو سکے اور اس کا انتظام کر سکے!''

سلطان نے جواب دیا:

''لیکن کرمان تو میرے ملک سے باہر اور بہت دور ہے۔اس کی ذمہ داری مجھ پر کیونکر آسکتی ہے؟''

یہ سن کر بڑھیا رونے لگی کہ:۔

''ہائے افسوس! اسی برتے پر شاہی دعویٰ ہے۔وہ بادشاہ کیا جو اپنی سلطنت کا انتظام نہ کر سکے اور وہ چرواہا کیا جو بھیڑیئے سے بکریوں کو نہ بچا سکے۔پس میرا تنہا وضعیف ہونا اور تیرا فوج ولشکر رکھنا دونوں برابر ہیں!''

سلطان بڑھیا کی فریاد سن کر آبدیدہ ہو گیا اور اسے بہت کچھ انعام دے دلا کر رخصت کیا۔اسے یقین دلایا کہ وہ اس کے بیٹے کا ضرور بدلہ لے گا اور ان لوگوں کا انتظام کرے گا جنہوں نے لشکر پر حملہ کیا ہے۔سلطان سوچنے لگا کہ آخر ان سر پھرے لوگوں کا انتظام کیسے کیا جائے۔بہت سوچ بچار کے بعد اس نے یہی مناسب سمجھا کہ پہلے وہ حاکم کرمان کو متنبہ کرے۔اس کے بعد پھر کوئی قدم اٹھائے۔چنانچہ سلطان نے امیر کرمان بوعلی الیاس کو مندرجہ ذیل فرمان تحریر کیا:۔

فرمان شاہی

''مجھے عراق آنے کی خواہش نہیں تھی۔میں تو ہمیشہ سے ہندوستان کے جہاد میں مشغول تھا لیکن جب میرے پاس متواتر عرضیاں پہنچیں کہ دیالمہ نے عراق میں غدر مچا رکھا ہے اور مسلمانوں کے گھر لوٹے جا رہے ہیں اور ان پر طرح طرح کے مظالم ہو رہے ہیں اور سال میں دو تین مرتبہ

رعایا سے خراج وصول کیا جاتا ہے۔ مجدد الدولہ اپنے آپ کو شہنشاہ کہلانا چاہتا ہے۔ مذہب زنادقہ اور بواطنہ ہر شہر ونواح میں پھیل رہا ہے۔ صانع مطلق کا انکار ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ سب کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔ تو میں نے ہندوستان کے غزوات چھوڑ کر عراق کا قصد کیا۔ میری تلوار نے دیالم، زنادقہ، بواطنہ کی بیخ کنی کردی ہے۔ بے شمار قتل ہو چکے ہیں۔ اکثر بھاگ گئے۔ بعض گرفتار ہیں۔ خراسان کی حکومت ان لوگوں کے حوالے کردی ہے جو ان کے دشمن ہیں اور عراقیوں سے دفتر پاک کردیا گیا ہے۔

مجھے خدا نے صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ ملک کو مفسدوں سے پاک وصاف کر کے اچھے لوگوں سے دنیا کو آباد کروں اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ان دنوں بلوچ و کوچ نے ''رباط دیر کچین'' پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ تم ان کو گرفتار کرو۔ ڈکیتی کا مال برآمد کر کے قزاقوں کو پھانسی دے دو یا ان سب کو قید کر کے ہمارے حضور بمقام ''رے'' بھیج دو۔ تاکہ ان کے حوصلے آئندہ کے لئے پست ہو جائیں اور کرمان سے چل کر میرے ملک میں لوٹ مار نہ کریں۔ اگر تم نے میرے حکم کی تعمیل نہ کی تو یاد رکھو کہ کرمان بمقابلہ سومناتھ زیادہ قریب ہے''۔

امیر کرِمان کا جواب

ابو علی الیاس سلطان کا فرمان پڑھ کر خوفزدہ ہو گیا۔ قاصد کو بہت سا انعام دیا اور اپنی عرضی کے ہمراہ قسم قسم کے جواہرات اور سونے چاندی کی تھیلیاں ارسال کیں۔ عرضی کا مضمون یہ تھا:

''میں تو سلطان کا فرمانبردار غلام ہوں۔ مگر کرمان کی کیفیت اور میری حالت سلطان کو معلوم نہیں ہے۔ میری طرف سے لٹیروں کو کسی قسم کا ایماء نہیں ہے اور کرمان کی رعایا سنی المذہب ہے اور کوچ بلوچ کی پہاڑیاں کرمان سے علیحدہ ہیں اور اس کا راستہ بھی پہاڑوں اور دریاؤں کے سبب بہت دشوار گزار ہے۔ ان ڈاکوؤں سے میں بھی عاجز ہوں کیونکہ چور اور مفسد ہیں اور ان کی وجہ سے

چھ سو میل کا راستہ پر خطر ہے۔ وہ دن رات لوٹ مار کیا کرتے ہیں کیونکہ بڑا جتھہ ہے۔ میں مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا اور اس کی تدبیر سوائے سلطان کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ بہر حال میں فرمانبردار ہوں۔ جو حکم ہو گا اس کی تعمیل کروں گا''۔

سلطان نے بوعلی کا جواب پڑھ کر سمجھ لیا کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ سچ ہے اور قاصد کو خلعت دے کر رخصت کیا اور امیر سے کہلا بھیجا کہ تمام کرمان کی فوجیں لے کر ان کو جا بجا سرحد پر پھیلا دو اور فلاں مہینے کے خاتمہ پر کرمان کی سرحد پر پہنچ جاؤ اور جس طرف کوچ بلوچ ہوں اس جگہ قیام کرو۔ جس وقت ہمارا قاصد مع فلاں نشان کے تم سے ملے اسی وقت کوچ کر دینا اور عورتوں و بوڑھوں سے جس قدر مال مل سکے وہ سب فراہم کر کے بھیج دینا تا کہ ان کے مالکوں کو دے دیا جائے۔

غرضیکہ جب قاصد چلا گیا۔ سلطان نے منادی کرا دی کہ جو ''سوداگر یزد اور کرمان کو جانا چاہتے ہوں وہ سامان سفر کو درست کریں اور میں ان کے ہمراہ حفاظتی فوج روانہ کروں گا اور یہ بھی اقرار کرتا ہوں کہ جس کا مال کوچ بلوچ غارت کریں گے۔ اس کا تاوان شاہی خزانے سے دیا جائے گا'' منادی ہوتے ہی ''رے'' کے مقام پر بے شمار سوداگر جمع ہو گئے اور وقت معین پر قافلہ روانہ ہو گیا۔

سلطان نے میر کارواں کو طلب کر کے فوج کا ایک دستہ بطور بدرقہ عنایت کیا اور فرمایا کہ میں تمہارے پیچھے بہت بڑا لشکر روانہ کر رہا ہوں۔ کسی قسم کا فکر نہ کرو۔ اگر تم نے میری ہدایات پر عمل کیا تو ضرور کامیاب ہو گے۔ یہ لو زہر قاتل کی شیشیاں! جب تم اصفہان پہنچ جاؤ تو وہاں سے تخمیناً دس خروار اصفہانی سیب خرید لو۔ جب دیکھو کہ کوچ بلوچ کی سرحد نزدیک ہے اور ایک رات کا سفر باقی ہے تو کسی تیز آلے سے ان سیبوں میں زہر بھر دینا۔ پھر ان سیبوں کو خرجینوں میں اس طرح بند کرنا کہ وہ دور سے نظر آ سکیں۔ جب تم کوچ بلوچ میں داخل ہو جاؤ اور دیکھو کہ بلوچ حملہ کرنے آ رہے ہیں تو تم پیچھے بھاگ آنا اور ان اونٹوں کو جن پر سیب لدے ہوں گے آگے بڑھا دینا۔ فوج

کوچ بلوچ سے ڈیڑھ میل دور رہے گی۔ جب وہ سیب کھانے لگیں تو یہ ان پر ٹوٹ پڑے گی۔ اس طرح کچھ بلوچ سیب کھا کر مر جائیں گے۔ باقیوں کو فوج تباہ کر دے گی۔ یہ لو انگوٹھی! اسے حاکم کرمان کے پاس بھیج دینا وہ بھی فوج لے کر وہاں آ پہنچے گا۔ انشاء اللہ فتح ہماری ہوگی! یہ ہدایات دے کر سپاہ روانہ کر دی گئی۔ میر قافلہ نے کہا ''اے سلطان! میرا دل گواہی دیتا ہے کہ آپ کی حکمت عملی ضرور کامیاب ہوگی!''

جب قافلہ اصفہان پہنچا تو سلطان کی ہدایت کے مطابق سیب خریدے گئے اور ان میں زہر بھرا گیا۔ جب قافلہ یہاں سے کرمان پہنچا۔ ابھی ایک منزل باقی تھی کہ بلوچوں کو اطلاع ہو گئی۔ وہ متحد ہو گئے اگرچہ جانتے تھے کہ بیک وقت دو شاہی لشکروں سے مقابلہ ہے اور ساتھ ہی یہ کہ ان کے پاس اسلحہ بھی نہ تھا۔ بایں ہمہ وہ مقابلے کے لئے تیار ہو گئے کیونکہ میدان جنگ کو چھوڑنا بلوچی شان کے خلاف تھا۔ بلوچ بہادر ہتھیلی پر سر رکھ کر دشمن کا انتظار کر رہے تھے۔ ادھر میر کارواں نے شتر بانوں کو ہدایات دینا شروع کیں کہ جب بلوچ تمہارے اونٹوں پر لپکیں تو تم اونٹ چھوڑ کر پیچھے بھاگ آنا اتنے میں فوج حملہ کر دے گی۔ پھر میر کارواں نے حاکم کرمان کو سلطان کی انگوٹھی بھجوائی۔ وہاں سے بھی فوج آ گئی اور کوچ بلوچ کا شدت سے محاصرہ کر لیا گیا۔ بلوچوں کے چشموں، چراگاہوں اور نخلستانوں پر ہر جگہ فوجی پہرے بٹھا دیئے گئے۔ انسان اور حیوان سب بھوک سے مرنے لگے چونکہ چوروں کی طرح رات کو لڑنا مردانگی کے خلاف تھا اس لئے بلوچ دن چڑھے پہاڑوں اور غاروں سے برآمد ہوئے اور سلطانی لشکر پر عقاب کی طرح جھپٹ پڑے طے شدہ پالیسی کے تحت فوجی دستے نے پیچھے ہٹنا شروع کیا اور سیبوں سے لدے ہوئے اونٹوں کو آگے کر دیا۔ بلوچ سرداروں نے جب دیکھا کہ سب سیب اور ہی سیب ہیں دوسرا مال تجارت ان میں شامل نہیں۔ انہیں شبہ گزرا اور انہوں نے منع کیا کہ جب تک اطمینان نہ ہو جائے کوئی ان سیبوں کو نہ کھائے۔ مگر چند دنوں سے نوجوان فاقے پر فاقہ کر رہے

تھے۔ کئی رکے اور کئی بے تحاشہ ان سیبوں پر ٹوٹ پڑے اتنے میں امیر کرمان بوعلی الیاس لشکر جرار کے ساتھ آن پڑا۔ عقب سے غزنوی فوجوں نے انہیں تلواروں اور سنگینوں پر دھر لیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہزاروں جانباز کٹ کر ملک اور قوم کی آزادی پر سے تصدق ہو گئے اور کئی سیبوں کے زہر سے عالم فنا سے عالم بقا کو رخصت ہوئے۔

مولانا عبدالرزاق مصنف البرامکہ لکھتے ہیں کہ اس بزدلانہ حملے سے افواج شاہی نے تقریباً دس ہزار بلوچوں کو قتل کر ڈالا۔ رزم آزماء مردوں کے ختم ہونے پر فوجی اس ریاست میں پھیل گئے اور بلوچوں کا جو مال واسباب ہاتھ آیا اکٹھا کر کے غزنی لے گئے۔

ہر کہ پدر نتواں کرد پسر تواں کرد

اسی طرح کا ایک واقعہ نورالدین عوفی نے اپنی کتاب مجموعۃ التواریخ میں بھی درج کیا ہے۔ وہ اس واقعہ کو گیارھویں صدی کے ربع اوّل سے منسوب کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ:

''خواص کے ریگستان کوچ اور بلوچ کی سرزمین ہے۔ انہوں نے سلطان محمود غزنوی کے سفیروں کو لوٹا اور ہلاک کر دیا تھا۔ یہ لوگ اس وقت طباس سے گزر رہے تھے (اصطخری لکھتا ہے کہ سیستان کے دو صوبے بلوچ علاقے سے منسوب تھے اور بلوچ ان میں آباد تھے۔ محمود غزنوی کے عہد میں اس بادشاہ کے ایک سفیر کو کرمان جاتے ہوئے انہوں نے تبیس اور خبیس کے مابین لوٹ لیا۔ جس سے بادشاہ کا غصہ بھڑک اٹھا اور اس نے اپنے بیٹے مسعود کو ان کی سرکوبی کیلئے بھیجا۔ جس نے بالآخر خبیس کے پاس انہیں شکست دی۔ یہ مقام سلسلہ ہائے کوہ کرمان کے دامن میں صحرا کے آخری سرے پر واقع ہے)

(بلوچ قبائل ص ۴۳)

چند نفوس جو ان سفیروں کے رفیقوں میں سے زندہ بچ گئے سلطان کے پاس پہنچے، اور

سارا واقعہ عرض کیا۔ سلطان کو جس وقت یہ خبر ملی وہ اس وقت غزنی سے خوارزم آرہا تھا۔ بست (Bust) پہنچ کر سلطان نے اپنے لڑکے امیر مسعود سے ملاقات کی اور اسے بلوچوں کو قرار واقعی سزا دینے پر مقرر کیا۔ امیر مسعود فوج کے ایک دستے کے ہمراہ بُست سے روانہ ہوا اور ہرات پہنچ کر مزید کمک اکٹھی کی اور یہاں سے دوسو اور گھوڑ سوار ہمراہ لے کر لشکر جرار کے ساتھ بلوچوں کی جانب روانہ ہوا۔ ان کے اسی آدمیوں میں سے چالیس مارے گئے۔ باقی ماندہ گرفتار کر لئے گئے اور کافی مال و دولت ان کے ہاتھ لگی"۔

معلوم ہوتا ہے کہ رباط دیر کچین کی ہولناک جنگ اور قتل و غاری سے جو لوگ بچ رہے تھے۔ انہوں نے اتنی بے بسی اور بے چارگی کے باوجود سلطان کی اطاعت قبول نہ کی اور جب طباس سے شاہی قافلہ گزرا تو انہوں نے نتائج کی پرواہ کئے بغیر اسے قبضے میں لے لیا۔ اس پر گنتی کے جو چند نفوس "رباط دیر کچین" کی تاخت سے بچ رہے تھے وہ اس حادثے کی نذر ہو گئے۔

سلطان مسعود کی بادشاہت کا زمانہ اگرچہ مختصر ہے مگر اس نے بھی بلوچوں کو فراموش نہیں کیا۔ وہ عراق کی طرف گیا ہوا تھا کہ وہیں اسے پتہ لگا کہ بلوچوں نے پھر سر اٹھایا ہے اور کرمان کے ریگستانوں میں لوٹ مار کر رہے ہیں۔ مسعود مجبور تھا خود کرمان پہنچ کر بلوچوں کو قرار واقعی سزا نہ دے سکتا تھا۔ اس نے باپ کی طرح زہر آلود سیبوں کا ایک کاروان روانہ کیا۔ جسے حسب سابق بلوچوں نے لوٹ لیا اور ان میں سے بہت سے لوگ زہر آلود سیب کھا کر مر گئے۔

دگر نماند کہ اُو را بہ تیغ ناز کُشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کُشی

بہادر بلوچوں کی عادات وخصائل پر مؤرخین عالم کے تاثرات

اس ہنگامہ کے بعد ۶۲۶ھ مطابق ۱۰۵۲ء میں جب ناصر خسرو مکہ مکرمہ جاتے ہوئے اس ریگستان سے گزرا اس وقت سارے علاقے میں پورا امن تھا اور لوٹ مار کی کوئی واردات سننے میں نہ آئی۔ اس نے ریگستان کے شمالی حصے کو نجین (Najin) کے راستے سے طے کیا تھا جو الجبال میں واقع تھا۔ اس وقت جیرفت کا بلوچ سردار امیر جلاقی تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس نے ایسا نظم وضبط قائم کیا تھا کہ افغان ڈاکو جنہیں وہ قفص (کوچ) لکھتا ہے۔ بے دست و پا ہو کر رہ گئے تھے اور وہ راستے جو پانی کے ذخائر ہونے کے سبب زیادہ استعمال ہوتے تھے۔ وہ ہر طرح محفوظ تھے۔ ان راستوں کی حفاظت کیلئے ہر پڑاؤ میں امیر جلاق کی فوج تعینات تھی اور لوٹ مار کلیتاً ختم ہو چکی تھی۔ یہ اس امر کا زندہ ثبوت ہے کہ عضد الدولہ بویہ اور محمود غزنوی کے تباہ کن حملوں کے باوجود بلوچ اپنے وطن میں موجود تھے اور حکومت بھی بلوچ سردار کی تھی۔ چونکہ حکومتوں نے چھیڑ چھاڑ ختم کردی تھی اور حالات اعتدال پر آچکے تھے اس لئے بلوچوں نے لوٹ مار بند کردی تھی۔ ورنہ اگر لوٹ مار بلوچوں کی جبلت میں ہوتی تو اب بھی وہ باز نہ آتے۔

ناصر خسرو المتوفی ۱۰۵۷ء کے بعد ایک اور مورخ ابو عمر منہاج الدین عثمان، سراج الدین جرجانی بھی اسی راستے سے مکہ مکرمہ کو حج کے ارادے سے گیا تھا۔ یہ شخص طبقات ناصری کا مصنف اور شمس الدین التمش کے دور کا مشہور مورخ ہے۔ اس نے ۶۱۳ ہجری میں ہندوستان سے براہ سیستان مکہ مکرمہ کا سفر کیا تھا۔ جب وہ بست Bust سے کوچ کر کے بلوچوں کے دار الخلافہ کے قریب پہنچا تو اسے ایک جگہ قیام کرنے کا اتفاق ہوا جسے ''گنبد بلوچ'' کہتے تھے یہ سیستان کے مشرق میں واقع تھا۔ یہاں ایک وفد نے اس کا استقبال کیا۔ جسے امیر نے بھیجا تھا۔ یہ وفد اسے

شہر میں لے گیا۔ جہاں اس کی بڑی خاطر مدارت کی گئی۔ یہاں سات ماہ قیام کرنے کے بعد منہاج آگے روانہ ہوا۔

اس مؤرخ کے باپ اور دادا نے کئی بار نیمروز یعنی سیستان کا سفر کیا تھا۔ اس کے باپ کی موت بھی ریگستان میں ہوئی تھی جبکہ وہ سفیر کی حیثیت سے بغداد جا رہا تھا۔ اگر بلوچوں کی لوٹ مار کی شہرت ہوتی تو منہاج ہرگز یہ راستہ اختیار نہ کرتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس لوٹ مار کا ذکر ابن ہوقل اور المقدسی وغیرہ کرتے ہیں وہ محض اتفاقی اور ہنگامی تھی۔ ورنہ بلوچ شروع سے بڑے مہمان نواز اور سخی چلے آتے ہیں۔ اصطخری المتوفی ۹۵۱ء بلوچوں کے بارے میں پوری تفصیلات دیتا ہے اور وہ ان کی لوٹ مار کا کوئی ذکر نہیں کرتا، بلکہ نفی کرتا ہے۔ لکھتا ہے کہ:

''کوچ پہاڑوں میں رہتے ہیں اور بلوچ صحرا میں، یہ دونوں نسلیں اپنی مخصوص زبان بولتے ہیں جو فارسی سے مختلف ہے''۔

اس زمانے میں کرمانیوں کی عام بول چال فارسی زبان میں نہیں تھی۔ اوسلے (Osely) نے اس عبارت کا جو ترجمہ کیا ہے اس کے مطابق جس ریگستان یا صحرا میں ''بلوچ'' آباد تھے وہ پہاڑ کے جنوب میں کرمان اور سمندر کی جانب واقع تھا۔ اس کے عربی متن کا ترجمہ یہ ہے:۔

''کرمان کی شمالی سرحد مکران ہے اور مکران اور سمندر کے درمیان جو صحرا ہے وہ ''بلوشوں'' (بلوچوں) کی جانب جاتا ہے''۔

لیکن آگے چل کر لکھتا ہے کہ:

''بلوچ قفش کے پہاڑوں کے مرتفع علاقوں میں رہتے ہیں۔ ان کے سوا اور کوئی ان پہاڑوں میں داخل نہیں ہو سکتا۔ وہ بدوؤں کی طرح مویشی پالتے اور خیموں میں رہتے ہیں۔ نیز ان کے علاقے سے گزرنے والے راستے محفوظ ہیں۔

موردتامن (Motdtmaan) کا ترجمہ اصطخری۔ ہیمبرگ مطبوعہ ۱۸۴۵ء صفحات ۷۷ تا ۷۸)!''

اصطخری کے بیان کے مطابق یہ جبال قفص اور المغازہ کا ہی علاقہ معلوم ہوتا ہے۔ دراصل بلوچ بڑے وسیع علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ پہاڑ اور ریگستان سبھی ان کے جولان گاہ تھے الادریسی جو بقول مسٹر ایل ڈیمز ایک محتاط مؤرخ ہے۔ اس کے تاثرات بھی ملاحظہ ہوں لکھتا ہے کہ:۔

''سلسلہ ہائے کوہ کوچ میں وحشی نسل کے لوگ آباد ہیں۔ ایک قسم کے کرد اور بلوچوں کی آبادیاں کچھ تو شمال کی جانب اور کچھ مغرب کی جانب ہیں''۔

(جوبرٹ (Joabert) کا ترجمہ ادریسی حصہ اوّل ص ۴۲۸۔۴۲۹)

وہ مزید لکھتا ہے کہ:۔

''وہ خوشحال ہیں۔ ان کے پاس مویشی وافر ہیں اور ان کے پڑوسی ان سے ہراساں رہتے ہیں''۔ وہ اس امر کی بھی تصدیق کرتا ہے کہ ''وہ راہزنی نہیں کرتے''۔

آئیے اب ہم انگریز مؤرخین کے سفرناموں اور تاریخ کا جائزہ لیں کہ وہ بلوچوں کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ انگریز بلوچوں کا شدید دشمن تھا۔ اس نے بلوچوں کو مٹانے کیلئے تمام حربے استعمال کئے۔ سازشیں کیں اور کرائیں۔ وعدہ کر کے پھر عہدناموں کی دھجیاں آسمان کی فضائے بسیط میں بکھیر دیں بلوچوں سے جنگیں کیں تو ان میں بھی دھوکہ اور فریب سے کام لیا۔ بلوچوں کا قتل عام کیا۔ ان کے گھر لوٹے۔ ان کی مستورات کے زیورات تک اتارے۔ اس سے زیادہ خوفناک دشمن اور کون ہوسکتا ہے۔ اس لئے یہ تو قیاس ہی نہیں ہوسکتا کہ بلوچوں کے بارے میں وہ حُسن ظن سے کام لیں گے۔ بایں ہمہ ہمارے مسلمان مؤرخین نے ہم پر لوٹ مار اور قتل وغارت کے جو الزامات لگائے ہیں۔ انگریز مؤرخین نے اس بارے میں ہماری صفائی دی ہے۔

سر ہنری پوٹنگر جس کا سیاحت نامہ ''بلوچستان میں سفر'' ۱۸۱۸ء میں طبع ہوا تھا۔ اس میں رقمطراز ہے کہ:۔

''بلوچوں کی مہمان نوازی ضرب المثل ہے اور میں ملک کے جس حصے میں سے گزرا انہیں حد درجہ مہمان نواز پایا۔ چوری چھپے لوٹ مار یا مسافروں کا مال چرانے کو یہ لوگ انتہائی نفرت سے دیکھتے ہیں جب یہ لوگ کسی کو پناہ دینے کا وعدہ کرتے ہیں تو اس کی حفاظت کیلئے خون کا آخری قطرہ بہانے سے بھی گریز نہیں کرتے ''۔

(سر ہنری پوٹنگر، ٹریولز اِن بلوچستان ۱۸۱۵ء)

ایک اور انگریز ڈینزل آئی بسٹن کے۔سی۔ایس آئی نے اپنی مشہور کتاب ''اقوام پنجاب'' (دی پنجاب ریسز ۱۸۸۳ء) میں بلوچوں اور پٹھانوں کے بارے میں حسب ذیل تاثرات تحریر کئے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ:۔

''بلوچ اور پٹھان دونوں انتہائی سختی سے اپنی پاکیزگی نسل کا خیال رکھتے ہیں اور اپنے شجرہ نسب کو نہایت فخر سے بیان کرتے ہیں۔ مہمان نوازی دونوں کی نظروں میں مقدس فریضہ ہے اور مہمان کی حفاظت کو دونوں قومیں زندگی کا اہم فریضہ خیال کرتی ہیں۔ خون کا بدلہ خون سے لینا ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ دونوں اپنے طرز حیات کے مطابق زندگی کی مختلف قدروں کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ بلوچ اپنے قول کا پکا ہے اور دشمن پر سامنے سے وار کرتا ہے۔ بلوچ مذہبی دیوانہ نہیں تاہم شیطان کے پھندے میں بہت کم پھنستا ہے''۔

(سر ہنری پوٹنگر، ٹریولز اِن بلوچستان ۱۸۱۵ء)

مسٹر ٹی۔ ایس۔ پوسٹانس لکھتے ہیں کہ:

''بلوچ بندوق کے ماہر نشانہ باز ہیں اور کم سنی میں ہی سپہ گری کے ہر فن کو اچھی طرح سیکھ لیتے ہیں۔ مگر سب سے زیادہ بھروسہ یہ لوگ تلوار پر کرتے ہیں۔ میانی کی جنگ میں جب پرانی طرز کی بندوقوں نے دھوکہ دیا تو بلوچوں نے انہیں ایک طرف پھینک دیا اور ہماری سنگینوں پر برہنہ تلواریں لے کر عقاب کی طرح جھپٹ پڑے''۔

(ذاتی مشاہدات سندھ ۱۸۴۳ء)

بلوچوں کا بڑا دشمن جس نے مکاری، جعلسازی اور دھوکے فریب سے تالپور سلطنت کو ختم کیا۔ جس نے چنگیز کی طرح بلوچوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ یعنی سر چارلس نیپئر وہ اپنی کتاب ''ایڈمنسٹریشن آف سندھ (لندن ۱۸۵۱ء) میں بلوچوں کی بہادری کو دیکھ کر انہیں تمام ایشیاء میں انگریزوں کا بہادرترین دشمن بتاتا ہے۔ اپنے ایک خط میں ''میانی'' کی جنگ کا حال درج کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

''اوّلا بہادر بلوچ اپنی بندوقوں اور پستولوں سے لڑتے رہے اور بڑے پکے ارادے اور جوش وخروش کے ساتھ ہمیں دریا (فلیلی) کے کنارے تک دھکیلتے چلے آئے۔ مگر ہماری جدید اور عمدہ بندوقوں اور سنگینوں کے سامنے تلوار کے ماہر بلوچوں کی کچھ نہ چل سکی اور وہ ایک ایک ہو کر کٹتے گئے''۔

ایک اور مقام پر بلوچوں کے اخلاق کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

''بلوچ حد درجہ مہمان نواز ہیں اور کوئی اجنبی بھی ان کے کھانے میں شرکت کئے بغیر ان سے بچھڑ نہیں سکتا۔ کھانے کے بعد یہ لوگ مہمان کے گرد جلتی ہوئی آگ کے چاروں طرف گھیرا ڈال کر بیٹھ جاتے ہیں یا چاندنی راتوں میں جمع ہو کر اسے اپنے گیت سناتے ہیں۔ جن میں ان کے آباء کرام کے جنگی کارنامے بیان ہوتے ہیں۔ بلوچوں میں شکار کا شوق زیادہ ہے''۔

انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا ایڈیشن XI میں لکھا ہے کہ:۔

''بلوچ صاف گو، عام طور پر سچا اور کھلے دل کا مالک ہے۔ اپنے وعدکا سختی سے احترام کرتا ہے۔ مزاجاً معتدل ہے۔ آسانی سے خوش اور مطمئن ہو جاتا ہے۔ دلیری اور شجاعت کی زندگی کو محبوب جانتا ہے۔ وہ اعلیٰ درجے کا شہسوار ہے۔ گھوڑسواری اور گھوڑا دوڑانا اس کا دلفریب مشغلہ ہے۔ بلوچ نسل کے گھوڑے تمام شمالی ہند میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں''۔

مسٹر الیگزنڈر لکھتا ہے کہ:

''بلوچ عربستان کے بادیہ نشینوں کی طرح پیدائشی گھوڑ سوار ہیں۔ یہ گھوڑوں کی ایک خاص نسل پالتے ہیں اور انہیں بھوک پیاس کے برداشت کرنے کی عادت ڈالتے ہیں تاکہ وہ لمبے وقفوں کے بعد پانی پی کر زندہ رہ سکیں۔ تمام بلوچ خواہ وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر جنگ کریں یا پیدل، اپنے ضروری ہتھیاروں سے ہر وقت مسلح رہتے ہیں۔ ان کی تلواریں چوڑی اور چھوٹی ہوتی ہیں۔ جن میں خفیف سا خم ہوتا ہے۔ یہ نہایت آبدار اور تیز ہوتی ہیں۔ ان کے کنارے تیز دھار والے اور نوکیلے ہوتے ہیں۔ بلوچوں کے جنگی کارنامے اور ان کی تیز دھار والی تلواریں دیکھ کر سلطان صلاح الدین ایوبی کے لشکر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جس نے صلیبی جنگوں میں تمام دنیا کو حیرت میں ڈال دیا تھا''۔

''بلوچ (انگریزوں کے ساتھ) کئی جنگوں میں سخت اور بہادر ترین حریف ثابت ہوئے ہیں۔ خصوصیت سے یہ اس وقت وحشت ناک دکھائی دیتے ہیں۔ جبکہ جنگ کے میدان میں اس کے رفیق مارے جا چکے ہوں۔ اس وقت بلوچوں کی جنگ میں جوش و خروش اور بے جگری کی مثال صرف سوڈان کے شمشیر بکف عالم دین (مہدی سوڈانی) سے بآسانی دی جا سکتی ہے۔ (یعنی) جب دشمن کے نرغے میں آجاتے ہیں تو نہایت بہادری اور جوش و خروش سے لڑ کر کٹ مرنے کو ہتھیار ڈالنے یا پناہ لینے پر ترجیح دیتے ہیں اور آخری دم تک ہتھیار نہیں ڈالتے''۔

(سوانح عمری مسٹر جان جیکب مطبوعہ ۱۹۰۱ء)

ایک اور صاحب گرتھن گیری ہیں۔ آپ نے ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر کی حیثیت سے 19 صدی کے اواخر میں بمبئی سے لے کر باسفورس تک کی سیاحت کی تھی۔ ان کا شمار انیسویں صدی کے معیاری سیاحوں میں ہوتا ہے۔ آپ اپنے سیاحت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

''بلوچ عربوں کی طرح شریف انسان ہیں۔ گو ظاہری صابر نظر آتے ہیں مگر ان کی طبیعت بدلنے میں دیر نہیں لگتی۔ وہ بدن میں مضبوط، ظاہری خاموش مگر چستی و چالاکی میں چقماق، خبردار رہنا

ان کی جبلی عادت ہے۔سیاسی طور پر وہ فقط اتنا جانتے ہیں کہ اپنے سردار کے حکم کے پابند رہیں۔ یہ قوم کراچی سے لے کر مسقط و عراق تک پھیلی ہوئی ہے۔خاص طور پر مسقط اور متراہ میں ان کی تعداد زیادہ ہے۔''

(Grathan geary throngh Asiatic Turkey P.17 London 1878)

کرنل سر تھامس ہنگر فورڈ ہالڈچ وائل جغرافیکل سوسائٹی کے نائب صدر کو بلوچوں سے عشق تھا۔لکھتے ہیں:۔

''بلوچ پہلے اپنے دشمن کو للکارتے ہیں پھر کھلے میدان میں اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔صلح اور امن کے زمانے میں جب وہ اپنے قومی لباس میں چمکتے ہتھیار زیب تن کر کے باہر نکلتے ہیں تو ان کی لمبی لمبی زلفوں کو دیکھ کر خود بخود تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ باشندگان ایشیاء میں یہ لوگ انسانیت کی بہترین تصویریں ہیں۔ یہ بلند قامت اپنے سیما طیقی چہروں سے صاف بتاتے ہیں اور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ صحرائے نجد کے بانکے جوان ہیں''۔

(L.H.Haldich sir, the Indian Border Land P.185 London 1878.)

رچرڈ برٹن بلوچوں کے بارے میں اپنے تاثرات اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:۔

''سندھیوں کے مقابلے میں بلوچ بلند حوصلہ اور خوبصورت ہیں۔خوبصورتی کے علاوہ جسمانی طور بھی مضبوط ہیں۔ بلوچ جنگ کے میدان میں بیباک، دلیر اور اپنی عزت کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے خیالات استعمال کرتا ہے اور جب بگڑتا ہے تو انتقام کے لئے بالکل وحشی بن جاتا ہے۔ امن کی حالت میں شکار اس کا مرغوب شغل ہے۔کھلے میدان میں کھیل کو زیادہ پسند کرتا ہے۔اس کا کھانا لذیذ ہو، یا سادہ مگر ہر حال میں قانع رہتا ہے''۔

(A.W Hughes, A Gazetteer of the Province of sing. c.h.v.p.83 London 1874.)

مسٹر ڈی ڈنڈنٹ نے سونمیانی سے قلات تک بلوچستان کی سیاحت کی تھی۔ان کا بیان ہے کہ:۔

''بلوچوں کے چہرے خوبصورت اور ارادے مضبوط ہیں۔ان کی بدنی اور چہروں کی ساخت زیتونی عربوں کے موافق ہے۔ دونوں قومیں ہم شکل ہیں۔ ان کے چہروں کے خدوخال صاف بتاتے ہیں کہ وہ فطرتی تیز فہم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جلد غصے میں آجاتے ہیں۔ یہ ان کی غیرت کے ثبوت کے لئے کافی ہے کہ مرنے اور مارنے سے دریغ نہیں کرتے۔ان کی چستی، چالاکی، جنگ کے موقع پر دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔رات کو یہ نہ سمجھو کہ وہ غافل ہوتے ہیں۔ان میں کوئی نہ کوئی ضرور بیدار رہتا ہے''۔

(Hope.A.R.Monchief the World of today Vol Balochistan London.)

(استفادہ از ''حدیث دیگراں'' بلوچی دنیا جون ۱۹۵۷ء ص ۳۷ تا ۴۰)

آخر میں بلوچوں کے بارے میں پاکستان کے ممتاز ادیب پروفیسر انور رومان کے تاثرات ملاحظہ فرمائیے۔انہوں نے اپنا تعارف خود کرایا ہے اور بلوچوں کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ ان کا تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ ''آئینہ بلوچ '' کے صفحہ ۳ میں لکھتے ہیں۔ ''میں بلوچ نہیں ہوں لیکن چودہ سال تک گورنمنٹ کالج کوئٹہ (آں مقام عزوشان) میں پروفیسر رہنے کی وجہ سے بیسیوں بلوچ نوجوان میرے زیر تعلیم رہے اور مجھے نہ صرف ان کے سوزوساز اور ان کے توسط سے بلوچوں کے پیچ وتاب میں شریک ہونے کا موقع ملا بلکہ انہیں آئینہ تاریخ وادب میں بھی دیکھنے کی توفیق نصیب ہوئی۔

''بلوچ ازل سے (علامہ اقبال کے رہ نوردشوق کی طرح) منزل پسند نہ تھے اور اُن کا نظریہ حیات چلنا چلنا مدام چلنا تھا۔وہ عرب سے نکلے تو عراق اور شام میں پہنچے۔ یہاں سے نکلے تو شمال

مغربی ایران میں وارد ہوئے۔ یہاں سے آگے بڑھے اور ایران کے طول و عرض میں گزرتے ہوئے کرمان، سیستان اور مکران آپہنچے۔ خصوصاً مؤخر الذکر مقام پر ان کا قیام کافی طویل تھا۔ عرب اگر ان کا گہوارہ اوّل تھا تو مکران گہوارہ دوم بنا۔ یہاں سے ان کا معتدبہ حصہ پھر سر گرم سیر و سفر ہوا تو وہ قلات سے ہوتے ہوئے سبی اور کچھی میں اقامت گزین ہوئے۔ یہاں بھی تشنگی دور نہ ہوئی تو وہ سندھ، پنجاب، گجرات، کاٹھیاواڑ اور دہلی تک پہنچ گئے۔ وہ ایک تیز و تند سیلاب تھے جو عرب کے ریگزاروں سے امڈا اور اس کی بل کھاتی ہوئی لہریں دلی تک پہنچ گئیں۔ اس کشف و نفوذ میں صرف ان کی سیمابی فطرت، خطر پسندی، جہاں گردی اور قسمت آزمائی ہی کار فرما نہ تھی بلکہ اقتصادی محرکات اور سیاسی حالات بھی بہت پیش پیش تھے لیکن وہ عرب میں ہوں یا شام میں، ایران میں ہوں یا مکران میں، بلوچستان میں ہوں یا سندھ میں، پنجاب میں ہوں یا سرحد میں، ان کا جغرافیائی ماحول قریب قریب ایک ہی جیسا رہا، جو سکونت گاہ بھی انہیں پسند آئی یا جہاں وہ طویل عرصہ تک رہے وہ سب صحرائی یا نیم صحرائی، یا نیم پہاڑی علاقے تھے جو وسعت میں بے پناہ لیکن ذرائع پیداوار میں محدود تھے۔ مگر جہاں پانی میسر تھا بافراط روئیدگی، نظر فریب وادیاں اور جنت پرور نخلستان پائے جاتے تھے۔ ان کے علاقوں میں بارش بہت کم ہوتی تھی (اور کم ہوتی ہے) اور سخت گرم اور خشک ہوائیں چلتی تھیں۔ دن کو سورج بے پناہ حدت، رات کو عروس قمر کا خوام، یا کم از کم ستاروں کی ضوفشانی، کھلے نیلے آسمان کی بے کنار وسعتیں اور پہنائیاں گرمی میں ہانپتے ہوئے انسان اور امیدیں باندھتے اور توڑتے ہوئے سراب، غضبناک بگولے اور قہر آلود آندھیاں اور سردی میں یخ بستہ ہوائیں، یہ تھا وہ ماحول جس میں وہ اپنے خیمے گاڑتے اور اکھیڑتے رہے۔ اپنے سرداروں کا پانی بھرتے رہے۔ جنگ و جدل اور قتل و غارت کرتے رہے اور للکارتے اور گیت گاتے رہے۔ ان میں انتقام کا جذبہ شدید تھا۔ ان کی باہمی لڑائیاں عموماً چشموں اور نخلستانوں پر ہوتی تھیں۔ ان کے بازو قوی اور دل جوان تھے۔ ان کا نظریہ حیات سیدھا سادہ اور صحت مند تھا۔ ان کے خون میں جوش زیادہ تھا۔ لیکن

ضمیر کی کھٹک اور دل کی رقت سے وہ کم آشنا تھے۔ بیرونی دنیا سے ان کا لگاؤ جنگ و پیکار کا تھا۔ وہ زیادہ عرصہ حاکم بن کر نہ رہ سکتے تھے۔ اس لئے کہ سیاست کے داؤ پیچ ان کے سپاہیانہ مزاج کے مطابق نہ تھے۔ وہ زیادہ عرصہ محکوم بھی نہ رہ سکتے تھے۔

ہمیں جناب رومان کے ان تاثرات سے اختلاف ہے۔ بلوچوں نے حاکم اور محکوم رہ کر دنیا پر ثابت کر دیا کہ وہ من حیث القوم ان صلاحیتوں سے عاری نہیں۔ ست گھرہ، قلات، حیدر آباد، میر پور خاص، خیر پور، میرس، ڈیرہ اسماعیل خان اور ڈیرہ غازی خان میں یہ صدیوں تک کامیاب حکمران رہے۔ ملتان میں لنگاہوں اور سندھ میں کلہوڑوں کے محکوم رہے اور اپنے فرائض کو آخیر تک انتہائی دیانت داری سے انجام دیتے رہے) اس لئے کہ دوسرے کے تابع فرمان رہنا ان کی فطری آزادی پسندی کے خلاف تھا۔ وہ خارجی دنیا کے ساتھ مساویانہ تعلقات نہ رکھ سکتے تھے۔ (خوانین قلات، میران سندھ کے حالات میں ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ خارجی دنیا کے ساتھ ان کے تعلقات ہمیشہ مساویانہ رہے) اس لئے کہ وہ اپنے ان غیر آباد اور بے آب و گیاہ علاقوں کی پیدا کردہ ناداری (داد و دہش میں بلوچوں کا جواب نہیں۔ اگر امیر ہیں تو ہزاروں دیتے ہیں اور غریب ہیں تو ما حضر تک قربان کر دیتے ہیں۔ سردار عبدالمجید خان لاشاری ایڈووکیٹ لاہور نے اس سلسلہ میں ایک واقعہ سنایا۔ فرماتے تھے کہ ہم فورٹ منرو میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک بلوچ نوجوان ہمیں دودھ دیا کرتا تھا۔ چند دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ مگر پھر یکلخت ختم ہو گیا۔ ہم نے دوسری جگہ سے دودھ کا انتظام کر لیا تین چار دنوں بعد وہ نوجوان دفعتہ سر راہے مل گیا۔ ہم نے دودھ نہ پہنچانے کی شکایت کی تو وہ ہنس کر بولا صاحب! بات یہ ہے کہ ایک رات چند مہمان آ گئے۔ گھر میں کچھ نہیں تھا میں نے گائے ذبح کر کے انہیں کھلا دی۔ وہ کسی مہم پر جا رہے تھے جب واپس لوٹے تو پھر میں نے بچھڑا ذبح کر کے ان کی ضیافت کی۔ یہ واقعہ وہ اس طرح بیان کر رہا تھا گویا اس کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ مگر ہم دم بخود رہ گئے۔ پھر ہم نے باہم کچھ رقم جمع کر کے اسے دینا چاہی کہ وہ اور گائے خرید ے مگر اس نے قبول نہ کیا۔ یہ بری بات ہے

میں خود کما کر پیسے جمع کروں گا اور پھر گائے خریدوں گا۔ ایسی قوم کے بارے میں رومان صاحب کے یہ ریمارکس نظر ثانی کے محتاج ہیں۔) کی وجہ سے دوسروں کو کچھ نہ دے سکتے تھے لیکن ان کے پیدہ کردہ سامان حیات کی ہر وقت ان صحرا زادوں کو ضرورت رہتی تھی۔ ان کے پاس صرف ایک ہی متاع بے بہا تھی جو انہیں گردوپیش کی حکومتوں کے ہاں مقبول کر سکتی تھی۔ یہ متاع تنہا ان کا زور بازو، شوق وغا اور جذبہ شہادت تھا لیکن فوجی خدمت کے بدلے وہ جو قیمت مانگتے تھے۔ وہ اتنی زیادہ تھی کہ اکثر طاقتور حکومتیں انہیں پسند نہ کرتی تھیں۔

(آئینہ بلوچ ص ۱۱ تا ۱۳)

(ہمیں کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں کہ بلوچوں نے فوجی خدمت کا کوئی معاوضہ طلب کیا ہو۔ میر چاکر خان رند نے ہمایوں کی مدد کی تو اس سے کوئی معاوضہ طلب نہ کیا۔ خان اعظم میر نصیر خان نوری نے احمد شاہ ابدالی کے سپہ سالار کی حیثیت میں جتنی جنگیں لڑی ہیں وہ بھی ان کے جذبۂ جہاد کا نتیجہ تھیں۔ بلوچوں میں سودا بازی کی کہیں مثال نہیں ملتی)

بلوچوں کا طاقت ور حکمرانوں سے محض اس لئے تصادم رہا کہ وہ ان کی آزادی سلب کرنا چاہتے تھے۔ یہ امر بلوچوں کی جبلت کے خلاف تھا۔ لنگاہ ان کے مزاج شناس تھے انہوں نے انہیں بلایا۔ ریاستیں اور جاگیریں عطا کیں مگر انہیں مطیع ومنقاد بنانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جس طرح سندھ میں ان کے حلیف تھے ویسے ملتان میں ان کے دوست رہے۔ جب کبھی بیرونی حملہ آور ملتان کا رُخ کرتے بلوچ اپنی جمعیت کے ساتھ سینہ سپر بن کر آگے آجاتے تھے چنانچہ لنگاہوں کے آخر عہد تک بلوچ ریاستیں ملتان کی حکومت کو عسکری امداد دیتی رہیں۔ اس طرح مغلوں اور کلہوڑوں نے بھی بلوچوں کی جنگی قوت سے فائدہ اٹھایا۔

منزل بہ منزل

گو سامراجی قوتیں اپنے دورِ اقتدار میں بلوچوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی پوری کوششیں کرتی رہیں۔ ساسانیوں کے بعد بویہ ملوک، اور بویہ ملوک کے بعد غزنوی سلاطین نے انہیں تباہ و برباد کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں ہونے دیا تھا۔ مگر یہ قوم ایسی سخت جان ہے کہ کوئی اسے جتنا دبائے یہ اتنا ابھرتی ہے۔ ہر کربلا کے بعد اسے نئی زندگی نصیب ہوتی ہے۔ چونکہ بلوچ من حیث القوم آلِ رسول (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے معتقد اور محب ہیں اس لئے خادم اور مخدوم دونوں کی تاریخ ایک جیسی چلتی ہے۔ سادات کرام کو امویوں نے ختم کرنے کی انتہائی کوشش کی مگر نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خود مٹ گئے مگر سادات کرام کا دنیا میں بول بالا رہا۔ پھر عباسیوں نے انہیں حریف سمجھ کر قید و بند میں مبتلا کیا۔ کسی کو تلوار سے اور کسی کو زہر سے ختم کیا اور کئی زندہ دیواریں چنوا دیئے گئے۔ (سیدہ) فاطمہ کے جگر کے ٹکڑے جانیں بچانے کیلئے مدینہ سے عراق، عراق سے یمن اور یمن سے سندھ تک مارے مارے پھرتے تھے۔ مگر انہیں کہیں پناہ نہیں ملتی تھی۔ انجام کار انہوں نے سہوان کے راجے کی پناہ لی۔ مگر خلیفہ منصور نے سادات کے ساتھ راجے کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس وقت بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ سادات دنیا سے مٹا دیئے گئے مگر دنیا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ قدرت نے سیدہ زینب صلوٰۃ اللہ علیہا (جس وقت کوفہ میں ابن زیاد نے حضرت امام زین العابدین سلام اللہ علیہ کو شہید کرنے کا ارادہ کیا تو مخدومہ کائنات حضرت زینب صلوٰۃ اللہ علیہا کی شدت غم سے چیخ نکل گئی اور آپ نے مدینہ منورہ کی طرف منہ کر کے حضرت نانا جان کو خطاب کر کے عرض کیا۔ **نَادِیک یَاجدّاہ یَاخیر مُرسل۔ان حُسینک مَقتلَ و نسَلک ضائع۔** یعنی اے نانا جان! اے نبیوں کے سردار! تیرا حسین (علیہ السلام) شہید کر دیا گیا اور اب تیری نسل بھی مٹائی جا رہی ہے!) کی پکار کا جواب اس طرح دیا کہ سادات کرام کو اتنا پھیلایا کہ

آج ناظورہ عالم کا ایسا کوئی گوشہ نہیں جہاں کوئی سید موجود نہ ہو۔ گیلانی، بخاری، نقوی، رضوی، زیدی، شمسی، اسمٰعیلی، حسنی، حسینی، عسکری، قفالی، نورنگ شاہی خدا معلوم کتنی گوتیں اس مقدس خاندان کی ہیں اور کتنی تعداد ہے سوائے خدائے علیم و بصیر کے اور کوئی نہیں جان سکتا۔ یہی حال بلوچوں کا ہے کہ دشمنوں نے اپنی طرف سے تو کئی باران کی نسل کو ختم کیا۔ مگر یہ ہیں کہ آج دنیا میں چار کروڑ سے بھی زیادہ شمار کئے جاتے ہیں۔ مگر نہ ساسانیوں کا کوئی پتہ ہے اور نہ ہی بویہ فراعنہ کا، غزنوی بھی ایسے مٹے کہ آج دنیا میں کوئی ان کا نام لیوا تک باقی نظر نہیں آتا۔ لیکن بلوچ تو صدی در صدی بعد کرمان کے صحرا پر دوبارہ چھا گئے تھے۔ چنانچہ مارکو پولو (مارکو پولو مشہور لاطینی سیاح گزرا ہے۔ اس نے امیر تیمور کے زمانے میں یورپ سے چین تک سفر کیا تھا۔ واپسی پر مکران کے ساحل سے گزرا۔ سکندر اعظم کے بعد یہ دوسرا مغربی تھا۔ جس نے مغربیوں کو مشرقی دنیا سے متعارف کرایا۔) جو ایک مشہور لاطینی سیاح ہے اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ عضدالدولہ اور غزنوی کے قتل عام کے باوجود ”کرمان کے صحرا میں ہزاروں بلوچی قبائل آباد ہیں“۔

(Yule,h.Marcopolo Book II Ch..XIII P.P.94-95 London 1871.)

صدیوں کی مسلسل جھڑپوں اور خونریزیوں سے تنگ آ کر بلوچوں کو زیادہ محفوظ مقام کی طرف منتقل ہونے کا خیال پیدا ہوا۔ جبال قفص اگرچہ محفوظ مقام تھا۔ تاہم سلاطین کی زد میں تھا۔ ساسانی، بویہ اور غزنوی حکمرانوں نے اسی لئے انہیں تختہ مشق بنائے رکھا تھا۔ بلوچوں کی نگاہیں اب مکران پر مرکوز ہو رہی تھیں کیونکہ یہ مرکزی طاقتوں سے دور اور دشوار گزار پہاڑی سلسلوں پر مشتمل تھا۔ نیز دو اطراف میں بحر ناپیدا کنار موجیں لے رہا تھا۔ اس لئے بلوچوں کا ایک کارواں اس سرزمین کی جانب روانہ ہوا یہ بروہی قبیلہ تھا۔ بروہی بلوچ قوم کا ایک زبردست قبیلہ ہے جو میر بروہی بن میر دوست محمد سے منسوب ہے۔ ہم گزشتہ اوراق میں بیان کر چکے ہیں کہ حلب سے بلوچوں کے قبائل میر اعلمش رومی کی قیادت میں جبال قفص میں وارد ہوئے تھے۔ سلطان مسعود غزنوی کے دور تک یہ قبائل جبال قفص اور کرمان کی مختلف پہاڑیوں اور صحراؤں میں اوقات بسر

کرتے رہے۔ ازاں بعد بروہی مکران کی طرف منتقل ہوئے۔ چند ایسے اہل قلم منظر عام پر آگئے ہیں جو بلوچ بروہیوں کو بھارت کے دراوڑوں سے منسوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارا شروع سے یہی موقف رہا ہے کہ بروہی میر بروہی کی اولاد ہیں اور لفظ ''بروہی'' ابراہیم کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ میر بروہی اپنے قبائل میں خاص صلاحیتوں کے سبب ممتاز تھے۔ خدا نے ان کو نامساعد حالات کے باوجود مال و اولاد کے سلسلے میں بڑا خوش نصیب بنایا تھا۔ ان کا خاندان خوب پھلا پھولا اور عالمگیر شہرت کا مالک بن گیا۔ ابن ہوقل نے صوبہ فارس کے جن معروف قبائل کا ذکر کیا ہے ان میں بروہی کا نام بھی درج ہے جیسے زم کرمانیاں، درمانیاں، بروھی وغیرہ۔ ابن ہوقل کے اس اقتباس پر میر خدا بخش خان بجارانی کا یہ بیان کتنا دلچسپ اور بروہیوں کو دراوڑ ثابت کرنے والوں کے رخسار پر کتنا زبردست طمانچہ ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

''ابن حوقل کا ''قبیلہ بروہی'' سے متعلق تذکرہ کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس نے دسویں صدی میں بروہیوں کو دوسرے قبائل میں سے ایک قبیلہ بتایا ہے جو کوچ بلوچ اور دیگر قبائل کے ساتھ صوبہ فارس اور اس کے گردو پیش کے علاقوں میں رہتے تھے۔ یہ موجودہ دور کے مورخ کے لئے حیرت انگیز بات ہوگی۔ ساتھ یہ امر بھی کچھ کم تعجب انگیز نہیں کہ انگریز مورخین جو تحقیق و تدقیق کی وادیوں میں سرگرداں رہتے ہیں۔ ان کی نظر بھی ابن حوقل کے اس بیان پر نہیں پڑ سکتی۔ حالانکہ سرولیم روزلے نے ۱۸۰۰ء میں اس کا ترجمہ فارسی سے انگریزی میں کر دیا تھا۔ یہ لوگ ناحق بروہیوں اور ان کی زبان سے متعلق مخمصے میں پڑے رہے اور اس مسئلہ کو اور بھی الجھا گئے۔

(اخذ و اقتباس از مسئلہ بلوچ)

اس کا بدیہی ثبوت ایک اور یہ ہے کہ راجپوتوں یا دراوڑوں میں بروہی نام کا نہ تو کوئی شخص ہوا ہے اور ہی کوئی قبیلہ اور نہ ہی اس نام سے کوئی قوم یا گوت بھارت میں پائی جاتی ہے۔

میر قنبر بروھی

قلات کا پہلا بروہی فرمانروا

جب بروہی اوراس کے حلیف منزلیں طے کرتے قلات سیوا میں پہنچے۔ ان دنوں وہاں کا راجہ ایرانی حکومت سے مرعوب تھا۔ اس نے بروہیوں کی آمد کوغنیمت جانا اورانہیں ریاست کی کلیدی آسامیوں پر تعینات کردیا۔ مگر راجہ اور بروہیوں میں بہت جلد اختلاف واقع ہوگیا اور وہ اتنا بڑھا کہ راجہ کے آدمیوں نے ایک موقعہ پر بلاوجہ بروہیوں کو زدو کوب کیا۔ جس پر میر قنبر طیش میں آگئے اورانہوں نے راجہ پر حملہ کرکے قلات پر قبضہ کرلیا۔ راجہ سبی کی طرف بھاگ گیا اور یہ قلعہ جو پہلے ''قلات سیوا'' کے نام سے مشہور تھا۔ اب عام وخاص میں ''قلات بلوچ'' کہلانے لگا۔

بعض لوگوں نے غلطی سے میر حمزہ بن چاکر اعظم کو حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ سمجھ لیا اور جھٹ سے قریشی ہاشمی بن بیٹھے۔ اسی طرح میر قمبر بروہی کے بارے میں بھی بعض نے یہ شگوفہ چھوڑا ہے کہ یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے غلام ''قمبر'' تھے حالانکہ خلافت مرتضوی ۳۵ھ سے شروع ہوکر ۱۷ رمضان المبارک ۴۰ھ کو ختم ہوگئی۔ انگریزی تاریخ کے حساب سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تاریخ شہادت ۲۷ جنوری ۶۶۱ء بنتی ہے۔ مگر میر قمبر بروہی قلات میں تیرھویں صدی عیسوی کی شروعات میں پہنچے تھے۔ اس لئے یہ مفروضہ اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتا۔

بلوچوں کا ایک اور کارواں

اگرچہ بلوچوں کو کرمان میں آئے دن سلاطین کی جھڑپوں سے سابقہ پڑتا رہتا تھا لیکن ۱۲۲۱ء میں وسط ایشیاء سے تباہی وبربادی کا ایک ایسا سیلاب آیا کہ بڑی بڑی حکومتیں خس وخاشاک کی طرح بہا لے گیا۔ خوارزم شاہ اس حملے کی تاب نہ لا کر بحیرہ کیسپین کی طرف بھاگا اور

وہیں ۶۱۷ھ ۔ ۱۲۲۰ء میں مر گیا۔ اس کا بہادر بیٹا سلطان جلال الدین جو سمرقند و بخارا سے ہرات و اصفہان تک وسیع سلطنت کا مالک تھا۔ سخت جنگ وجدل کے بعد چنگیز خان سے شکست کھا کر ہندوستان کی طرف بھاگا۔ اس کے تعاقب میں چنگیز خان بھی قشون قاہرہ کو دوڑاتا سندھ کے کنارے تک پہنچا اور دشمن کو پنجاب میں دھکیل کر واپس لوٹا۔ اب اس نے کرمان کی دشوار گزار وادیوں اور جبال قفص کی تنگ وتاریک گھاٹیوں کا رخ کیا۔ چنگیزی طوفان کی ہولنا کی سے بلوچ بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے اس آفت ناگہانی سے ٹکرلینی مناسب نہ جانی اپنے صدیوں کے مسکن کو خدا حافظ کہا اور نئے وطن کی تلاش میں چل نکلے۔ (اسی زمانے میں بخارا سے سیدالسادات جلال بخاری، سنجر سے شیخ معین الدین حسن سنجری اور شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر کے والد بزرگوار، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی۔ حضرت لعل شہباز قلندر اور ان جیسے سینکڑوں مشائخ اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر ہندوستان تشریف لائے۔ علاوہ ازیں بے شمار امراء اور شعراء کو بھی وطن ترک کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

چنانچہ فرشتہ لکھتا ہے:۔ ''زبدہ وبخبہ وخلاصۂ عالم از اصحاب سیف وقلم وسازندہ وخوانندہ وارباب ہنر کہ درربع مسکون عدیل ونظیر نداشتند ۔ دردرگاہ بلبن جمع شدہ بوند''۔

(فرشتہ ص ۷۵)

ان مندرجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کرمان سے ملتان تک بلوچ بڑی تعداد میں پھیل چکے تھے۔

چنانچہ کئی کوہ سلیمان کی تلہٹی میں پھیل گئے۔ کئی سرگودھا اور جھنگ کی طرف بڑھتے چلے گئے چنانچہ خسرو خان (کشلو خان آبیہ) گورنر ملتان کو جب فوج وسپاہ کی ضرورت ہوئی تو اس نے کوہ سلیمان کے بہت سے بلوچوں کو طلب کر کے اپنی فوج میں بھرتی کر لیا اور جب اس کی محمد تغلق سے جنگ ہوئی تو اس میں بھی بے شمار بلوچوں نے حصہ لیا۔

معصومی لکھتا ہے:۔

''بلوچ، محمد تغلق (۲۷۔۱۳۲۶ء) کے دور حکومت میں خسرو خان کے طرفدار تھے جو اس وقت سندھ کا گورنر تھا۔ خسرو خان سندھ سے ملتان آیا۔ جہاں اس نے ملتانیوں اور بلوچوں پر مشتمل فوج اکٹھی کی اور بغاوت کر دی''۔ (تاریخ معصومی)

بلوچوں کا سیستان میں ورود

قوموں کی ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی ایک بڑے حادثے کی نشاندہی کرتی ہے۔ چنگیزی تاخت سے متاثر ہو کر کرمان سے جب بلوچوں کی وسیع پیمانے پر مہاجرت شروع ہوئی تو ان کی بڑی تعداد سیستان میں وارد ہوئی۔ یہاں ان دنوں ملک شمس الدین کی حکومت تھی۔ چونکہ وہ دشمنوں سے مطمئن نہیں تھا۔ اس لئے بلوچوں کے اس لشکر جرار کو اس نے غنیمت سمجھا اس نے ان کی بڑی خاطر مدارت کی اور انہیں آباد ہونے کے لئے سیر حاصل اراضیات مرحمت کیں ۶۸۱ھ میں جبکہ ملک شمس الدین نماز جمعہ پڑھنے کے لئے جامع مسجد کو جا رہا تھا۔ حسن بن صباح کے چار فدائیوں نے اسے سر بازار شہید کر دیا۔ ملک شمس الدین کے بعد اس کا بڑا بیٹا بدر الدین تخت پر بیٹھا چونکہ وہ باپ سے آزردہ تھا اس لئے اس کے فدائین نے ملک شمس الدین کو شہید کیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ بلوچوں کو اس سازش کا علم ہو گیا ہو اور انہوں نے ملک بدر الدین کے اس لعنتی اقدام کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہو۔ بہر حال بادشاہ سے بلوچوں کے تعلقات اچھے نہ رہے اور اس زمانے کے دستور کے مطابق ملک بدر الدین نے یرغمال کے طور پر بلوچوں سے رشتے طلب کئے چونکہ ان کے چوالیس قبیلے تھے۔ اس لئے بادشاہ نے فی قبیلہ ایک ناطہ طلب کیا۔ غیر قوم میں رشتہ دینے کا بلوچوں میں دستور نہ تھا اور پھر یہ طریقہ تو اور بھی مذموم تھا۔ بلوچوں کے سردار میر جلال خان کو یہ بات ناگوار گزری لیکن چونکہ بادشاہ سے ٹکر لینے کی سکت بھی نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے بجائے دوشیزہ لڑکیوں کے چوالیس بہادر نوجوانوں کو زنانہ لباس پہنا کر شاہی محل میں بھیج دیا اور خود

راتوں رات مع اہل وعیال ملک کی سرحد پار کر آئے۔ ادھر نوجوانوں نے محل میں داخل ہوتے ہی تلواریں سونت لیں اور شاہی ملازمین سے گتھم گتھا ہو گئے۔ اس ہڑبونگ میں ملک بدرالدین نے فوراً فوج طلب کر لی جس سے لڑتے ہوئے کئی جوان شہید ہو گئے اور کئی جان بچا کر قافلے سے آملے۔ یہ کہانی اب تک بلوچوں میں متداول چلی آتی ہے اور بچے اسے بڑے شوق سے سنتے ہیں لیکن مسٹر ایل ڈیمز کا بیان اس سے قدرے مختلف ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

''بادشاہ نے ان لڑکوں کو تو واپس کر دیا لیکن خود ان کے تعاقب میں کیچ مکران کی طرف روانہ ہوا جہاں اسے بلوچوں کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ سوائے ایک نظم کے جو بلوچوں میں ''دفتر'' (تاریخ یا شجرہ) سے موسوم ہے ہمارے پاس کوئی ایسا مستند شعری یا نثری مواد نہیں جس سے میر جلال خان سے قبل کے حالات پر روشنی پڑ سکے اور نظم بھی امتداد زمانہ کے سبب مسخ ہو چکی ہے۔ اس کے دو حصے ہیں پہلا حصہ جس میں بلوچوں کی حلب سے آمد اور سیستان میں بدرالدین سے متصادم ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ وہ چودھویں صدی کا معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا حصہ جس میں میر چاکر اور میر گواہرام کا حال ملتا ہے یہ محض الحاقی ہے جسے تیرھویں صدی کے کسی شاعر نے شامل کر دیا ہے۔ بہر حال اس نظم کو جو نفس مضمون کے اعتبار سے تمام بلوچی نظموں میں منفرد ہے اولیت کا درجہ دیا گیا اور ہر مؤرخ نے بلوچ قوم پر قلم اٹھانے سے پہلے اسے ''قدیمی ماخذ'' کے طور پر قبول کیا ہے۔ ہم اس کے اشعار اپنے اپنے مواقع پر درج کریں گے۔ سردست اتنا حصہ لیتے ہیں جو ہمارے زیر بحث مضمون سے متعلق ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ:۔

شکر اللہ حمد گزاراں	''اللہ کا شکر کرتا ہوں اور اسی کی حمد بیان کرتا ہوں۔ وہی اس جہان کا مالک ہے!
بادشاہ ملکئے وتیں	
تی جہان حاخ وگل بی	یہ دنیا خاک اور مٹی ہو جائے گی

وت کوشتی (نندی) وھش ولا صرف اللہ کا نام قائم رہے گا

مامرید وں یا علی ئے ہم حضرت علیؓ کے مرید ہیں

دین وایمان شیوتیں ہمارا دین و ایمان محفوظ و مضبوط ہے

امتوں پاکیں نہ دی اے ہم (بلوچ) پاک نبی کی امت ہیں

کہ جہانے ، واثہ ہیں جو جہان کا والی ہے

اولاد میریں حمزہ ئے غوں ہم بلوچ میر حمزہؓ اے کی اولاد ہیں

صوب درگاہا گور دیں اور فتح ہمارے نصیب میں آئی ہے

اژ حلبا پھاد کایوں ہم ملک حلب سے آئے ہیں

گوں یزید اجھیڑ ہ ویں اور یزید کے ساتھ ہماری جنگیں رہی ہیں

کلبلا، بھمپور، نیاما واقعہ کربلا کے بعد ہم بھمبور پہنچے

(اے بلوچوں کا ایک قافلہ حمص سے جبال قفص آیا تھا اور وہ حمصوی کہلاتا تھا۔ امتدادِ زمانہ سے یالسانی تغیرات سے یہ لفظ ''حمزوی'' بن گیا۔ پھر یاروں نے حمزوی سے حمزئی بنالیا اور لفظ حمزئی سے انہوں نے سیدنا امیر حمزہ سے نسبی تعلق جوڑ لیا۔ اسی طرح چاکر اعظم کے پوتے میر حمزہ گزرے ہیں ان کی اولاد بھی حمزئی کہلاتی ہے کچھ عرصہ بعد لوگوں نے کم علمی کی بنا پر میر حمزہ بن چاکر کو امیر حمزہ بن عبدالمطلب سمجھ لیا اور شاعروں نے اسے حقیقت جان کر نظمالیا۔ اس شعر سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ دفتر اشعار میر حمزہ بن چاکر کے کافی عرصہ بعد موزوں کیا گیا ہے اور ناظم ڈیرہ جات کا باشندہ معلوم ہوتا ہے۔)

شہر سیستان منزلیں اور وہاں سے ہماری اگلی منزل علاقہ سیستان تھا

بادشاہ ے شمس الدین نیں یہاں کا بادشاہ شمس الدین تھا

گوں بلوچاں خاطریں جس کا بلوچوں کے ساتھ برتاؤ دوستانہ تھا

نی کہ بدرالدین درآتکا جب بدرالدین تخت پر بیٹھا

ناغمانی ، شد تیں اس نے اچانک بلوچوں کے ساتھ دشمنی مول لی

مے سرا میریں جلالھاں ہم تمام بلوچوں کا سردار میر جلال خان تھا
گوں چل وچھاریں بولکاں جن کے ماتحت چوالیس ۴۴ قبیلے تھے
کاتکوں ھاریں بندر ہم سیستان سے کوچ کر کے حاریں بندرگاہ پہنچے
کیچ راستیں پلہ وا اے جو علاقہ کیچ کے دائیں طرف واقع ہے!

(اے اس سے آگے کے اشعار بلوچوں کی تیسری مہاجرت سے متعلق ہیں جو میر شیہک اور میر چاکر خان کی زیر قیادت عمل میں آئی تھی۔ یہ شعر اس حقیقت کی تائید کرتا ہے۔)

سیم جوتھاں بہر کھتاناں کل سی مار شہکی

یعنی جو ملک اور ندیاں بلوچوں کے قبضے میں آئیں انہوں نے آپس میں تقسیم کر لیں۔ اس وقت کل قوم کا سردار میر شیہک تھا۔

ان اشعار کا ملخص یہ ہے کہ جب بلوچوں نے سیستان کو چھوڑا وہ چوالیس پاڑوں پر مشتمل تھے اور ان کا سردار میر جلال خان تھا۔ یہ سیستان سے "ہارین بند" آئے جو ملک کیچ کے دائیں جانب (مکران کے مشرق میں) واقع تھا۔

اب ہم بلوچ قبائل کو چھوڑ کر ملک مکران کا جائزہ لیتے ہیں کہ اس کا نام مکران کیوں پڑا؟ اس میں بلوچوں کی آمد سے پہلے کون لوگ آباد تھے۔ یہ ملک کن کن حوادث سے دوچار رہا؟ بلوچوں کی آمد سے اس کی صنعتی تجارتی اور زرعی حیثیت پر کیا اثر پڑا؟

اِلی اللہ التوفیق ط

مکران

زمانہ ماقبل تاریخ سے مشائخ ہنکار کے دور تک

O

مکران کی موجودہ حیثیت بلوچستان کے ایک ڈویژن کی رہ گئی ہے لیکن قدیم زمانے میں یہ ایک بڑی سلطنت تھی۔ "کتابچہ ایران" لکھتا ہے کہ:۔

"مکران مملکتے است وسیع کہ پایۂ تخت آں بمپور است آہالی آں بزبان مخصوص حرفے مے زنند کہ آں بلوچی است ورستم کہ درشاہنامہ معروف است ازہمیں دیار بود"

"مکران ایک وسیع مملکت ہے اس کا پایہ تخت بمپور ہے۔ یہاں کے لوگ ایک مخصوص زبان بولتے ہیں جو بلوچی کہلاتی ہے۔رستم جو شاہنامہ میں مشہور ہے اسی ملک کا باشندہ تھا۔"

معجم البلدان میں قدیم مکران کا حدود اربعہ اس طرح سے درج ہے:

هَذالولایۃِ بَین کِرمان من غربیھا و سجستان شمالیھا و البحر جنوبیھا و الھندفی شرقیھا!

"اس ولایت کے شمال میں سیستان، جنوب میں بحر عرب، مشرق میں ہندوستان (متحدہ پاک و ہند) اور مغرب میں کرمان ہے!"

یہ وسعت بھی ۶۲۶ھ کی ہے۔اس سے پہلے دریائے سندھ سے خلیج العرب اور قندھار سے بحیرہ عرب تک مکران ہی مکران تھا!

وجہ تسمیہ

مکران کی وجہ تسمیہ معلوم کرنے میں بہت سے حضرات نے فکر آزمائیاں کی ہیں۔جناب عنقا کے نزدیک مکران "مک" اور "ران" کا مرکب ہے۔یعنی کھجوروں کا ملک، عرب اسے

''ماکران'' سے موسوم کرتے رہے۔ ایرانی ''ماہی خوران'' اور دوسرے مؤرخین نے موکرایا، مکین یا مکاران کا نام دیا ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ اس ملک کا نام جناب مکران کے نام پر پڑا ہے۔ جیسے سام، حام، یافث اور کرمان اسم ذات ہیں اور ہم نے ان کے معانی و مطالب معلوم کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اسی طرح مکران بھی مکران ہے۔ معنی و مطالب کے لحاظ سے اس میں غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

چنانچہ صاحب معجم البلدان لکھتے ہیں کہ:

قَال اَهل الَسیر سمَیت مَکران بَمکران بِن فَارک بِن سام بِن نُوح علیه السلام اخی کرمان لانه نزلها و استر طنها لماتبلیکت الالسن فی بابل۔

''مؤرخین نے کہا ہے کہ سرزمین مکران کا نام ''مکران'' اس وجہ سے رکھا گیا ہے کہ اس میں جناب کرمان کے بھائی جناب مکران بن فارک بن سام بن نوح نے فروکش ہو کر اسے اپنا وطن بنایا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جبکہ تمام اقوام اختلاف السنہ کے سبب بابل سے منتشر ہو کر نکلی تھیں۔ معجم البلدان کا دیا ہوا نسب تامہ مجمل ہے۔ ہم ذیل میں طبقات ابن سعد کا شجرہ درج کرتے ہیں جس سے جناب مکران اور حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے رشتے پر روشنی پڑتی ہے اور یہ امر محتاج بیان نہیں رہتا کہ جناب مکران حضرت خلیل اللہ کے دادا بزرگوار جناب ناحور کے معاصر اور قریبی رشتہ دار تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور جناب مکران کا نسب نامہ

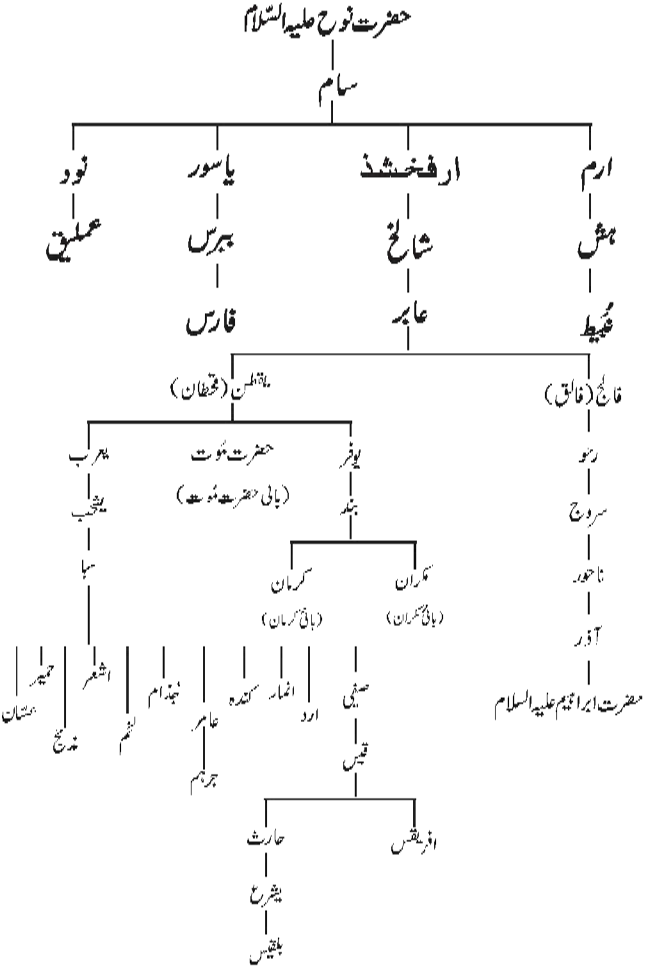

شجرہ سے ظاہر ہے کہ جناب ناحور جدامجد حضرت خلیل اللہ جناب مکران، جناب کرمان اور جناب عبدالشمس سبا، چاروں حضرات کے معاصر ہیں۔ یہ ماقبل تاریخ کا زمانہ ہے۔اس لئے ہم

تفصیل میں جانے سے قاصر ہیں۔ الہامی کتب سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ اولاد نوح کے درمیان زمین کی تقسیم فالج بن عابر نے کی تھی۔ (جب خداوند کریم نے چاہا کہ اس دنیا کو آباد کرے۔ نوح علیہ السلام کی اولاد کو اکنافِ عالم میں پھیلائے تو راتوں رات بابل میں رہنے والی اقوام کی زبانیں بدل دیں۔ طبقات) اس لئے وہ فالق بمعنی تقسیم کنندہ مشہور ہوئے۔ بابل سے نکل کر بنی سام نے سرزمین نجد و حجاز میں قیام کیا۔ یہی وہ قوم ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پیغمبری و نبوت، کتاب و شریعت اور حسن و جمال سے سرفراز فرمایا۔ جونہی اولاد نوح اپنے اپنے اقطاع کو روانہ ہونے لگی تو حکیم مطلق نے ان کی زبانیں بدل دیں۔ شام کو زبان سریانی تھی۔ مگر صبح کو اٹھے تو ایک کی زبان کو دوسرا نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس لئے گروہ در گروہ مختلف اطراف کو نکل گئے۔ دراصل یہ لسانی جتھا بندی تھی۔ آل سام کو اٹھارہ زبانیں عطا ہوئیں۔ اسی طرح حامی قبائل بھی لسانی اعتبار سے اٹھارہ گروہوں میں بٹ گئے۔ آل یافث کو چھتیس زبانیں مرحمت ہوئیں۔ عاد، عبیل، ثمود، ، جدلیس، عملیق، طسم، اہیم اور آل قحطان کو عربی زبان سے سرفراز فرمایا۔

بنی قحطان

جناب عابر کے دو صاحبزادے تھے۔ ایک فالج تھے جن کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ ان کی پانچویں پشت میں حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے۔ دوسرے یقطن یا قحطان تھے۔ جن کی تیسری پشت میں مکران اور کرمان پیدا ہوئے۔ جناب سبا بھی حضرت مکران کے چچا زاد بھائی تھے۔ جن کی سعی مشکور نے یمن اور مآرب کو رشک فردوس بنا دیا۔ جناب سبا کی آٹھویں پشت میں ملکہ بلقیس پیدا ہوئیں۔ جو بمقام بیت المقدس حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئی تھیں۔

سبا کے فرزندوں میں حمیر اور انمار زیادہ مشہور ہیں۔ یمن کے حمیری پتھر کے بند بنانے میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ انمار ملک گیری میں بڑھ گئے۔ عراق کا ایک خطہ اب تک ان سے موسوم

ہے اور نمر کہلاتا ہے۔

مکران اعظم اور عظیم مکران

اگرچہ ہمارے پاس تاریخی اسناد کا فقدان ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ جناب مکران جب بابل سے روانہ ہوئے تو انہوں نے ابتداً کس مقام کو اپنی اقامت کا شرف وافتخار بخشا لیکن مکران کے آثار قدیمہ جگہ جگہ زبان بے زبانی سے عہد ماضیہ کی تاریخ دہراتے نظر آتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ پنجگور میں کونسی تاریخ ساز شخصیتیں محو خواب ہیں۔ تربت کو تربت کیوں کہتے ہیں۔ خلیج فارس سے خاران تک جو فنیقی گول گنبد ملتے ہیں اپنے اندر کیا اسرار رکھتے ہیں۔ خاران کے جس مقبرے سے قیمتی اسباب قالین اور کچھ خزانہ برآمد ہوا تھا وہ کس ''رجل عظیم'' کا مدفن تھا۔ نیز خلیج فارس کے سواحل اور بلوچستان میں جو مربع گنبد کھڑے حیرت سے ایک ایک کا منہ تک رہے ہیں ان میں کن سورماؤں کی ہڈیاں دفن ہیں۔ اسی طرح منگھو پیر اور ٹھٹھہ روڈ پر جو حجری قبور ملتی ہیں یہ اپنے اندر کتنی بڑی شخصیتیں امانت لئے پڑی ہیں۔ قلات، لس بیلہ، کیچ، مستونگ، سبی خاران، موہنجوداڑ و اور سہوان کے گرد وپیش جو کھنڈرات ملتے ہیں وہ کس تمدن کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس لئے ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آل مکران کافی متمدن تھی اور معیاری زندگی بسر کرتی تھی۔ نیز یہ امر بھی متیقن ہے کہ لسانی تقسیم کے وقت جناب مکران بھی کوئی زبان لائے ہوں گے۔ وہ زبان اس سرزمین میں کتنے عرصے تک رائج رہی۔ اس پر بیرونی حملہ آوروں کا کیا اثر پڑا۔ اس نے زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ کتنے رسم الخط تبدیل کئے۔ یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر بحث کرنے کا یہ مقام نہیں!

یمن کی سدا بہار وادی

مکران کی سرسبزی اور شادابی کا اندازہ لگانے کے لئے ہمیں اس کے ملحقہ مما لک کا جائزہ لینا پڑے گا مکران یوفر کی اولاد کا گہوارہ تھا اور حضرموت وسبا اس کے بھائیوں اور بھتیجوں کا مسکن

تھا۔ تمام مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ جنوبی عرب نہایت دولت مند تھا۔ ہیروڈٹس (Herodotos) یونان کا سب سے پہلا مورخ ہے اور ابوالتواریخ کہلاتا ہے۔ (المتولد ۴۸۲ھ المتوفی ۴۰۸ ق م) اس نے اپنے زمانہ شباب میں ایشیائے کوچک، مصر، فلسطین، ٹونیشیاء، بابل اور سوسہ کا سفر کیا تھا، سٹریبو (سٹریبو Strabo) پرانے زمانے کا جغرافیہ دان ہے اور پلینی (Pliny) (المتولد ۶۰ھ اس کے خطوط بہت مشہور ہیں۔ مستند مؤرخ ہے) اپنی تحریروں میں اس کو دنیا بھر میں زیادہ دولت مند ملک لکھتے ہیں۔ اس کے زرعی ذرائع اس کی خوشحالی کا اصل سبب تھے۔ یہ زراعت اس کے محیر العقول طریقہ آبپاشی کا نتیجہ تھی۔ جس سے سینکڑوں میل تک کی اراضی سیراب ہوتی تھی۔ اس کی ندیوں کے کناروں پر بہت بڑی مضبوط دیوار بنا کر بند باندھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک تالاب کا رقبہ اٹھارمربع میل تھا۔ اس کا عمق ۱۲۰ افٹ تھا۔ اس تالاب میں نفت اور چونا گچ سے پتھر جوڑے گئے تھے اور انہیں لوہے کی سلاخیں لگا کر مضبوط کیا گیا تھا۔ اس تالاب کے علاوہ اور بہت سے چھوٹے چھوٹے تالاب تھے جو پہاڑوں سے آئے ہوئے پانی کو جمع رکھتے تھے۔ تقسیم آب کے لئے منضبط تھے۔ مآرب جو اس ملک کا دارالسلطنت تھا ایک بہت بڑے سدا بہار علاقے میں واقع تھا۔ اس علاقے کی سڑکوں پر دوطرفہ طویل باغات تھے۔ جن کے درختوں کی شاخیں ایک دوسرے کے مقابل درختوں سے ملی ہوئی تھیں۔ تمام سڑک ان کی وجہ سے ایک مستقل و مسلسل سبز محراب معلوم ہوتی تھی۔ ان کی وسعت کی یہ کیفیت تھی کہ ایک اسپ سوار دو ماہ کامل اسی کیفیت کے ساتھ شاہان سبا کے ملک میں سفر کرسکتا تھا۔ حضرت موت اس سدا بہار سے متصل تھا اور خلیج العرب کے دائیں ساحل سے مکران کا ملک شروع ہوتا تھا۔ آج جو خطہ ایرانی بلوچستان کہلاتا ہے قدیم مکران کا ہی حصہ تھا۔

مکران کے گربند

یہ نہایت ہی ناممکن بات ہے کہ خلیج العرب کی بائیں جانب تو ایک قوم ترقی کے اتنے مراحل طے کر لے لیکن اس کی دائیں جانب اسی قوم کا ایک ممتاز حصہ اپنے بھائی کی صلاحیتوں اور ترقی کی منزلوں سے یکسر محروم رہے۔ مکران قدیم کے آثار قدیمہ اس امر کا زندہ ثبوت ہیں کہ آل مکران بھی آل سبا کی طرح اپنے ملک کو جنت ارضی بنانے میں بڑی تندہی سے مصروف تھی۔ یہ ملک بھی وادی سبا کی طرح تالابوں اور کاریزوں سے برابر سیراب ہو رہا تھا۔ خاران، کیچ، قلات اور مستونگ تک کے تمام علاقے رشک گلزار بنے ہوئے تھے۔

مشہور سیاح ویگرن برگ لکھتا ہے کہ میں نے خاران کے پہاڑوں میں بعض ایسے دلچسپ آثار دیکھے ہیں جو آج سے بالکل مختلف معاشرتی حالات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ خاران کے گردونواح کی تمام وادیوں میں ہزاروں سنگین دیواریں نظر آتی ہیں۔ جنہیں گربند، یا آتش پرستوں کے بند کہتے ہیں۔ ان بندوں کی ساخت اور ہیت سے یہ بات ظاہر ہے کہ جن مقامات پر بند تعمیر کئے گئے تھے وہاں یقیناً آب جو یا ندی نالے تھے۔ پانی کی گزرگاہوں کا ثبوت بجری سے ملتا ہے جو بلوچستان کے تمام دریاؤں اور ندیوں کی تلہٹی میں پائی جاتی ہے۔

(بلوچی دنیا ماہ دسمبر ۱۹۶۳ء، ۱۹۶۴ء۔ خاران کے عجائبات بلوچی دنیا، اگست ۱۹۶۰ء)

ایک اور صاحب درہ بولان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کرتہ گاؤں کے شمال میں کچھ فاصلے پر بڑے بڑے تودے دور تک قطاریں چلے گئے ہیں۔ مقامی روایت ہے کہ یہ کاریز کے نشانات ہیں اس کے علاوہ بی بی نانی سے کوئی چھ میل دور غائب پیر کے چشمہ سے جو اینٹیں وغیرہ ملی ہیں۔ ان کی ساخت سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں یہاں کوئی بہت زیادہ مہذب قوم آباد رہی ہے۔

میر رحیم داد خان مولائی شیدائی بھی اسی نظریہ کے مؤید ہیں کہ ان بندوں کا گبروں یا آتش پرستوں سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی یہ کاؤس یا کیخسرو کے رہین منت ہیں۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں کہ:

"یمن کی حمیری، وادیوں کے درمیان پتھر کے بند تعمیر کرنے کے ماہر تھے۔ جب یمن کا سدمآرب سیل عرم سے ٹوٹ گیا تو حمیری مکران کی طرف متوجہ ہوئے اور یمن کی طرح اس ملک میں بھی انہوں نے پتھروں کی بڑی دیواریں تعمیر کیں۔ جن کا سلسلہ مکران و سندھ کے کوہ کیرتھر سے لے کر خاران تک موجود ہے۔ بلوچ ان کو غلط فہمی سے آتش پرستوں کی تعمیر سمجھتے اور گربند سے موسوم کرتے ہیں۔ مگر کرنل سر تھامس ہالڈچ نائب صدر رائل جغرافیکل سوسائٹی کا بیان ہے کہ یہ حمیری ساخت کے ہیں"۔

(R.Hughes Buller Imperial gazetteer India Vol.Balochistan Ch.Archeology Colcutta 1908.)

مکران کے قدیم آثار پر بھی جو کتبے کندہ ہیں وہ زیادہ تر کوفی خط میں ہیں۔ لیکن جھلاوان کے گاؤں پندران کے قریب جو کتبہ کپتان کک نے معلوم کیا ہے وہ حمیری خط میں ہے اور ہر لفظ پانچ فٹ کی لمبائی میں ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:۔

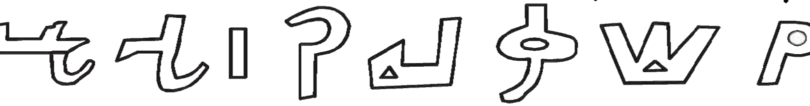

(شیدائی صاحب کی تحقیق کے مطابق قحطانی بلوچ انہی حمیریوں کی یادگار ہیں)

(بلوچی دنیا، ماہ جون ۱۹۵۹ء ص ۳۴)

یمن کے حمیری غلاموں کا بیوپار بھی کرتے تھے چونکہ حبش ان کے قریب تھا۔ اس وقت مکران کے گڈھ، درزادہ، نقیب اور قلات کے خانہ زاد جو زیادہ تر مزدوری اور بلوچ سرداروں کی چاکری کرتے ہیں دراصل حبشی نسل سے ہیں۔ پھر جب مقامی لوگوں سے ان کا رشتہ ہوا اور اس خون

کی آمیزش سے جونسل پیدا ہوئی وہ ''گڈھ'' کہلائی لیکن جسمانی بناوٹ کے لحاظ سے وہ حبشی ہیں۔
اسی طرح آرامی، سامی جہازران فنیقی قوم کے مقبرے سے جو خلیج العرب سے خاران تک پھیلے ہوئے ہیں وہ چوکور اور گنبد نما ہیں اور ان کی دیواروں پر شیر، طاؤس اور انسانی اعضاء کی تصویریں نمایاں ہیں۔ خاران کے ایک مقبرے سے کسی درویش کو قالین اور کچھ خزانہ ہاتھ لگا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مصریوں کی طرح ان کا بھی عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد انسانی روح کو اس کی روزمرہ کی چیزوں کی ضرورت رہتی ہے۔ اسی لئے وہ ان چیزوں کو لاشوں کے ساتھ دفن کر دیتے تھے ان کا خط آرامی، مصری خط برابی کا نمونہ ہے۔ یونان کی شمع بھی اسی قوم کے خط سے روشن ہوئی تھی۔
ہم ذیل میں ایک فنیقی گبند کی قلمی تصویر پیش کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوگا کہ ان کے بعض مقبرے گول گنبد دار ہیں جو مقبرے خلیج العرب کے ساحل اور بلوچستان میں ہیں وہ مربع نمونے کے ہیں۔

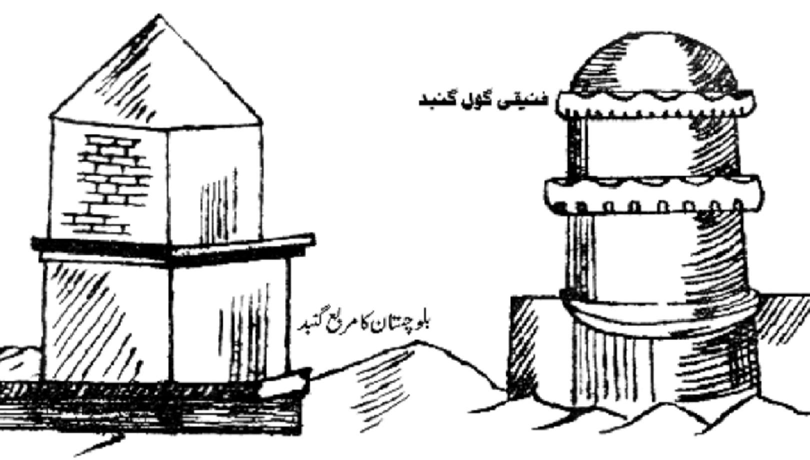

جناب شیدائی نے سبا کے آخری دور کو لیا ہے اور اس ملک میں زرعی ترقیات کا جو کام عبدالشمس سبا کے دور میں ہوا تھا اسے حمیریوں سے منسوب کر دیا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام

۹۵۰ ق م میں تھے اور بلقیس کی حضرت سے معاصرت قرآن مجید سے ثابت ہے۔ ہمارا مؤقف یہ ہے کہ مکران کی کاریز اور بندوں کی تعمیر کا زمانہ بھی یہی مشخص کیا جا سکتا ہے۔

مولانا عبداللہ دیرمانی لکھتے ہیں کہ ان بندوں کا کاؤسی یا خسروی کاریزوں سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ ایرانیوں نے کبھی مکران میں رہ کر حکمرانی اور تعمیری کام نہیں کیا۔ وہ آندھی کی طرح آتے اور لوٹ مار کر بگولے کی طرح چلے جاتے تھے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ لفظ گربند کا صحیح تلفظ ''گِربند'' ہے اور ''گِربند'' کے معنی بلوچی زبان میں حد، رکاوٹ اور چٹان کے ہیں۔ دشوار گزار راستہ اور تنگ چٹانوں والی گھاٹی کو بھی ''گر'' کہتے ہیں۔ چنانچہ دو پہاڑوں کے درمیان گھاٹی کے اوپر جا کر جہاں راستہ چٹانوں کی وجہ سے رُک جاتا ہے اور دشوار گزار نا قابل عبور بن جاتا ہے تو بلوچی میں کہتے ہیں کہ : ''شیبءِ گر کتِ''۔

اب بھی پہاڑی علاقے میں دو پہاڑوں کے درمیان جہاں راستہ تنگ ہو جاتا ہے بلوچ وہاں بڑے بڑے پتھر اور چٹانیں رکھ کر بند باندھ دیتے ہیں۔ پہاڑی اور سطوح مرتفع سے مٹی ڈھل کر بہتی ہوئی اس بند کے پاس رک جاتی ہے اور نہایت زرخیز بن جاتی ہے۔ اس بند کو بلوچی میں ''گِربند'' کہتے ہیں اور اس طریقے سے جو زمین وجود میں آتی ہے۔ اسے ''ہوشاپ'' کہتے ہیں۔

(استفادہ از مقالہ ''بلوچستان کے گربند'' مولانا عبداللہ دیرمانی، بلوچی دنیا فروری ۱۹۶۴ء ص ۳۹)

بلاشبہ حمیریوں کے دور کو بڑا فروغ حاصل ہوا اور وہ ہندوستان سے افریقہ تک تمام تجارتی منڈیوں پر چھا گئے تھے۔ کچھ حمیری کتبے جو حال ہی میں پڑھے گئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ عرب کے شمالی ساحل سے کنعانی پٹ پٹا کر آئے اور ان میں مدغم ہو گئے۔ یونانی اس گروہ کو ''فنیقی'' اور عرب ''عادارم'' کہتے ہیں۔ یہ موجودہ مغربی اقوام کی طرح زبردست جہازران تاجر قوم تھی۔ فلسطین کے ساحل پر عبیدا اور صوران کے مشہور تجارتی شہر تھے۔ جب ''سدمآرب'' ''سیل عرم'' کی نذر ہو گیا اور یمن کا سدابہار خطہ اجڑ گیا تو انہوں نے مکران کا رخ کیا۔ کچھ خاندان

خلیج العرب کے ساحل پر رہ پڑے اور کئی خاران تک اس ملک میں بڑھتے چلے آئے۔ انہوں نے بندوں اور کاریزوں میں مزید اضافہ کیا۔ جگہ جگہ تجارتی کوٹھیاں قائم کیں۔ یہاں تک کہ ان کا یہ تجارتی سلسلہ باربائیک (بھنبور) اور پٹالہ تک پھیل گیا۔ اس قوم نے یہاں سامی خط رائج کیا تھا۔ (بلوچی دنیا، جون ۱۹۵۹ء ص ۵۴)

تاریخیں ہمیں بتاتی ہیں کہ کئی قومیں گروہ در گروہ مکران میں داخل ہوئیں اور اپنے نقوش چھوڑتی آگے نکل گئیں۔ بنارس یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر پران ناتھ کا دعوی ہے کہ برہمنوں کا فرقہ مصر سے آیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ۱۴ سو ق م تھیبس (طب) کے فراعنہ میں سے رامیس ثانی نے مکران اور ہند تک حملے کئے تھے اور اسیرز نے گنگا تک ملک فتح کرلیا تھا۔ برہمن انہی حملہ آوروں کی باقیات سے ہیں۔

۲۰۰ ق م کے اشور کے فرمانروا نینوس اور اس کی بہادر ملکہ سیمی رامس نے اس ملک پر حملے کئے۔ مگر مکران کے حاکم بروہیٹس نے انہیں نہ صرف شکست دی بلکہ ان کے لئے لشکر کا بچا لے جانا مشکل ہو گیا اور صرف بیس سپاہی واپس لے جاسکی۔ بقیہ سب کے سب ریت کے تودوں میں پھنس کر گرمی اور پیاس سے مر گئے۔

۵۵۰ ق م خورش اعظم (ذوالقرنین) نے وادئ سندھ تک کے تمام علاقے فتح کر کے اپنی حکومت میں شامل کر لئے۔ اس کے بعد رسمی طور پر اس کے جانشینوں اور ہنحامنشی خاندان کے دوسرے بادشاہوں کی مکران پر سیادت قائم رہی۔ شاہنامہ میں مکران پر ساسانی سلاطین کے حملے کی روئیداد درج ہے اور مکران کی جنگ کا اس نے ایک خاص عنوان قائم کیا ہے۔ فردوسی کے ایک مصرعہ (کہ مکراں سیاہ شدز گرد سپاہ) سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ مکران خاصی طاقت کا مالک تھا کہ اس کے مقابلے میں کیخسرو کو اتنی بڑی تعداد میں فوج بھیجنی پڑی کہ سپاہ کی گرد سے مکران دھواں دھار ہو گیا۔

کیخسرو کے بعد جس سورما نے مکران کو توجہ کا مرکز بنایا وہ اسفندیار کا بیٹا بہمن تھا۔ اس کی موت تربت کے قریب واقع ہوئی تھی۔ سکندر اعظم کو جب معلوم ہوا کہ مکران کا سفر دشوار گزار ہے اور ملکہ سیمی رامس صرف بیس سپاہی زندہ بچا کر لے گئی تھی نیز خورش اعظم بمشکل سات نفوس اس علاقے سے زندہ بچا لے جا سکا تھا اس کے دل میں اس راستے سے سفر کرنے کا ولولہ پیدا ہوا۔ بلاشبہ راستہ بے حد خراب تھا اور اہل مکران نے بھی تنگ کرنے میں کوئی کمی نہ چھوڑی لیکن سکندر آخر سکندر تھا۔ اپنی پوری فوج کو لئے ہوئے بمپور پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ یونانی مؤرخین کا کہنا ہے کہ فاتح اعظم کو گدروشیاء کے علاقے میں سخت صعوبتیں برداشت کرنی پڑی تھیں۔ آرین کے نزدیک گدروشیا وہ علاقہ ہے جو اوریٹا (لس بیلہ) اور کرمانیہ (کرمان) کے وسط میں واقع ہے۔ سکندر اعظم کے بعد سلیوکس نے بابل کی مرکزی حکومت پر قبضہ کیا۔ مکران بھی اس کے مقبوضات میں شامل تھا۔ ۳۰۵ ق م میں جب سلیوکس نے اپنی بیٹی کی شادی چندر گپت سے کی تو جہیز میں مال و اسباب کے علاوہ مکران اور دوسرے چند علاقوں سے دست کش ہو گیا۔ راجہ چندر گپت کے پانچ سو برس بعد سندھ کے حکمران شیر ماہ نے جب اپنی لڑکی کی شادی بہرام گور سے کی تو مکران کا صوبہ اس کے جہیز میں دے دیا اس طرح مکران ایک دفعہ پھر ایرانی شہنشاہیت کا حصہ بن گیا۔

بلوچ مکران میں

بلوچ مکران میں کب آئے؟ یہ مسئلہ متنازعہ فیہ ہے۔ بلوچوں کے ایک مکتب فکر کا دعویٰ ہے کہ بلوچ باہر سے نہیں آئے بلکہ قدیم سے مکران کی سرزمین میں آباد چلے آتے ہیں اور جناب مکران کی اولاد ہیں اور بلوچی وہی زبان ہے جو جناب مکران اپنے ہمراہ بابل سے لائے تھے۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حمیری اور فنیقی دور میں یہ زبان نہیں تھی۔ خاران کے مقبروں اور گنبدوں پر جو کتبے ملتے ہیں وہ کسی دوسری زبان کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ایک دور اس

ملک میں ایسا گزر چکا ہے کہ اس کے طول وعرض میں سامی خط کا سکہ چلتا تھا۔ بعض کتبے آرامی مصری میں ملتے ہیں۔ لس بیلہ، جھالاوان اور برہمن آباد کے کتبے ہندی پالی میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ کتبے اسی زبان میں تحریر کئے جاتے ہیں جو اس ملک میں مروج ہو جسے عوام سمجھ سکتے ہوں ورنہ کتبے کی غرض وغایت مفقود ہو جاتی ہے۔ باقی رہا بلوچ قوم کا معاملہ۔ اس کا سرچشمہ کوئی ایک خاندان نہیں۔ کئی قبیلے عرب سے وادی بلوص آئے اور پھر بلوص سے بلوچ بن کر کوہ البرز سے گدروشیا تک پھیل گئے۔ ان کی بے پناہ شجاعت، حمیت اور فیاضی سے اثر پذیر ہو کر بے شمار مقامی قبائل بھی ان میں مدغم ہو گئے۔ جیسا کہ شیدائی صاحب لکھتے ہیں کہ مینگل دراصل منگول ہیں اور قحطانی بلوچ حمیری عرب ہیں۔ (بلوچی دنیا جون ۵۹ء ص ۳۴ کالم ۲)

شط العرب کے اطراف میں کلدیہ والوں کی آبادیاں تھیں۔ اُر، ارخ، پنور، اغادان کی تجارت کے زبردست مراکز تھے۔ مکران اور پنجاب تک ان کی آزادانہ آمدورفت اور تجارت ہوتی تھی۔ ریاست عمان، عمان بن قحطان سے منسوب ہے۔ میر رحیم داد خان صاحب مولائی شیدائی کے نزدیک مکران کے بُراور کلمتی اس خطہ کے رہنے والے ہیں اور قرامطی بحرین یا الاحسار سے آئے ہیں۔

(بلوچی دنیا ص ۶ ۳ جون ۱۹۵۹ء)

لیکن مولانا دیر مانی کو شیدائی کے اس نظریے سے اتفاق نہیں۔ ان کی تحقیق کے مطابق کلمتی مکران کے ہوت ہیں۔ ان کا الاحساء یا بحرین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

شیدائی صاحب کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اسلام سے بہت عرصہ پہلے بنو حاجرہ کے قریش قبائل عرب کے صحراء سے نکل کر عراق، عجم، ایلم، گیلان، مزندران، فارس، کرمان، مکران، سیستان، خراسان اور صغدانیہ (وسط ایشیاء) تک پھیل گئے تھے اور وہاں کی عورتوں سے شادیاں کر کے صغدی اور ایرانی بن گئے لیکن ہر حالت میں رہتے ہوئے بھی وہ قریشی کہلاتے رہے۔ مگر اس وقت زمانہ ان پر آریائی اور ڈروڈیت کا لیبل چسپاں کرنا چاہتا ہے لیکن ان کے چہرے، مہرے،

لباس اور زلفیں بتاتی ہیں کہ یہ لوگ صحرائے عرب کے بانکے جوان ہیں جنہوں نے اپنے زور بازو سے قیصر و کسریٰ کے تاجوں کو پاؤں تلے روند ڈالا تھا اور سلطنتوں کی بساط کا الٹ دینا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ طبقہ متقدمین سے متاخرین تک ہمارے جتنے شعراء کرام گزرے ہیں وہ برابر اعلان کرتے رہے ہیں کہ ہم عرب ہیں اور حجازی میروں کی اولاد ہیں۔ ایران کے شعراء میں ابونواس الھرزیامی، عباس الحنف اور بشّشر نسلاً قریش تھے۔ جیسا کہ بشّشر کہتا ہے:۔

نمی فِی الکِرام بَنِی عَامر

فَروعُی واَصلی قُریش العَجم

''میری شاخیں بنو عامر کے قبیلہ سے ہیں اور میری نسل ایران کے قریش سے ہے!''

اسی طرح ابن قتیبہ نے الخریامی کا شعر دیا ہے۔

اِنی امَرء منَ سراۃ الصغد الیسنی

عِراق الاَعاجِم جلداطَیّب الخِیر

''میں امرائے صغد میں سے ہوں اور میرے جداعلیٰ نے مجھے عزت کی چمڑی پہنائی ہے''۔

(Broume.e.Literary History of Persia Vol.1 P 266-1902)

بہرحال بلوچ عرب تھے اور اپنی بہادرانہ اور جنگجویانہ طبیعت کے سبب کہیں ٹک کر نہ رہے نوشیرواں کے دور میں ان کا اثر و نفوذ اتنا بڑھ گیا کہ شہنشاہ کو خود ان کیخلاف اپنی پوری طاقت کے ساتھ نکلنا پڑا۔ بلاشبہ یہ دور بلوچوں کے لئے انتہائی صبر آزما تھا۔ لاکھوں رزم آزما جوان ساسانی تلوار کی بھینٹ چڑھ گئے۔ بظاہر اس وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ بلوچ ختم ہو گئے۔ مگر ساٹھ سال بعد بلوچ پھر منظر عام پر آ گئے اور کرمان سے مکران تک ان کا طوطی بولنے لگا۔ خلافت فاروقی کے نویں سال یعنی ۲۲ھ میں جب مسلمانوں نے نصرت الٰہی سے ہمدان، دماوند، فارس اور خراسان کو فتح کرلیا تو اب صرف کرمان، سیستان اور مکران ہی باقی رہ گئے۔ ۲۳ھ میں اسلامی فوجیں گھٹا کی طرح

کرمان اور سیستان کی طرف بڑھیں اور مکران ربیع بن زیاد کے ہاتھوں فتح ہوا۔ مگر چونکہ حملہ آور اچھی طرح سے تسلط قائم کئے بغیر واپس چلے گئے تھے۔ اس لئے اہل مکران نے بہت جلد اطاعت کا جوا کندھے سے اتار پھینکا۔

۲۳ھ میں عبداللہ بن عامر بن ربیعہ نے مکران پر حملہ کیا۔ اہل مکران نے سندھ کے راجہ سے مدد مانگی۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ سندھی اور مکرانی دونوں فوجوں کو شکست ہوئی اور مسلمانوں کا پورے مکران پر قبضہ ہو گیا لیکن جونہی عبداللہ واپس لوٹے یہ مقامات بدستور سابق قبضے سے نکل گئے۔ اس لئے ان ممالک کو دوبارہ مسخر کرنے کے لئے ٹھوس انتظامات کئے گئے اور ہر ملک پر جدا فوج کشی ہوئی۔

کرمان اور سیستان کو فتح کرنے کے بعد حکم بن عمرو بن تغلبی نے مکران کا رخ کیا اور ابھی مکران کی سرحد پر پہنچا ہی تھا کہ شہاب بن مخارق اور سہیل بن عدی اور عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان، جو کرمان اور سیستان کی مہمات میں شاندار کامیابی حاصل کر چکے تھے ان کی کمک کو آپہنچے۔ دوین کے مقام پر پہنچ کر حکم نے اسلامی لشکر کو مرتب کیا۔ والی مکران راسل (راسل ناروئی قبیلے سے تھا اور رستم کی نسل سے تھا) نے نہر مکران (دریائے مکران یعنی رودخانہ، بمپور) کے کنارے بڑے اہتمام سے صف آرائی کی اور اہل سندھ کی امدادی فوج لے کر مقابلے پر آیا۔ بہادران اسلام نے بڑی خون ریز جنگ کے بعد راسل کو شکست دے کر مکران پر قبضہ کر لیا حکم بن عمرو تغلبی نے فتح نامہ مع خمس دربار خلافت کو ارسال کیا۔ خمس میں سات جنگی ہاتھی بھی شامل تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ راسل کے پاس باقاعدہ فوج اور جنگی ہاتھی بھی تھے۔

صحار بن عبدی جو فتح نامہ لے کر گئے تھے۔ اس سے حضرت فاروق اعظمؓ نے مکران کا حال پوچھا تو اس نے برجستہ عرض کیا:

"امیر المؤمنین! میں اس سرزمین کے حالات بچشم خود دیکھ کر اور دریافت کر کے حاضر ہوا

ہوں۔ وہاں پانی کی تو کمی ہے، مگر درخت میوہ جات سے لدے کھڑے ہیں۔ وہاں کا دشمن نہایت جری ہے۔ اگر تھوڑا لشکر بھیجا جائے تو اس بہادر قوم سے تاب مقابلہ نہ لا کر ضائع ہو جائے گا اور اگر زیادہ بھیجا جائے تو اس دشوار گزار ملک میں رسد کا پہنچانا مشکل ہو جائے گا۔ لہٰذا بھوکے مریں گے"۔

ابن خلدون نے صحار عبدیؓ کے بیان کا متن اس طرح سے نقل کیا ہے:

اَرضِ سَھلھا جبل و ماوھا وَشل و ثَمرھا وَقَل وَعدوَھا بطَل وَخَیرھا قَلیل و شَرھا طوَیل وَالکَثیر بھا قلیَل اِن قل الجیش فیھا ضاعر او ان کثروا جاعَرا۔

حضرت عمر نے فرمایا نے تم وہاں کے حالات بیان کر رہے ہو یا شاعری کر رہے ہو؟ جب صحارؓ نے سنجیدگی سے اپنے بیان کو دہرایا تو آپ فکر مند ہو گئے اور مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ فتوع البلدان کا بھی یہی بیان ہے کہ لیکن البلاذری اس واقعے کو حضرت عثمان رضی اللہ علیہ عنہ کے زمانے سے منسوب کرتا ہے جو کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں۔ اس کا بیان ہے کہ حکیم بن جبلہ عبدی نے حضرت ذی النورین کی خدمت میں یہ تقریر کی تھی۔ بلاذری کا یہ بیان اس لئے بھی صحیح نہیں کہ حکیم بن جبلہ عبدی کا نام خلافت عثمانیؓ کے مجاہدین میں بہت کم نظر آتا ہے۔ اس نے کوئی اولوالعزمی کا کام نہیں کیا۔ بلکہ اس کا شمار حضرت عثمانؓ کے مخالفوں میں کیا جاتا ہے۔ جب باغیوں نے خروج کر کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تو خروج کرنے والوں میں حکیم بن جبلہ عبدی بھی شامل تھا۔ ایسے شخص کے ہاتھ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لئے ایسی خدمت کا انجام پانا بہت مستبعد معلوم ہوتا ہے۔

(استفادہ از تاریخ سندھ از مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی)

اسلامی دور کی شروعات میں مصر اور بصرہ کی صوبیداریاں بہت اہم خیال کی جاتی تھیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کا عامل آج کل کی اصطلاح میں گورنر کہا جا سکتا ہے۔ عامل مصر اندلس تک تمام مشرقی ممالک کا حاکم اعلیٰ خیال کیا جاتا تھا اور یہی پوزیشن بصرہ کے گورنر جنرل کی تھی۔ بصرہ سے تمام

مشرقی ممالک اس کے تابع ہوتے تھے۔ بنی امیہ کے آخری دور تک یہ انتظام اسی طرح قائم رہا لیکن بنوعباس نے یہ طریقہ بدل دیا تھا اور ان کے زمانے میں خراسان کو یہ حیثیت حاصل ہوگئی تھی!

مکران، کرمان اور سیستان کے لوگ "بغاوت" کو ایک دلچسپ مشغلہ خیال کرتے تھے۔ دراصل یہ لوگ عرب حکمرانوں کے مزاج شناس ہو گئے تھے۔ انہیں تجربہ ہو چکا تھا کہ ان سے مقابلے میں کامیابی ممکن نہیں۔ البتہ اگر ان کے سامنے سر جھکا دیا جائے تو پھر ان سے زیادہ رحم دل اور درگزر کرنے والا بھی کوئی نہیں۔ اس لئے انہوں نے یہ معمول بنالیا تھا کہ عرب افواج آئیں تو انہوں نے معمولی جھڑپوں کے بعد سر تسلیم خم کر دیا۔ عرب فاتحین نے معمول کے مطابق درگزر سے کام لیا اور خراج لے کر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی اہل مکران نے پھر خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ مؤرخین اہل مکران کے اس جذبہ خودمختاری کو بغاوت کا نام دیتے ہیں۔

چنانچہ مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم لکھتے ہیں کہ:۔

"ایسے شہر بلکہ ملک کثرت سے ملیں گے جنہیں عربوں نے آٹھ آٹھ، بلکہ دس دس دفعہ فتح کیا اور وہ پھر ویسے کے ویسے ہی باغی تھے"۔

یہ آنکھ مچولی برابر جاری تھی کہ راجہ داہر کے ظلم وتشدد نے عربوں کو صلائے جنگ دی اور جب محمد بن قاسم اسلامی فوج کو جلو میں لئے والی سندھ کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا تو اسے مکران کے تمام شہر دوبارہ فتح کرنے پڑے۔ محمد بن قاسم سے پہلے جو سپہ سالار اس طرف آئے ان میں سے اکثر شہید ہو کر یہیں دفن ہوئے اور زیادہ تر قیقان ان حملہ آوروں کی زد میں رہا۔ ۳۸ھ میں حارث بن مرہ عبدی بجلی کی طرح چمکتے اور بادل کی طرح گرجتے قیقان پر حملہ آور ہوئے اور یہیں قتل ہو کر دفن ہوئے۔ ان کے بعد عبداللہ بن سوار گرجتے برستے آئے اور یہیں پیوند خاک ہوئے۔

راشد بن عمرو جدیدی بڑی شان سے آئے قیقان اور دوسرے معروف شہروں کو تاخت و تاراج کر کے واپس جا رہے تھے کہ مندر اور بہرج کے کوہستانوں میں میدوں سے مقابلہ ہوا اور

شربت شہادت پی کر عالم جاودانی کو رخصت ہوئے۔

سنان بن سلمہ نے ابتداء میں مکران کے باشندوں کو اپنی شمشیر خاراشگاف کے خوف سے دہلا دیا۔مگر بدہا کی مہم میں اپنی جان اہل مکران کی تلواروں کی نذر کی اور سرخرو ہو کر عالم بقا کو سدھار گئے۔منذر بن جارود عبدی نے آتے ہی بوقان اور قیقان پر فوج کشی کی،خضدار کو فتح کیا اور یہیں اقامت کی طرح ڈالی۔مگر زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ دفعتہ صدائے ارجعی سنائی دی اور لبیک کہتے ہوئے شاہد حقیقی کی خدمت میں پہنچ گئے۔تھوڑا عرصہ اس کے بیٹے کو بھی مکران پر حکومت کرنے کا موقع مل گیا۔مگر حجاج بن یوسف نے بصرہ کا گورنر جنرل بنتے ہی سعید بن اسلم کو مکران اور سواحل سندھ کا گورنر مقرر کیا لیکن یہ آتے ہی علافیوں کے ہاتھوں شہید ہو گیا۔اس کے بعد اس کے بعد حجاج نے مجاعہ بن شعر تمیمی کو مکران کی حکومت کا پروانہ عنایت کیا۔مگر یہ بھی اسی خاک پاک کا پیوند بنا۔اس کے بعد محمد بن ہارون نمری کا تقرر ہوا۔ یہ محمد بن قاسم کے ہمراہ ارمابیل تک آیا اور پھر یہیں عالم فانی سے عالم بقا کو رخصت ہو گیا۔اس کے جسد خاکی کو محمد بن قاسم نے قنبل میں بڑے اعزاز و احترام سے دفن کرایا۔

راجہ داہر سے نپٹنے کے لئے پہلے عبداللہ بن بنہان کو بھیجا گیا۔مگر اس نے فوج سے کام لینے کی بجائے اپنی شجاعت سے اس قدر کام لیا کہ عین میدان کارزار میں شہید ہوا۔عبداللہ کے بعد یہ منصب بدیل بن طہفہ بجلی کے سپرد ہوا۔اس نے اسلامی لشکر میں بجلی کی سی بے چینی پیدا کر دی اور خود بھی بجلی کی طرح چمکتا کڑکتا دشمن پر حملہ آور ہوا اور داد شجاعت دیتا ہوا ملک عدم کو رخصت ہو گیا۔

محمد بن قاسم بہادری اور شجاعت کا مرد میدان تھا۔جس وقت وہ مکران کے میدانوں میں اپنی گھوڑی کو مہمیز دے رہا تھا۔اس کی عمر صرف پندرہ برس تھی۔مگر اس نے کمسنی میں ایسے جوہر دکھائے کہ کوئی انہیں لاکھ مٹائے مگر یہ لوح زمانہ پر نہ صرف ثبت رہیں گے بلکہ اور اجاگر ہوں گے۔

محمد بن قاسم نے پہلے پنجگور کو فتح کیا۔ یہاں سے آگے بڑھا تو ارمابیل نے اس فاتح کے قدم چومے۔ یہاں سے خیمے اکھاڑے تو قنبل کے راستے کوچ پر کوچ کرتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ دیبل کی دیواروں کے نیچے پہنچ کر دم لیا۔ کئی مہینوں کے محاصرے اور مقابلے کے بعد رجب ۹۳ھ میں یہ شہر فتح ہوا۔ محمد بن قاسم سندھ کے تمام شہروں کو فتح کرتا ہوا ملتان پہنچا اور اسے بھی کئی مہینوں کے محاصروں اور شدید مقابلوں کے بعد فتح کرلیا۔ یہیں اسے حجاج بن یوسف اور اس کے بعد خلیفہ ولید بن عبدالملک کے مرنے کی اطلاع ملی۔ اس کے فوراً بعد سلیمان بن عبدالملک کے تخت نشینی اور اس کی معزولی و گرفتاری کے احکام ملے۔ یزید بن ابی کیشہ نئے گورنر نے آ کر اس سے چارج لیا اور پھر اسے گرفتار کر کے پابہ زنجیر دمشق کو روانہ کر دیا۔ ابھی محمد بن قاسم عراق بھی نہیں پہنچا تھا کہ یزید بن ابی کیشہ ورود سندھ کے اٹھارھویں دن راہگرائے عالم جاودانی ہوا۔ (یعقوبی)

یزید بن ابی کیشہ کے بعد سلیمان نے یزید بن مہلب کا بطور گورنر جنرل بصرہ تقرر ہوا۔ اس نے اپنے بھائی حبیب بن مہلب کو مکران اور سندھ کا کی ایالت پر مقرر کیا لیکن یہ ابھی دریائے سندھ کے کنارے ہی خیمہ زن تھا کہ سلیمان بن عبدالملک آغوش لحد میں جا سویا اور عمر بن عبدالعزیز کی دیندارانہ خلافت شروع ہوئی اور اس عادل شہریار نے عمر بن مسلم باہلی کو مکران اور سندھ کا عامل مقرر کیا۔ مگر جونہی زمانے نے عمر بن عبدالعزیز کی مقدس خلافت کا ورق الٹا۔ یزید بن مہلب کا خاندان حکومت سے باغی ہو کر کشتیوں کے ذریعے مکران آ گیا لیکن ہلال بن اخود تمیمی نے ان سب لوگوں کو قندابیل میں قتل کر دیا اور پچاس عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر کے بصرہ سے روانہ کیا۔ اس شہر میں مہلب کے نامور فرزند مفضل، عبدالملک، زیاد، مروان اور معاویہ بن یزید دفن ہیں۔ مؤخرالذکر وہ شخص ہے جس نے محمد بن قاسم کو زنجیروں میں جکڑ کر اپنی قید میں رکھا تھا اور طرح طرح کی سزائیں دی تھیں۔ اس وقت ان کے وہم و گمان میں بھی نہ آیا ہوگا کہ اس کو اور اس کے خاندان کو محمد بن قاسم کے مقابلے میں زیادہ مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔

ہشام بن عبدالملک نے خالد قسری کو بصرہ کا گورنر جنرل مقرر کیا۔ اس نے عمر بن باہلی کو معزول کر کے جنید بن عبدالرحمن مری کو اس علاقے کا عامل مقرر کیا۔ جنید مری نے اتنا اچھا انتظام کیا کہ اسے اس علاقے کی داخلی خودمختاری دے دی گئی۔ ۱۱۱ھ میں جنید کا خراسان میں تبادلہ کر دیا گیا اور اس کی جگہ تمیم بن زید عتبی مکران اور سندھ کے گورنر مقرر ہوئے۔ ان کی دریائے سندھ کے کنارے وفات واقع ہوئی تو حکم بن عوانہ کلبی کا اس کی جگہ تقرر ہوا۔ چونکہ وہ خود سپاہنامہ طبیعت کا آدمی نہ تھا۔ اس لئے وہ فاتح سندھ محمد بن قاسم کے صاحبزادے عمرو کو اپنے ہمراہ لیتا آیا جو سپہ گری میں طاق اور شجاعت وبصالت میں اپنے باپ کا صحیح جانشین تھا۔ حکم نے تمام اختیارات اس کو تفویض کر دیئے اور اس کے مشوروں سے حکومت کرنے لگا۔

(البلاذری)

حکم نے دریائے سندھ کے دہانہ مشرق کی طرف ایک شہر آباد کیا اور اس کا نام محفوظہ رکھا۔ اسے مسلمانوں کا مامن وماویٰ قرار دیا اور خوب آباد کیا۔ عمرو بن محمد بن قاسم کو حکم نے جہاد پر روانہ کیا۔ عمرو کو اس مہم میں بڑی کامیابی ہوئی۔ جب وہ متعدد فتوحات کے ساتھ واپس آیا تو حکم نے اسی خوشی میں دریائے سندھ کے دوسرے کنارے ایک اور شہر کی بنیاد رکھی جس کو منصورہ کا نام دیا۔ یہ وہی شہر ہے جو انجام کار سندھ کے تمام مقبوضات کا دارالامارہ قرار پایا۔

۱۲۲ھ میں حکم بن عوانہ شہید ہو گئے اور اس کی جگہ عمرو بن محمد مکران اور سندھ کے گورنر مقرر ہوئے۔ انہوں نے اس ملک کا بہت اچھا انتظام کیا۔ ۱۲۶ھ میں عمرو معزول کر دیئے گئے اور ان کی جگہ زید بن عرار تعینات ہوئے اس نے اطراف وجوانب کے راجاؤں پر ۱۸ حملے کئے اور اسلامی حکومت کو ہر طرح سے مضبوط اور طاقتور بنایا۔ (یعقوبی)

۱۳۰ھ کے قریب ایک عیار اور چالاک شخص منصور سندھ میں آ گھسا۔ ان دنوں بنی امیہ کی سلطنت اندرونی فسادات میں اس قدر پھنسی ہوئی تھی کہ اس سے کسی قسم کا خطرہ لاحق نہیں ہوسکتا

تھا۔ اس لئے منصور نے قوت پیدا کر کے یزید بن عرار کو زندہ ایک ستون میں چنوا دیا اور خود اس ملک پر متصرف ہو گیا۔ اپنے بھائی منظور کو اس نے قندابیل اور دیبل پر حکمران بنا کر روانہ کیا۔

(یعقوبی)

۱۳۲ھ میں بنو امیہ کا اقتدار ختم ہو گیا اور ابو العباس سفاح نے مسند نشین ہوتے ہی مفلس العبدی نامی ایک سیستانی شخص کو سندھ روانہ کیا تا کہ منصور کو گرفتار کر کے وہاں کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے۔ مفلس العبدی نے دیبل پہنچ کر منصور کو قتل کیا اور یہاں سے فتح مندی کے جھنڈے لہراتا آگے بڑھا۔ منصور ایک جان دینے والے شخص کی طرح مقابلے میں نکلا۔ چونکہ بھائی کے انتقام کا جوش اس کے قلب و دماغ پر مستولی تھا۔ وہ سپہ سالار کی طرح نہیں بلکہ ایک بہادر سپاہی کی طرح مفلس کی فوج میں گھس گیا اور بے شمار افراد کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ اس کی فوج نے مردانگی کا حق ادا کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مفلس کو شکست ہوئی اور وہ اپنے رفقا سمیت مارا گیا۔ (یعقوبی)

ابو مسلم خراسانی ان دنوں نائب السلطنت تھا۔ جب اسے مفلس کی تباہی کا حال معلوم ہوا تو اس نے اپنے ایک بہادر اور ہوشیار افسر موسیٰ بن کعب کو مکران اور سندھ کا والی بنا کر بھیجا۔ موسیٰ منصور کی چالاکیوں سے واقف تھا۔ وہ قندابیل پہنچ کر رک گیا۔ یہاں سے جوڑ توڑ کر کے منصورہ کے اکثر سرداروں کو اس نے اپنے ساتھ ملا لیا اور پھر بلا تردد مارا مار کرتا ہوا منصورہ پہنچا اور منصور کو شکست دے کر بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔ بلاذری کا بیان ہے کہ چونکہ اسے اپنے سرداروں پر اعتماد نہ رہا تھا۔ وہ تن تنہا ہندوستان کو بھاگا، مگر نابلدی اور اجنبیت نے یہ ستم کیا کہ بدنصیبی سے راجپوتانہ کے ریگستان میں جا پھنسا جہاں بادیہ گردی اور سراب کے جانستان مذاق میں پھنس پھنس کر بھوکا پیاسا پیوند زمین ہوا۔

(البلاذری فتوح البلدان جلد ۲ ص ۲۰۸)

منصور کے خاتمہ کے بعد موسیٰ نے شہر منصورہ کی مرمت کرائی اور چند سال کامیاب زندگی بسر کرنے کے بعد سندھ کی عنان حکومت عینیہ کے سپرد کی اور خود واپس عراق کو روانہ ہو گیا۔ عینیہ بن موسیٰ کو چونکہ حکومت سے اطمینان نہ تھا اس لئے وہ بغاوت کرنے پر مجبور ہو گیا۔ جس پر ۱۴۲ھ میں عمر بن حفص اس ملک کا والی بن کر آیا۔ اس نے عینیہ کو گرفتار کر کے بغداد روانہ کر دیا۔

عمرو بن حفص اہل بیت سے دلی عقیدت رکھتا تھا۔ عبداللہ بن حسن رضوان اللہ علیہم کے صاحبزادے محمد المہدی نے عباسی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو اس نے اپنے بیٹے عبداللہ الاشتر کو سندھ روانہ کیا تاکہ لوگوں کو اطاعت بنی فاطمہ کی طرف مدعو کریں۔ عمر بن حفص نے حضرت عبداللہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور انہیں لوگوں کو اپنی حمایت پر بلانے کی کھلی اجازت دے دی۔ مگر اسی اثناء میں حضرت محمد المہدی اور ان کے بھائی حضرت ابراہیم کے شہید ہونے کی خبر ملی جس سے ان دونوں پر اوس طاری ہو گئی۔ عمر بن حفص نے حضرت عبداللہ کو اپنے ایک دوست ہندو راجہ کی امان میں بھیج دیا۔ جو سہوان کا حاکم تھا۔ خلیفہ منصور کو جب اس امر کی اطلاع ہوئی تو اس نے عمر بن حفص کو سندھ سے افریقہ کی گورنری میں تبدیل کر دیا اور اس کی جگہ ہشام بن عمرو تغلبی کو سندھ کا والی مقرر کیا اور تاکید کی کہ جاتے ہی راجہ سے عبداللہ الاشتر طلب کرو۔ اگر وہ نہ دے تو اس پر حملہ کر کے تہس نہس کر دو۔

ہشام نے منصورہ پہنچ کر تمام بازاروں اور فوجی حلقوں میں مشہور کر دیا کہ عبداللہ الاشتر کی گرفتاری کے لئے راجہ سے خط و کتابت ہو رہی ہے۔ مگر خود اس بارے میں کوئی قدم اٹھانے کو تیار نہ ہوا۔ کیونکہ یہ بھی اہلبیت کا محب تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ سیدہ فاطمہؓ کے لال کو موت کے سپرد کر دے۔ اس کا خیال تھا کہ اس افواہ کو سن کر حضرت خود بخود وہاں سے کسی دوسرے مقام کو منتقل ہو جائیں گے۔ مگر قضا سے چارہ نہیں۔ سادات کے خون سے اس سرزمین پر چھڑکاؤ ہونا مقدر ہو چکا تھا۔ وہ کیسے کہیں جاتے اگرچہ دارالخلافہ سے بار بار حضرت عبداللہ الاشتر کی گرفتاری کے

لئے احکام موصول ہو رہے تھے۔ مگر ہشام معاملے کو طول دیتا رہا۔ ہشام نے تو بڑی رعایت کی اور اگر اس کے بس میں ہوتا تو حضرت عبداللہ کا بال بھی بیکا نہ ہوتا۔ مگر اسباب ہی کچھ ایسے پیدا ہو گئے جن سے حسنی سادات کی شہادت قریب سے قریب تر ہوتی چلی گئی۔

صورت حال یہ ہوئی کہ اتفاق سے سندھ کے ایک ضلع میں فساد ہو گیا۔ ہشام نے اپنے بھائی کو تھوڑی سی فوج دے کر اس مہم پر روانہ کیا۔ یہ فوج جہاں جانے والی تھی راجہ کا ملک درمیان میں پڑتا تھا۔ حضرت عبداللہ راجہ کی قلمرو میں مع اہل وعیال خوب بے فکری سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ زیدیہ فرقہ کے لوگ جوان کے معتقد تھے۔ وہ بھی ان کے پاس جمع ہونے لگے۔ یہاں تک کہ چار سو زیدی ان کے گرد و پیش جمع ہو گئے۔ حضرت عبداللہ شب و روز سرسبز و شاداب مرغزاروں کی سیر کرتے اور سیر و شکار میں زندگی بسر کر رہے تھے۔

سفیح جب اس ملک سے گزر رہا تھا تو اس کے رفیقوں نے تھوڑے سے فاصلے پر ایک گرد دیکھی۔ جس سے کسی لشکر کا دھوکا ہوتا تھا۔ سفیح کے رفقاء ہوشیار ہو کر آگے بڑھے۔ دامن گرد چاک ہوا تو گیارہ سو سوار نظر آئے۔ دریافت کیا گیا تو معلوم ہوا کہ عبداللہ بن اشتر ہیں جو دریائے سندھ کے سبزہ زاروں اور مرغزاروں کی تفریح کو نکلے ہیں۔

سفیح اپنے بھائی کے علی الرغم آل رسول کا دشمن تھا۔ اس نے لشکریوں کو حکم دیا کہ گھیر کر ان کو گرفتار کر لو۔ ہمراہیوں میں سے جو سنجیدہ اور دین دار لوگ تھے انہوں نے اس ارادے سے روکا اور کہا۔ رسول اللہ کی یادگار اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کے جگر گوشے ہیں انہیں تنگ نہ کرو۔ باوجودیکہ خلافت سے حکم پر حکم چلے آتے ہیں۔ مگر خود آپ کے بھائی ہشام نے آج تک ان احکام کو کتنی خوبصورتی سے ٹالا ہوا ہے۔ آپ کو بھی یہی مناسب ہے کہ اپنے بھائی کے نقش قدم پر چلیں۔ ان باتوں سے سفیح سخت چراغ پا ہوا اور برہم ہو کر بولا کہ رسول اللہ کی یادگار ہیں تو ہوا کریں، میں تو ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔ رحم دل مشیر مجبور ہو کر خاموش ہو رہے اور سفیح نے عبداللہ بن زیاد کی طرح حضرت عبداللہ

الاشتر کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔

جب حضرت عبداللہ نے دیکھا کہ یہ بدبخت انہیں گرفتار کرنے پر تلا ہوا ہے تو انھوں نے اپنے جاں نثاروں کو للکارا اور سفیح کے ہمراہیوں پر غضبناک شیر کی طرح جھپٹ پڑے۔ اس کے چند ہمراہیوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اور آخر لڑتے لڑتے خود بھی شہید ہو گئے۔ ان کے دسوں رفیقوں نے بھی سفر آخرت میں ان کا پورا ساتھ دیا۔

جب سفیح نے اس واقعہ کی اطلاع ہشام کو کی تو وہ بے حد غمگین ہوا لیکن حکومت کے خوف سے بھائی سے کسی قسم کا مواخذہ بھی نہ کرسکا اور اس نے حضرت عبداللہ الاشتر کے شہید ہونے کی اطلاع دے دی۔ منصور اس مژدہ سے بڑا خوش ہوا اور اس نے حکم دیا کہ اس کے ساتھ راجہ کو بھی ٹھکانے لگا دیا جائے۔ چنانچہ ہشام نے سہوان پر بلا تامل حملہ کر دیا راجہ نے بہادروں کی طرح مقابلہ کیا۔ انجام کار اپنی تلوار عربوں کی تلواروں کی نذر کی اور اس کا سارا علاقہ عباسی مملکت کے تصرف میں آ گیا۔ بچارے راجہ کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے پیغمبر اسلام کے نواسے کو پناہ دی تھی۔ افسوس اس دور کی مسلم حکومت نے عبداللہ الاشتر کو تو شہید کیا ہی تھا مگر راجے کے استیصال کی کیا ضرورت تھی۔ سہوان کے پرانے قلعے کے پاس چند مقابر سر اٹھائے زبان حال سے یہ کہتے نظر آتے ہیں۔

گلۂ جفائے وفا نما جو حرم کو اہل حرم سے ہے
گر بتکدے میں بیاں کروں تو صنم بھی کہے ہری ہری

عبداللہ الاشتر کا ایک صاحبزادہ یہیں پیدا ہوا تھا جسے مستورات کے ساتھ دارالخلافت کو بھیج دیا گیا۔ گویا یہ بچہ خاندان نبوت کا وہ لعل تھا جو پاک و ہند کی پہاڑیوں سے برآمد ہوا۔ اس نور نظر کا نام محمد بن عبداللہ تھا جو بڑا ہو کر ابن الاشتر سے موسوم ہوا۔

ہشام نے قندابیل پر حملہ کر کے بغاوت کیش عربوں کو جلاوطن کیا۔ جو سندھ کے گورنروں کو

اکثر تنگ کیا کرتے تھے۔ مامون کے دور تک مکران گورنر سندھ کے ماتحت رہا۔ گورنر خود منصورہ میں رہتا تھا لیکن اپنا ایک نائب مکران میں بھیج دیتا تھا۔ ان حکام کی حیثیت ریذیڈنٹ کی ہوتی تھی۔ وہ مکران کے بلوچ سرداروں سے خراج لیتے تھے لیکن ان کے اندرونی معاملے میں دخل نہیں دیتے تھے۔ ۲۲۱ھ میں گورنر سندھ موسیٰ برمکی کا انتقال ہو گیا۔ اس نے مرتے وقت عمران کو جانشین مقرر کیا۔ دارالخلافت میں جب یہ اطلاع پہنچی تو خلیفہ معتصم باللہ نے بھی یہ انتظام بحال رکھا اور عمران بن موسیٰ کے نام سندھ و مکران کا پروانہ بھیج دیا۔

عمران نے سب سے پہلے قیقان پر حملہ کیا۔ جس پر قبیلہ الزط نے قبضہ کرلیا تھا۔ عمران نے انہیں شکست دے کر البیضاء نام سے ایک چھاؤنی کی بنیاد رکھی۔ اسی طرح قندابیل (گنداواہ) پر قبضہ کر کے اس شہر کے امراء کو خضدار لے گیا۔ اس کے بعد وہ میدوں کی طرف متوجہ ہوا اور انہیں شکست دے کر ایک بندرگاہ تعمیر کی۔ ازاں بعد دریائے ارل پر خیمہ زن ہو کر اس نے بلوچوں سے خراج وصول کیا۔

سندھ کا ہباری خاندان

سندھ میں کافی عرصہ سے نزاری اور یمنی قبائل کا جھگڑا چلا آتا تھا۔ جن دنوں عمران میدوں کی مہم میں مصروف تھا عمر بن عبدالعزیز (عمر بن عبدالعزیز ہباری کا دادا منذر حکم بن عوانہ کلبی کے ہمراہ سندھ آیا تھا۔ اس کا شجرہ نسب بترتیب ذیل حضرت قصی سے جاملتا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز بن منذر بن زبیر بن عبدالرحمن بن ہبار بن اسود بن عبدالعزی بن قصّی!) ہباری نے جو نزاریوں کا سردار تھا۔ قوت پیدا کر کے المنصورہ پر قبضہ کرلیا۔ زاں بعد اس نے موقعہ پا کر عمران بن موسی کو بھی قتل کر دیا۔ اب یہ سندھ کا خود مختار فرمانروا بن گیا اور مرکز سے برائے تعلق رہ گیا چونکہ عباسیہ خلافت کمزور ہو چکی تھی۔ اس لئے وہ اتنے سے تعلق کو بھی غنیمت جانتی تھی۔ اسی زمانے میں

یعقوب بن لیث نے خراسان غزنہ اور مکران پر قبضہ کرلیا اور خلیفہ کو لکھ بھیجا کہ میں دربار خلافت کا ہمیشہ مطیع رہوں گا یعقوب کے بعد اس کا بھائی عمرو بن لیث خراسان، سیستان، مکران، زابلستان (غزنہ) اور فارس کا فرمانروا تسلیم ہوا۔

عضدالدولہ بویہ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ جب اس نے کرمان اور جبال قفص کے بلوچوں پر تابڑتوڑ حملے کئے تھے تو اس نے مکران کے بلوچوں کو بھی معاف نہیں کیا تھا۔ چنانچہ تاریخ سندھ کا مؤلف لکھتا ہے کہ:

"عضدالدولہ نے مکران پر حملہ کر کے ان لوگوں کو بالکل برباد و پامال کر دیا"۔

(ابن اثیر وابن خلدون)

ساتھ ہی لکھتا ہے کہ:

"اسی کے عہد میں یہ لوگ مسلمان بھی ہوئے۔ مگر اب انہوں نے آبادی چھوڑ کر پہاڑوں کی گھاٹیوں میں سکونت اختیار کرلی۔ عضدالدولہ نے آباد بستیوں میں ان کی جگہ زراعت پیشہ لوگوں کو لا لا کر آباد کیا۔ (ابن اثیر)

مندرجہ بالا اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ عضدالدولہ کے دور تک بلوچ من حیث القوم مسلمان نہیں ہوئے تھے کرمان کے بلوچوں میں آہستہ آہستہ اسلام پھیلا۔ اسی طرح مکران کے بلوچوں کو بھی نور ایمان یکلخت نصیب نہیں ہوا۔

دوسرا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پہلے بلوچوں کی آبادیاں میدانی علاقوں میں بھی تھیں لیکن نوشیرواں، عضدالدولہ اور غزنوی تاخت و تاراج نے انہیں پہاڑوں میں منتقل ہونے پر مجبور کیا۔ مکران کا چونکہ سندھ سے قدیمی تعلق تھا اور اس کا بیشتر حصہ حاکم المنصورہ کے تصرف میں تھا۔ اس لئے جونہی عضدالدولہ نے مکران میں قدم رکھے۔ اہل سندھ بھی مرعوب ہو گئے اور منبروں پر خلیفہ بغداد کے بعد عضدالدولہ بویہ کا نام بھی لیا جانے لگا۔ علامہ مقدسی نیز لکھتا ہے کہ "جن دنوں

سندھ پر ہباری خاندان برسر اقتدار تھا مکران کا سردار علیحدہ تھا۔ اور وہ منکسر المزاج و عادل تھا“۔

(تاریخ سندھ جلد دوم ص ۱۲۵ مولانا عبدالحلیم شرر)

سلطان محمود غزنوی نے مکران کی گورنری عیسیٰ بن معدان کو مرحمت کی۔ مکرانی معدان کو مہران کہتے تھے۔ اس کا پایہ تخت تیز (تیس) تھا۔ اس کی آبادی ملتان کی آبادی کا ۱/۲ حصہ تھی۔ چاروں طرف کھجوروں سے گھرا ہوا تھا۔ تجارت کی منڈی اور بندرگاہ تھا۔ ہرمز کی بربادی پر اس کی تجارت خوب چمکی۔ ۴۲۰ھ میں عیسیٰ بن معدان کا انتقال ہو گیا۔ اس نے دو لڑکے چھوڑے۔ ابوالعساکر اور عیسیٰ! عیسیٰ نے مال و ملک پر قبضہ کرلیا اور حاکم بن بیٹھا۔ ابوالعساکر نے خراسان جاکر سلطان مسعود سے فریاد کی اس نے اپنا لشکر ساتھ کر دیا۔ عیسیٰ کو پتہ چلا تو اس نے بھی اٹھارہ ہزار فوج جمع کرلی۔ ابوالعساکر نے تیز پہنچ کر ایک دفعہ پھر صلح و صفائی کی کوشش کی۔ مگر کچھ نتیجہ مرتب نہ ہوا۔ عیسیٰ نے غزنوی فوج کے مقابلے میں اپنا تمام لشکر جھونک دیا۔ طرفین میں خوب جنگ ہوئی اور دونوں اطراف کے بہادروں نے شجاعت وجلادت کے بڑے جوہر دکھائے۔ عیسیٰ لڑتا ہوا مارا گیا اور ابوالعساکر اپنے باپ کے تخت و تاج کا مالک بنا۔

مشائخ ہنکار کی تشریف آوری

پانچویں صدی ہجری میں جبل ہنکار سے شیخ موسیٰ قریشی الہاشمی نامی ایک بزرگ سیستان وارد ہوئے۔ ان کے صاحبزادے شیخ ابوعلی مع اہل و عیال کیچ مکران کو منتقل ہو آئے کوئی ظالم حاکم اس ملک پر مسلط تھا ممکن ہے عیسیٰ بن معدان کا ہی کوئی آخری جانشین ہو۔ رعایا اس سے تنگ تھی۔ عوام نے حضرت سے حاکم کی بے عدالتی کا شکوہ کیا۔ آپ نے اس کو ایک خط لکھا۔ جس میں رعایا پر شفقت کرنے اور عدل و انصاف پر چلنے کی نصیحتیں درج تھیں۔ اس بدبخت نے آپ کے کرم نامے سے کوئی اثر قبول نہ کیا۔ بلکہ رعایا پر سختیوں میں اضافہ کر دیا۔ آپ کو اس ناہنجاری پر

سخت غصہ آیا۔ عوام سے کہا اگر تم اس شیطان سے نجات چاہتے ہو تو مسلح ہو کر آجاؤ۔ آپ کا یہ کہنا تھا کہ بلوچوں کا ایک بڑا لشکر حضرت کے زیر علم جمع ہو گیا۔ آپ نے والی مکران کے محل پر حملہ کر دیا۔ اس بد قسمت کو شکست ہوئی اور وہ مع اہل و عیال رات کی تاریکی میں بھاگ گیا۔ آپ نے بلوچوں سے فرمایا کہ خداوند پاک نے تمھیں ظالم حاکم سے نجات دے دی ہے اس لئے تم جسے اپنے حق میں بہتر سمجھو۔ اسے اپنا حاکم بنالو۔ ان سب نے حضور سے استدعا کی کہ آپ سے زیادہ مربی اور خیر خواہ دوسرا کون ہوسکتا ہے۔ حضور کرم بخشی فرما کر اس ملک کا انتظام سنبھالیں چنانچہ رفاہیت خلق کے پیش نظر حضرت شیخ ابو علی نے مکران کی بادشاہت قبول فرمالی۔ بقول شیخ فرحتؔ:

این بوعلی زفضل خداوند دو جہاں — سلطان اول است دریں کہنہ خاندان
از دودمان شیخ مشائخ ابوالحسن — کز وے بہار تازہ رسید اندریں چمن

آپ نے ملک کی آبادی اور رعایا کی خوشحالی کی طرف توجہ فرمائی اور اس دیار کے باشندوں کی کشت زار امید کو عدل و بذل کی آبشار سے سرسبز و شاداب فرمایا۔ جب ملک کا انتظام ہر لحاظ سے درست ہو گیا تو حضور نے مکران کا تاج اپنے بلند اقبال شہزادے سلطان رشید الدین کے حوالے فرمایا اور خود حجرے میں معتکف ہو کر یاد الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ سلطان موصوف نے جتنا خدا کو منظور تھا۔ خالق و خلق کی رضا جوئی میں کوشش کی اور والد بزرگوار کے طریق پر عدل وداد، اور بذل وجود میں نام پیدا کیا اور بقول فرحت:

سلطان رشید دین محمد — در داد دہی ز والد خویش
اندر حق مردمان آں ملک — در عدل نہاد دو قدم پیش
جز عاشق خستہ دل نبودہ! — حیران و حزیں و سینہ ریش
بُد خرم و خوش ہمہ رعیت — با خلقِ خلیق آں وفا کیش

جب سفرِ آخرت قریب آیا تو آپ نے بھی اپنے صاحبزادے سلطان قطب الدین کو مکران کا تخت حوالے فرمایا اور خود بقیہ عمر یادِ الٰہی میں بسر کرنے کے لئے حجرے میں تشریف لے گئے۔

سلطان قطب الدین قریشی

سلطان قطب الدین نے آبائی تخت پر رونق افروز ہو کر ملک کو عدل وداد سے بھر دیا۔ رعایا آسودہ ہوگئی۔ ملک کو اندرونی خلفشار اور بیرونی حملوں سے یکسر نجات مل گئی۔ زراعت اور صنعت وحرفت میں ترقی ہوئی اور مکران، عراق ویمن کا مقابلہ کرنے لگا۔ آپ کے زمانے میں سید السادات سید احمد توختہ رحمۃ اللہ علیہ ترمذ شریف سے لاہور جانے کے ارادہ سے کیچ سے گزرے۔ چند دن یہاں قیام فرمایا اور شہزادہ بہاء الدین سے اپنی صاحبزادی بی بی حاج کا نکاح کر دیا اور خود اپنے سفر کو جاری رکھتے ہوئے لاہور کو روانہ ہو گئے۔ شیخ فرحت آپ کے نظم و ضبط کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں۔

چناں غم والم ازحال مردماں بربود | بدل سروروبجاں خرمی مہیا بود
نہ بیم وزد کسے رانہ محنت ثمنہ | بہیچ گونہ الم رادرآں میاں رہ نہ
چمن چمن گل خاطر ہمہ شگفتہ بود | زبیم شاہ خزانِ الم نہفتہ بود
شہ سلیم طبیعت یگانہ در ایثار | بہ بذل وجودتواں گفت ابر گوہر بار
بعقل و دانش وفرہنگ درجہانبانی | سزاست گوئمیش اُو را اسکندرِ ثانی
بوقت جنگ بمیدان بود شیرژیاں | بحملہ برسردشمن چو رستمِ دستاں

جب شہزادہ بہاء الدین امورِ مملکت انجام دینے کے قابل ہوئے تو سلطان قطب الدین نے ایک مبارک تقریب میں مکران کا تاج اس عزیز کے سر پر رکھا اور خود حجرہ شریفہ میں ذکر وفکر کے لئے چلے گئے۔

سلطان بہاء الدین علیہ الرحمۃ

آپ نے دس سال بڑے طنطنہ اور شوکت واجلال سے بادشاہت کی۔ زاں بعد آپ نے تخت وتاج اپنے چھوٹے بھائی سلطان شہاب الدین کے حوالے کیا اور خود شہزادہ جمال الدین اور ضیاء الدین کو ہمراہ لے کر ارض مقدس کو روانہ ہو گئے۔ دو شہزادے حمید الدین حاکمؒ اور رکن الدین حاتمؒ بھائی کی تربیت میں چھوڑے۔ شیخ فرحت مے گوید۔

آنچناں دل بعشق کعبہ گما شت   ہر قدم عاشقانہ برمے داشت
ہمچوں مجنوں بشوق جانانہ   مے خُرّ امید محو مستانہ
چونکہ در منزل مراد رسید   روئے مطلوب خویش آنجا دید
ماند محو نظارہ مدت ہا!   درحرم از خودئ خویش جُدا

مناسک حج ادا کرنے اور روضہ مطہرہ کی زیارت کے بعد آپ وطن مالوف کو آرہے تھے کہ یمن میں پیک اجل آپہنچا اور آپ صدائے ارجعی کو لبیک کہتے ہوئے ملک بقا کو رخصت ہو گئے۔ شاہزادگان جمال الدین اور ضیاء الدین مجاورت پدر بزرگوار اختیار کر کے خطۂ یمن میں مقیم ہو گئے۔

سلطان شہاب الدین کا انتقال

سلطان شہاب الدین کو مکران کے تخت پر بیٹھے بمشکل دو سال گزرے تھے کہ اچانک ایسے مرض میں مبتلا ہوئے کہ پھر اٹھنا نصیب نہ ہوا۔ لمحات آخر میں شہزادہ حمید الدین بن سلطان بہاء الدین کو بلا کر اپنے ہاتھ سے تاج شاہی ان کے سر پر رکھا اور فرمایا! الحمدللہ آپ کے والد بزرگوار کی امانت آپ کو بسلامت پہنچ گئی۔ آپ کے صاحبزادے شہزادہ ابوالبقا اور ملک سرور، جو بمشکل ۳ سال اور ڈیڑھ سال کے تھے شہزادہ حمید الدین کے دست مبارک میں دے کر فرمایا کہ ان کی تعلیم وتربیت کا خاص خیال رکھنا۔ اس کے بعد آپ کی روح قفس عنصری سے عالم بالا کو پرواز کر گئی۔

تذکرۂ حکومت سلطان حمید الدین حاکم علیہ الرحمتہ

سلطان حمید الدین حاکم علیہ الرحمتہ نے اکیس سال کیچ مکران پر حکومت کی۔ شیخ فرحت آپ کے دورِ حکومت سے متعلق حسب ذیل تاثرات کا اظہار فرماتے ہیں:۔

خدیو کشور دل آں شہ حمیدالدیں　　خدا شناس حق آگاہ حق گزیں یقیں
مدام خلق خدارا عزیز دانستے　　بنفع خلق شدے صرف ناتوانستے
نہ بد خاطر اوگاہ خاطر آزاری　　چہ از وضیع و شریف و از شہرو بازاری
بزیر سایہ اوخلق بود آسودہ　　زلوح سینہ خود حزن بزودہ
بامرونہی ہمہ کار سلطنت می کرد　　عیاں معاملہ فہمی نہاں دلش پردرد
غضب اگر کسے کردے برائے حق کردے　　وگرنہ ہیچ کسے راگہے نیازردے

عین عالم شباب میں سلطان ابراہیم ادھم کی طرح آپ نے چند ایسے اشارے پائے کہ امور سلطنت اپنے ابن عم سلطان ابوالبغاد (ابوالبقا) کے سپرد فرمائے اور خود تلاش حق میں لاہور چل دیئے۔ جہاں آپ کے نانا بزرگوار سید احمد توختہ، خلق خدا کو سبیل الرشاد پر چلانے میں مصروف تھے۔

سلطان ابوالبقا کی تخت نشینی

سلطان ابوالبقا کو تخت پر بیٹھے بمشکل دو سال ہی گزرے تھے کہ ترکستان کی طرف سے چنگیزی سیلاب اس شدت سے آیا کہ اس نے بڑی بڑی سلطنتوں کی چولیں ہلا دیں۔ خوارزم شاہ کی شکست کے بعد اس کا بیٹا جلال الدین ہندوستان سے بازگشت کرتا ہوا مکران پہنچا۔ وہ اپنے لئے کوئی محفوظ مامن تلاش کرتا پھرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مکران کے بلوچوں کی مدد سے چنگیزیوں کو شکست فاش دے سکے گا۔ نیز مکران کی پہاڑیاں اچھی کمین گاہ ثابت ہوسکتی تھیں۔ سلطان ابوالبقاء نے بھی اسے اپنے ملک سے نکالنا حمیت اسلامی کے خلاف جانا۔ مگر مکران کے چند

شوریدہ سر امراء جو سلطان جلال الدین کے قیام کے روادار نہ تھے۔ انہوں نے چنگیز خان کو اطلاع کی کہ آپ کا شکار ہمارے ہاں چھپا پڑا ہے۔ خبر ملتے ہی چنگیز خان کا بیٹا چغتائی خان ملتان کا محاصرہ چھوڑ کر بگولے کی طرح مکران آپہنچا۔ سلطان جلال الدین اس کے آنے سے پہلے رخصت ہو چکا تھا اور سلطان ابوالبقا بھی اس گھٹا کے پہنچنے سے قبل مکران کا تخت و تاج چھوڑ کر لاہور روانہ ہو گئے۔ (لاہور میں ''تلبغہ'' نام کا ایک محلہ اب تک، اس شہر یار کی یادگار چلا آتا ہے) چغتائی خان نے کیچ پہنچ کر اس دیار کو خوب لوٹا اور جلال الدین کا سراغ نہ پا کر توران کو روانہ ہو گیا۔ پیر نبی بخش قریشی اس واقعے کو اپنے الفاظ میں اس طرح موزوں فرماتے ہیں۔

چو بگزاشت سلطان حاکم سریر — بجایش شدہ تلبغہ جائے گیر
بہ تقدیر آں قادر عزوجل — بیفتاد درپاد شاہی خلل
تخلل درافتاد درلشکرش — زہرسُو عدوتاخت برکشورش
نمودند غارت خزائن تمام — بہ یغمائے شاں شد دفائن تمام
برفتند پس سوئے چنگیز خان — کہ تافوج آرندزاں قہرماں
برفتند پس سوئے چنگیز خان — کہ تا فوج آرند زاں قہرماں
تساہل نورزید چنگیز ہیچ — رواں کرد لشکر بہ تسخیر کیچ
چوشد تلبغہ میررا ایں خبر! — کہ فوج مغل آمدہ بے خبر
نیاراست گامے نہادند پیش — درآمد نمودہ درآید بخویش!
کہ نے گنج دارم کنوں نے سپاہ — ہمیں بہ کہ بگزارم ایں تخت گاہ
رواں تلبغہ شاہ شد آں زماں — سوئے مالک تختِ ہندوستاں

نواب مکران کا مکتوب سجادہ نشین مَومبارک کے نام

مخدوم کرم شاہ صاحب علیہ الرحمتہ نے ۱۹۳۹ء میں نواب مکران سردار بائی خان کو ایک خط لکھا تھا۔جس میں آپ نے اس مکرم ومحترم قریشی خاندان کی حکومت کے بارے میں وضاحت چاہی تھی۔نواب نے فارسی زبان میں خط کا مفصل جواب دیا تھا۔جس کا اردو ملخص درج ذیل ہے۔

آپ نے لکھا:۔

"مرکز خلافت سے بعُد کے سبب مکران خانہ جنگی کا شکار ہو چکا تھا۔اللہ کی عنایت سے مشائخ ہنکار اہل مکران کی ہدایت وراہنمائی کے لئے کیچ مکران تشریف لائے۔ ہنکار مشائخ کی کرامات کے اثرات اہل مکران میں جلد سرایت کر گئے اور انھوں نے بطیب خاطر سلطان العارفین سلطان بوعلی کو اپنا حاکم تسلیم کرلیا۔ان کے بعد ان کے فرزند سلطان رشید الدین اور پھر ان کے بیٹے سلطان قطب الدین سریر آرا ہوئے اور سلطان ابوالبقاء تک یہ خاندان عالی مقام اس ملک پر قابض و متصرف رہا!"

آخر میں نواب صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ بزرگوں کے مزارات قلعہ "میری" کے قریب واقع ہیں۔

(استفادہ از تذکرہ حمیدیہ)

شجرہ مشائخ ہنکار

(جنہوں نے تقریباً ڈیڑھ سو سال تک مکران پر حکومت کی)

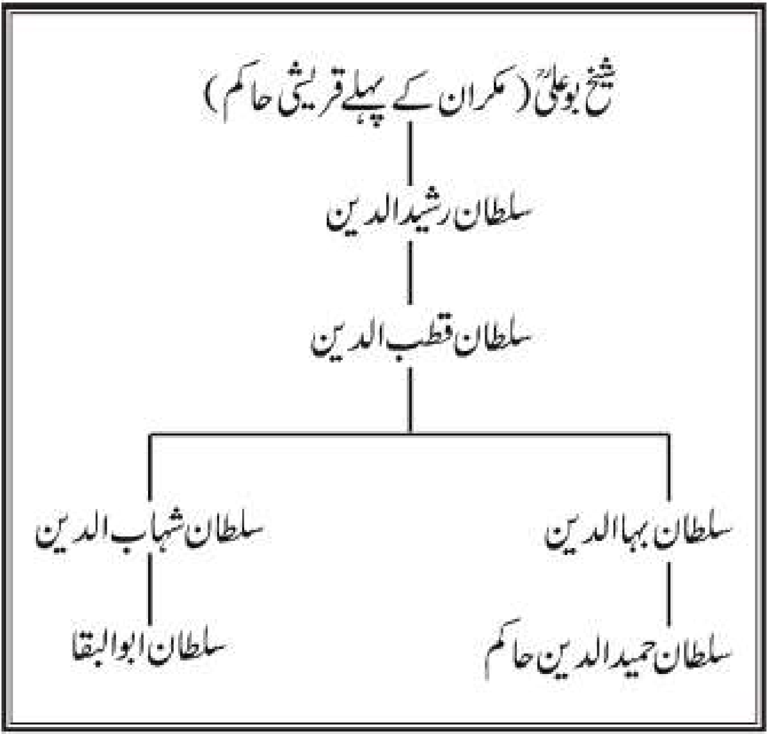

میر جلال خان

کیچ مکران کا بلوچ فرمانروا

O

منگولوں کو مکران سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ انہوں نے اس ملک پر حملہ صرف اس لئے کیا تھا کہ سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کو یہاں قدم جمانے کا موقع نہ ملے۔ چنانچہ جب منگول مار دھاڑ کرتے مکران میں داخل ہوئے تو سلطان کرمان کی طرف منتقل ہو گیا اور منگول بھی مکران کو لوہا لنگڑا کر کے واپس لوٹ گئے۔ البتہ ملک کے انتظام کے لئے بوراک نامی ایک امیر کو ضرور چھوڑ گئے لیکن جب منگولوں نے من حیث القوم اسلام قبول کر لیا اور ان کی خشونت، عطوفت میں بدل گئی تو انہوں نے مار دھاڑ بند کر دی اور اپنے علاقوں پر قناعت کر کے بیٹھ گئے۔ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ منگولوں کا جو دستہ یہاں تعینات تھا وہ بھی اسلام قبول کرنے کے بعد مقامی آبادی میں گھل مل گیا لیکن منگولوں نے اہل مکران کو جو چرکے لگائے تھے ان کے زخم ابھی مندمل نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے وہ منگولوں کا اقتدار پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کے علی الرغم میر جلال خان ملک بدرالدین کو شکست دینے کے بعد قوم میں فتح مندی کا ایک نیا جذبہ اور ولولہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ چوالیس پاڑوں کا لشکر جرار لے کر ایسے وقت کیچ میں پہنچا جبکہ اہل مکران منگولوں کے انتداب سے نجات حاصل کرنے کی تدبیریں سوچ رہے تھے۔ میر جلال خان کی آمد کو انہوں نے غنیمت جانا۔ بالخصوص وہ بلوچ سردار جو کچھ عرصہ پہلے یہاں پہنچ چکے تھے بلا توقف میر جلال خان سے مل گئے۔ ان کے بعد اہل مکران نے بھی اپنی وفاداریوں کا رشتہ ان سے جوڑ لیا اور منگول ایک محفوظ مقام جھالاوان کی طرف منتقل ہو گئے۔ جہاں یہ اب تک آباد ہیں اور مینگل کہلاتے ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ میر جلال خان نے ان سے اچھا سلوک کیا۔ ان کی جاگیروں کو بحال رکھا اور یہ لوگ بھی ان میں ایسے شیر و شکر ہوئے کہ بلوچوں کا ایک تمن بن کر رہ گئے۔

میر جلال خان نے مکران کا اچھا انتظام کیا۔ منگولوں کے حملے میں فصیل کو جو نقصان پہنچا تھا اس کی مرمت کرائی۔ اپنے ہمراہی قبائل کو جاگیریں دیں۔ انہیں ان کی مرضی کے مطابق اچھے اچھے مقامات پر آباد کیا اور انتظامی ڈھانچے کو مضبوط و مستحکم بنانے کے لئے ملک کے طول و عرض میں دورے کرنے شروع کئے چونکہ منگولوں نے خارجی قوتوں کو پامال کر دیا تھا اور اندرون ملک کے قبائل کسی خطرے کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس لئے میر جلال خان کا دور نہایت پرسکون رہا اور آپ نے بڑی شان و شوکت سے طبعی عمر ختم کرنے کے بعد عالم فانی سے عالم باقی کو انتقال فرمایا۔

جب میر جلال خان کے صاحبزادے ان کو سپرد خاک کرنے کے لئے قبرستان کو روانہ ہوئے تو ان کی چھوٹی اہلیہ مسمات عجوبہ بی بی نے اپنے کمسن بچے میر ہوت خان کو جس کی عمر بمشکل سات برس کی تھی روک لیا۔ قلعے کے دروازے بند کرا دیئے اور اعلان کیا کہ میر جلال خان کے بعد تخت و تاج کا حق دار میر الڑ کا ہوت ہے۔

(تاریخ بلوچستان مصنفہ رائے بہادر لالہ ہیتو رام ص ۱۱)

جب میر جلال خان کے بڑے صاحبزادے گورستان سے واپس آئے اور دروازوں کو بند پایا تو انہوں نے دروازوں کے بالمقابل چھپر بنوا کر ان میں فاتحہ خوانی کی رسم ادا کی۔

افسوس ہے کہ میر جلال خان پر آج تک نہ تو کوئی مستقل کتاب لکھی گئی ہے اور نہ ہی ان کے تفصیلی حالات ملتے ہیں۔ حالانکہ وہ بلوچی دنیا کے رجل عظیم ہیں اور انہوں نے ہی مکران میں منتشر اور پراگندہ حال بلوچ قبائل کو منظم کر کے بلوچی حکومت کی داغ بیل ڈالی تھی اور پھر وہ پاک و ہند کے پچھتر فیصد قبائل کے جد اعلیٰ ہیں۔ البتہ ایک غیر بلوچ اہل قلم پروفیسر انور رومان نے میر جلال خان کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ انہیں بلوچوں سے محبت اور میر جلال خان سے گہری عقیدت ہے۔ ان کی کتاب ''آئینہ بلوچ'' دراصل اپنے آئینہ میں ناظرین کو میر جلال

خان کے جمال بے مثال کا ہی عکس دکھاتی ہے۔ انہوں نے اس ''فرمانروا'' کا بڑے غور و فکر سے مطالعہ کیا ہے اور وہ جوں جوں اس عظیم انسان کے قریب ہوتے گئے ہیں ان کی عقیدت و محبت بڑھتی ہی گئی ہے اور میر جلال خان انہیں محبوب سے محبوب تر نظر آنے لگے ہیں۔ بجائے اس کے کہ میں انور رومان کا نفس مضمون اپنے الفاظ میں پیش کروں۔ بہتر سمجھتا ہوں کہ ان کے شہ پارے بجنسہٖ پیش کردوں تاکہ آپ رومان صاحب کی پیاری پیاری عبارت، ان کی شگفتہ بیانی، گلفشانی، حسن بیان اور ان کے بہترین طرز ادا سے لطف اندوز ہوسکیں۔ رومان صاحب نے سب سے پہلے سرداری سسٹم پر بحث کی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

سرداری سسٹم

بلوچوں کے ہاں دو سماجی طبقے تھے۔ ایک سرداروں کا طبقہ جو بالائی طبقہ تھا۔ دوسرا عوامی بلوچوں کا طبقہ جو زیریں طبقہ تھا۔ ان دونوں میں معاشی اور معاشرتی طور پر اکثر بُعد المشرقین ہوتا تھا۔ سردار عموماً موروثی ہوتے تھے۔ نخلستانوں میں رہتے تھے اور اپنے تدبر، انصاف، فراست، جرات، دلیری، دولت و ثروت، فیاضی اور قائدانہ صلاحیتوں کی وجہ سے ممتاز ہوتے تھے۔ وہ عموماً بلوچ دستور یا روایتی قوانین کے پابند تھے۔ عام بلوچ صحراؤں اور پہاڑوں میں رہتے تھے۔ امن کی حالت میں وہ اپنے سردار کو مال مویشی پیش کرتے تھے اور زمانہ جنگ میں اپنے جسم، گھوڑے اور آلات بھی۔ متوسط طبقہ اول تو بلوچوں میں تھا ہی نہیں اور اگر تھا بھی تو وہ سرداروں کے مصاحبین اور سردار زادوں تک محدود تھا۔ جو کم از کم اپنے مربی سردار کے حین حیات سر نہ اٹھا سکتے تھے۔ لیکن اس کے مرنے پر اقتدار کی رسہ کشی اور اختیار کی ٹورنامنٹ میں ضرور حصہ لیتے تھے۔ سردار کا بڑا لڑکا اگر مضبوط و بہادر ہوتا تو وہ سازش اور بغاوت کے ان مجسم بگولوں کو دبا دیتا ورنہ قبیلے کا داخلی امن مخدوش رہتا تاوقتیکہ تمام قبائل کا سردار اعلیٰ اس میں مداخلت کرکے ان کو راہ راست پر نہ لے آتا۔

بلوچ نہ صرف قبائل میں بٹے ہوئے تھے بلکہ ان قبائل اور قبائل سرداروں کے اوپر سرسرداران یا سردار اعلیٰ ہوتا تھا۔ جیسے میر جلال خان تھا جو اپنے قبیلے کا سردار ہونے کے علاوہ تمام قبائلی سرداروں کا بھی سردار یا قائد تھا بیرونی جنگ کی صورت میں سردار اعلیٰ کا وجود ضروری سمجھا جاتا تھا۔ بیرونی جنگ ختم ہونے یا اس کا خطرہ ٹل جانے کے بعد بلوچ اپنی اس قبائلی تنظیم پر لوٹ آتے تھے اور باہمی جنگ و صلح کے لئے آزاد سمجھے جاتے تھے۔

سرداروں نے مجموعی طور پر بلوچ تاریخ میں کیا حصہ لیا۔ اس پر دو آراء ہوسکتی ہیں ایک تو یہ کہ انہوں نے بلوچوں کا شیرازہ منتشر کردیا۔ پہلی رائے میر جلال خان پر صادق آتی ہے کہ وہ نہ صرف انہیں ایران سے سلامتی کے ساتھ مکران لائے بلکہ اپنی موت تک اس مجاہد اعظم نے چوالیس قبائل کو اپنے پانچ بیٹوں کی سرکردگی میں ضم، مدغم اور منظم کردیا!

میر جلال خان کا مقام

آج اکثر بلوچ سوانح نگار میر جلال خان کو بہت سے رہنماؤں میں سے صرف ایک رہنما کی حیثیت سے تو جانتے ہیں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ میر جلال خان وہ مبارک ہستی تھی۔ جس کی زیر قیادت بلوچوں کو حیات ثانیہ نصیب ہوئی۔ میر جلال خان وہ عسکری قائد تھا جس کے تحت بلوچ آخری دفعہ حکومت ایران سے ٹکرائے اور ہزیمت خوردہ ہونے کے باوجود پاش پاش نہ ہوئے بلکہ بحفاظت مکران وارد ہوئے۔ میر جلال خان وہ عظیم انسان تھا جس کے تحت وہ مکران کے اطراف واکناف میں پھیل گئے۔ انہیں اطمینان کا سانس نصیب ہوا۔ انہوں نے اپنے زخم سی لئے اور مصاف حیات کے لئے دوبارہ تازہ دم ہوگئے۔ میر جلال خان وہ بے مثال مدبر تھا جس نے بلوچوں کے دلوں میں گھر کر کے ان کے چوالیس قبائل کو از سر نو پانچ قبائل میں منظم کردیا۔

میر جلال خان وہ رجل عظیم تھا جس نے بلوچوں میں وحدت پذیری کی ایک دھن پیدا کردی۔ حتیٰ کہ وہ اس کے فوراً بعد میر رند اور میر لاشار کے تحت متحد ہوگئے اور زمانہ جنگ میں

صرف میر رند ہی ان کا سردارِ اعلیٰ اور نشانِ یکتائی بن گیا۔

میر جلال خان نہ صرف بلوچوں کا اوّلین تاریخی رہنما تھا۔ نہ صرف ان کا نجات دہندہ تھا۔ نہ صرف ہند اور پاکستان کے کم و بیش نصف کروڑ بلوچوں کا مورثِ اعلیٰ تھا بلکہ وہ بلوچوں کا عظیم ترین تاریخی مدبر تھا جس نے ریت کے ان گنت ذروں کو ایک تودے میں مجتمع کر دیا اور ٹپ ٹپ کرنے والے بارش کے قطروں کو ایک جوئے رواں میں بدل دیا اور لٹے لٹے، الٹے پلٹے، بگڑے بکھرے بلوچوں کو ''یک لڑیں'' (بلوچی کلاسک شاعری کی یہ کتنی خوبصورت اور پرمعنی ترکیب ہے) بنا دیا اور لطف یہ ہے کہ میر جلال خان نہ رند تھا، نہ لاشار (جو پندرھویں صدی عیسوی سے لے کر اب تک بلوچوں کا سرمایہ فخر و مباہات چلا آتا ہے) بلکہ وہ ان دونوں اور دوسرے غیر رند اور غیر لاشار بلوچوں کا مورث اور ان سے بالا تھا۔ وہ ایسا ہمہ صفت موصوف سردار تھا کہ میر چاکر خان اور میر گواہرام لاشاری اس کے سامنے دو شمعوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک آفتاب کے سامنے دو مشعلیں، ایک چاند کے سامنے دو ستارے''۔

(آئینہ بلوچ ص ۱۴ تا ۱۸)

یہ دراصل ایک غیر بلوچ مورخ کے وہ عقیدت کے پھول ہیں جو اس نے بلوچ دنیا کے اس بطل جلیل کی بارگاہ میں نذر کئے ہیں۔ بایں ہمہ ہماری فقدانِ معلومات کا یہ عالم ہے کہ آج تک ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ میر جلال خان نے کتنا عرصہ حکومت کی اور اس کی حکومت کا لائحہ عمل کیا تھا۔ اس کے زمانے میں مکران نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ یہاں تک کہ مکران باوجود اتنی وسعت کے اس کی قبر کے آثار تک دکھانے سے قاصر ہے۔ اسی لئے جناب رومان جب اپنی عقیدت وارادات کے تاثرات حیطہ تحریر میں لانے کے بعد اس دور کے داخلی و خارجی حالات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو تاریخ کا دامن تہی دیکھ کر چیخ اٹھتے ہیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرے چھا جاتے ہیں۔ ان کا قلم چیخنے لگتا ہے اور وہ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں:

"اے بلوچ رہنماؤ! ادب نگارو، اور نوجوانو!! جب ہوائیں بنسری بجاتی ہیں تو پتے بھی رباب چھیڑتے ہیں۔ زمین و آسمان ردائے نور اوڑھ لیتے ہیں اور رگ رگ نس نس میں بجلیاں بھر جاتی ہیں۔ تو کیا بلوچوں کا یہ بہت بڑا قافلہ جوسیستان کے ایک ظالم اور خونریز سلطان کو شکست دے کر مکران کی سرزمین میں داخل ہوا تھا۔ وہ یہاں آ کر بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھ گیا؟ کیا اس قطعہ اراضی نے اس قافلے کے دور طفولیت کو نہیں دیکھا؟ جب بلوچوں کی اتنی بڑی تعداد وادی شباب میں داخل ہو رہی تھی تو کیا اس پر خواب کی کیفیت طاری تھی؟ تو کیا بلوچ اپنے دور مکران میں بنجر اور بے ثمر تھے۔ کیا اس وقت وہ زندگی کی حدت، جذبے کی آنچ، عشق کی لذت، واردات کی تنزیل اور خیالات کے الہام سے محروم تھے؟ اگر ڈیمز مکران و خاران نہیں پہنچ سکا اور اس قائد بے مثال کے نقوش قدم کو نہیں پا سکا اور اس کی سیراب کردہ جمعیت کے سرمایہ ذہن وقلب کو جمع نہیں کرسکا تو ہم بھی بلوچوں کے ذہن رسا اور قلب حساس کے جُرعات مکران سے محروم رہیں؟ کیوں۔ آخر کیوں؟؟

اے میدان تحقیق میں گھوڑے دوڑانے والو! کبھی آپ نے میر جلال خان کی عہد آفرین شخصیت، اس کے جمال وجلال، اس کے ترنم وتموج، اس کے تلاطم وتراکم، اس کی رزم وبزم، اس کے لیل ونہار، اس کے فکر وعمل، اس کی گفتار وکردار، اس کی بود وباش اور اس کی حیات وممات پر غور کیا؟

"آئیے، دشت مکران چلیں وہاں بلوچوں کے نقوش اولین کی دریافت کریں۔ ان کے سوز وگداز اور ترنم وتراکم کا پتہ چلائیں۔ وہاں کے انسانوں کے سینوں میں دبے ہوئے نغموں، گیتوں، غزلوں اور نظموں کی کھوج لگائیں۔ ان کی تخلیقات ومنظومات کا سراغ لگائیں اور اس عظیم انسان کے شادیانوں، طنطنوں اور زمزموں کو منظر عام پر لائیں جس کے قوی ہاتھوں میں اس پورے کاروان کی باگ ڈور تھی۔ جس نے پرانے طوفانوں کو تھمایا اور نئے طوفان کو جنم دیا تھا۔ جس کو ایک زنگ خوردہ، کُند اور مڑی ہوئی تلوار ملی تھی مگر اس نے اسے تیغ براں بنا دیا۔ جو شکستہ وریختہ قبائل کی روح رواں بن گیا"۔

(آئینہ بلوچ، ص ۷۵۔۷۶)

افسوس ہے جناب رومان اوران جیسے درددل رکھنے والوں کی چیخ وپکار کے باوجود اب تک کسی نے میر جلال خان تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کسی نے اسے تاریخ کے صفحات میں ڈھونڈنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ میر جلال خان کا وجود آج بھی اسی طرح معمہ ہے۔ جیسے ایک صدی پہلے تھا۔ پنجاب اور ڈیرہ جات کے بلوچوں کا دعویٰ ہے کہ میر جلال خان کے پانچ بیٹے تھے اور ہوت خان اس کا سب سے چھوٹا صاحبزادہ تھا۔ مولانا عبداللہ دیرمانی اور مکران کے بلوچ رند، لاشار وغیرہ کو میر جلال خان کی اولاد تسلیم نہیں کرتے۔ بجائے اس کے کہ میر ہوت کو اس کا بیٹا مانیں وہ بڑے اعتماد سے کہتے ہیں کہ خود میر جلال خان ہوت تھا۔ سوائے اس کے ہمارے لئے اور کوئی چارہ کار نہیں کہ دونوں مکتب فکر کے نظریات ناظرین کرام کے سامنے رکھنے کے بعد فیصلہ آپ پر چھوڑ دیں؟

میر جلال خان کی اولاد

میر جلال خان کی اولاد کے بارے میں پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے مؤرخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ موصوف کے پانچ صاحبزادے اور کئی بیٹیاں تھیں۔

فاطمہ دختر مرزا جہاں بیگ کے بطن سے حسب ذیل چار صاحبزادے ہوئے۔

(۱) میر رند (۲) میر لاشار (۳) میر کورائی (۴) میر جاتن

بی بی عجوبہ کے بطن عفت سے میر ہوت خان تولد ہوئے۔(میر رحیم داد خان مولائی شیدائی کی تحقیق یہ ہے کہ مکران میں ہوت قوم پہلے سے آباد تھی اور شاہی نسل سے تھی۔ میر جلال خان نے اس خاندان کی راجکماری عجوبہ سے شادی کی۔ اس شہزادی کے بطن سے جو بچہ تولد ہوا اس کا نام میر صاحب نے ہوت رکھ دیا۔ (بلوچی دنیا ستمبر ۱۹۶۰ء ص ۱۸)

پھر لکھتے ہیں کہ ہوت ایک قدیم جدغال قوم ہے۔ جسے ہر کی کرشن کی رانی جاموتی نے جنم دیا۔ ان ہوتوں کی حکومتیں کسی زمانے میں سندھ، گجرات، جیسلمیر، افغانستان اور سیستان تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یونانیوں نے اس قوم کو ہوت کا نام دیا تھا (ص ۱۹) مگر شیدائی صاحب نے کسی یونانی مورخ کی کتاب سے لفظ ''ہوت'' ثابت نہیں کیا۔ (مصنف)۔

ان کے علاوہ بلوچی شجرہ میں بُلو اور عالی بھی درج ہیں۔ بُلو کی اولاد بلیدی ہیں اور عالی کے غزان اور عمر۔ مگر صحیح یہ ہے کہ میر عالی میر جلال خان کے بھائی تھے بیٹے نہیں تھے۔

(تاریخ بلوچستان ہیتو رام ص ۴)

میر جلال خان کی صاحبزادیوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں۔ رائے بہادر ہتو رام نے تاریخ بلوچستان میں اتنا لکھا ہے کہ میر جلال خان کے چودہ نواسے تھے۔ جن سے چودہ قومیں پیدا ہوئیں اور وہ چہاردہ پنتھ کہلاتی ہیں۔

ان صاحبزادیوں میں ایک معصومہ بی بی جتو بھی تھی۔ جس کا نکاح میر جلال خان نے اپنے بھتیجے مراد خان سے کر دیا تھا چونکہ میر جاتن نام کا ایک بیٹا بھی تھا۔ اس لئے مؤرخین کو عجیب غلط فہمیوں کا شکار ہونا پڑا اور جاتن اور جتو دو الگ شخصیتوں کو ایک سمجھ کر جتوئی قبائل کے لئے وجہ مصیبت بن گئے۔ حالانکہ اس قبیل کے ہزاروں نام دوسروں میں نہیں ہمارے اپنے گھرانوں میں ملتے ہیں۔

سرور خان، بھائی۔ سرور بی بی، بہن۔ سردار علی، بھائی۔ سردار بی بی، بہن۔ کرم خان، بھائی۔ کرم بی بی، بہن۔ رشید خان، بھائی۔ رشیدہ بی بی، بہن۔ سعید خان، بھائی۔ سعیدہ بی بی، بہن وغیرہ۔

اگر میر جلال خان نے بھی لڑکے کا نام جاتن اور لڑکی کا نام جتو بی بی رکھ لیا تو کونسا غضب ہو گیا جو لوگ جتوئیوں کو جت، جاٹ یا الزط سے منسوب کرتے ہیں۔ وہ الفاظ کے سحر کا شکار ہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں اسی طرح کچھ لوگ رند، لاشار، کورائی، جاتن اور ہوت وغیرہ کو میر جلال خان کی اولاد تسلیم نہیں کرتے۔ مولانا دیرمانی اس مکتب فکر کے پرجوش مبلغ ہیں۔ اپریل ۱۹۶۱ء میں آل پاکستان بلوچ ہسٹاریکل کنونشن کا جو اجلاس کراچی میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں اس موضوع پر گرما گرم بحث ہوئی تھی۔ جس کا ملخص ناظرین کرام کی دلچسپی کے لئے بجنسہٖ یہاں درج کرتے ہیں۔

مولانا عبداللہ دیرمانی کی تصریحات

آپ نے ’’بلوچ قوم اور اس کے اصلی وطن‘‘ پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

’’سندھ، پنجاب اور بلوچستان کے مغربی علاقوں کے اکثر بلوچ قبائل اپنا نسب نامہ میر جلال خان سے ملاتے ہیں لیکن مکران، ایرانی بلوچستان، مسقط، زنجبار، خلیج فارس اور روسی بلوچ اس خیال کے حامی نہیں ہیں بلکہ اس روایت کو من گھڑت اور مضحکہ خیز خیال کرتے ہیں اور یہ روایت

کہ میر جلال خان حاکم مکران کے پانچ فرزند، رند ہوت ، لاشار کورا اور جاتن یا جتو تھے۔ اس کی حیثیت ایک افسانہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہوت و رند دو ممتاز بلوچ قبائل کے قدیم نام ہیں۔ میر جلال خان سے بہت پہلے یہ قبیلے مکران میں موجود تھے۔ میر جلال خان خود ہوت قبیلے سے تھے"۔

بلوچ قبائل کے نام

یہ حقیقت ہے کہ بلوچی زبان، رسم و رواج اور معاشرہ کے صحیح خدوخال مکران خصوصاً ایرانی بلوچستان میں بہ نسبت سندھ و پنجاب کے بہتر موجود ہیں اور وہاں کی اصطلاحات عقل سلیم کے نزدیک زیادہ قابل قبول و درست معلوم ہوتی ہیں۔ بہ نسبت ان روایات کے جو یہاں زبان زد خاص و عام ہیں۔ ان علاقوں میں جو روایات مشہور ہیں و نیز مولانا عبدالغنی سر بازی مرحوم نے ایک کتاب منظوم بنام شہ نامہ مکران فارسی میں تالیف فرمائی تھی۔ اس میں آپ نے تحریر کیا تھا کہ بلوچ قبائل کے بعض نام بہت قدیم ہیں۔ جیسے رند، ہوت، پڑ،لٹیک ، صابرہ،سینگلہ،لگور، جت، مید،سنگر،کھوسہ، سو پک وغیرہ اور بعض قبائل کے نام ان کے مورثین کی نسبت سے ہیں۔ جیسے باران زئی، زرک زئی، حمزہ زئی (حمزئی) شنبوزئی وغیرہ اور یا ان قبائلی ناموں کے آخر میں یائے نسبت ہوتی ہے۔ جیسے عمرانی ،نوشیروانی ،نوحانی وغیرہ اور بعض قبیلے کسی شہر یا علاقے سے منسوب ہیں۔ جیسے لاشاری، کورائی، دشتی وغیرہ۔ اس قسم کے قبائل دراصل ایک مورث اعلیٰ کی اولاد نہیں ہیں بلکہ مختلف بلوچ قبائل ایک علاقے کے ہونے کی وجہ سے اس نام سے موسوم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ لاشار ایرانی مکران میں ایک وسیع علاقے کا نام ہے وہاں میر گواہرام لاشاری کے قلعوں اور کاریزوں کے کھنڈر زبان حال سے ان کی عظمت رفتہ کی یاد دلاتے ہیں اور وہاں مختلف قبائل کے بلوچ آباد ہیں لیکن مجموعی طور پر سب لاشاری کہلاتے ہیں۔ میر گواہرام خان بھی اسی علاقے کا سردار

اور ہوس ملک گیری میں وہاں سے نکلا اور جن جن قبائل نے اس کا ساتھ دیا۔ وہ سب لاشاری کہلائے۔ مرورِ زمانہ سے لوگوں کو یہ دھوکا ہو گیا کہ لاشار خان ان کا مورث اعلیٰ ہے۔

کوَرائی

''کور'' بلوچی زبان میں دریا یا ندی کو کہتے ہیں۔ چنانچہ رودخانہ کورا کے دونوں طرف قصر قند سے لے کر آہزان تک جو بلوچ آباد ہیں ان کو کوری کہا جاتا ہے یہی لوگ سندھ و پنجاب میں آ کر آباد ہو گئے اور رفتہ رفتہ یہ لفظ بگڑ کر کورائی ہو گیا اور افسانہ نگاروں نے آگے بڑھ کر ''کورا خان'' میر جلال خان کے ایک بیٹے کا نام بنا دیا۔

جتوئی

جتوئی دراصل بلوچوں کے مشہور خانہ بدوش قبیلہ جت کی بگڑی ہوئی صورت ہے جو چراگاہوں کی تلاش میں ادھر کو آنکلے اور رفتہ رفتہ یہ لفظ بگڑ کر جت سے جتوئی ہو گیا۔ اس لفظ کا معرب ''زط'' ہے۔ یہ قبیلہ ایرانی مکران، خصوصاً ''باہو دشتیاری'' میں بکثرت موجود ہے اور اس قبیلے کا ذکر عربی تاریخوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

کلاچی

اسی طرح کلاچی، علاقہ کلاچ (مکران) اور بلیدی شہر بلیدہ (مکران) کے رہنے والے ہیں۔ نقل مکانی کرنے سے سندھ و پنجاب میں پھیل گئے۔ ورنہ ''کلاچ خان'' اور ''بلیدہ خان'' ان کے مورثین کے نام ہرگز نہیں ہیں۔

ایک قاعدۂ کُلّیہ

مولانا نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ ''یہ قاعدہ قدیم سے چلا آتا ہے اور آج بھی یہی رواج ہے کہ اگر کسی ملک یا علاقہ کے لوگ نقل مکانی کر کے دوسرے ملک یا علاقہ میں آباد

ہوجاتے ہیں تو اپنے اصلی وطن کی نسبت سے پکارے جاتے ہیں۔ چنانچہ پنجاب کے رہنے والے پنجابی، سندھ کے سندھی، علی ہذالقیاس، ملتانی، لکھنوی وغیرہ اور وہاں سب کو ایک ہی قبیلہ خیال کیا جاتا ہے۔ خواہ کوئی اعلیٰ خاندان سے ہو یا ادنیٰ خاندان سے بعینہ اس طرح جو لوگ تلاش معاش کے سلسلے میں پاک مکران یا ایرانی مکران سے ترک وطن کر کے سندھ کراچی میں لاکھوں کی تعداد میں پھیل گئے ہیں۔ یہ لوگ بلوچوں کے مختلف قبیلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر یہاں نئے وطن میں منجملہ طور پر مکرانی کہلاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تو ہر گز نہیں کہ مکرانی نام کا کوئی قبیلہ ہے اور مکران خان ان کا مورث اعلیٰ تھا۔ (جدید تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مکران اہل مکران کے مورث تھے اور شروع میں ان کا قبیلہ بھی مکرانی ہی کہلاتا تھا۔ اب بے شمار شعوب میں تقسیم ہو گیا ہے)

یہی حال مہاجر بھائیوں کا ہے کہ یہ لوگ نہ تو ایک قبیلہ و نسل سے ہیں اور نہ ان کے جد امجد کا نام مہاجر ہے۔ ان میں مغل، قریشی، سید، پٹھان، میراثی وغیرہ سبھی شامل ہیں۔ ممکن ہے ہزاروں سال بعد کے لوگوں کو یہ دھوکہ ہو جائے کہ مکران خان اور مہاجر خان کوئی بزرگ گزرے ہیں اور یہ لوگ ان کی نسل سے ہیں۔

مولانا نے تقریر ختم کرتے ہوئے فرمایا حضرات! بے سروپا روایات اور متضاد افسانوں کے پیچھے پڑ کر فریب خوردگی و فریب دہی میں مبتلا نہ ہو جیئے اور قوم کے سامنے کوئی ایسی تاریخ پیش کیجئے جو مستند اور صحیح ہو۔ ورنہ یقین فرمائیے۔ آپ کی ساری کاوشیں اور عرق ریزیاں اکارت جائیں گی اور قوم اساطیر کے ان سارے انبار کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دے گی۔

مولانا کا مقالہ چونکہ معلومات افزا اور نئے نظریات کا حامل تھا۔ اس لئے بڑی دلچسپی سے سنا گیا۔ مولانا تقریر ختم کر کے بیٹھے ہی تھے کہ بیک وقت کئی حضرات نے جوابی تقریر کی اجازت طلب کی۔ صاحب صدر نے باری باری تمام معترضین کو تقریر کرنے کی اجازت دی۔ جناب تاج محمد مگسی نے مولانا کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ "ہر وہ شخص جو اونٹ ہانکتا ہے جت کہلاتا ہے

تو کیا آپ ان سب کو جتوئی کہیں گے؟''

مولانا نے فرمایا ''اونٹ چرانے والے کو شتربان کہتے ہیں۔ جت سے شتربان مراد لینا صحیح نہیں، یہ ایک بڑی قوم ہے۔ عربی میں اسے زط کہتے ہیں۔ سندھ کی شمالی وادی میں کافی مدت تک اس قوم کو حاکمانہ اقتدار حاصل رہا ہے۔

غلام حسین خان جتوئی جو اس وقت اجلاس کے صدر بھی تھے۔ اس تصریح پر سخت برہم ہوئے۔ فرمایا۔

''جاٹ تو ہندوؤں کی ایک شاخ ہے۔ رہتک کے نواح میں لاکھوں ہندو جاٹ اب تک موجود ہیں۔ سر چھوٹو رام بھی جاٹ تھے۔ مولانا کے اس نظریے کو جتوئی قوم قطعاً تسلیم نہیں کرے گی۔ ہمارے پاس میر جلال خان تک مصدقہ شجرے ہیں اور ہمیں ان پر سو فیصد اعتماد ہے۔ ہمارے معاملے کو آپ رہنے دیجیئے ہم جو کچھ ہیں درست ہیں اور اپنے باپ کو بخوبی پہچانتے ہیں''۔

خاکسار کی جوابی تقریر

احقر اس اجلاس میں سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ صاحب صدر نے معاملہ کی نزاکت کا احساس کر کے بندہ کو جواب دینے کا اشارہ کیا۔ نیازمند نے کھڑے ہو کر عرض کیا۔

''مولانا جب یہ فرماتے ہیں کہ رند اور لاشار وغیرہ میر جلال خان کی اولاد نہیں ہیں تو اس سے لاکھوں بلوچوں کے دل کانپ جاتے ہیں۔ میر جلال خان سے فرزندی کی نسبت محض زبانی نہیں کہ توڑی جا سکے۔ پنجاب اور ڈیرہ جات کے بلوچوں کے پاس مصدقہ شجرات ہیں اور انہیں نوک زبان ہیں۔ مسٹر ایل ڈیمز جب ڈیرہ غازی خان کے ڈپٹی کمشنر تھے تو انہوں نے بلوچوں کے انساب پر بڑا ریسرچ ورک کیا تھا۔ ان کی کتاب ''دی بلوچ ریس'' (The Baloch Race) اس امر کا زندہ ثبوت ہے۔ مولانا، لاشار اور رندوں کا میر جلال خان سے پہلے ہونا ثابت

کر دیں تو پھر ان کے دعوے میں کچھ وزن ہو سکتا ہے۔ صرف اتنا کہہ دینا کہ جنوبی ایران میں لاشار کے قلعہ جات ہیں۔ ان کے تمنات ہیں۔ پانچ چھ سو سالوں کے مصدقہ شجروں کی تکذیب کے لئے کافی نہیں۔ میر جلال خان اپنے ہمراہ چوالیس قبائل بھی لائے تھے۔ مگسی، چانڈیے، کھوسے، مزاری، بگٹی وغیرہ یقیناً ان سرباز اور بہادر لوگوں کی اولاد ہیں۔ ان کے بلوچ ہونے میں کس کافر کو شبہ ہے۔ بحث صرف اس امر کی چل رہی ہے کہ فلاں فلاں قبائل میر جلال خان کی اولاد سے ہیں اور دوسرے چوالیس قبائل ان کے ہمراہ آئے تھے اور وہ بلوچ ہیں!

لوری اور نسابین

مولانا نے بلوچی اشعار اور انساب کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ لوریوں اور مراسیوں کے وضع کردہ ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ لوری اور مراسی لوگ ایک مدت سے انساب کے امانت دار چلے آتے ہیں اور اپنے اپنے سرداروں سے تنخواہیں پاتے ہیں لیکن ان سب کو ایک ڈنڈے سے ہانکنا اور انہیں کذاب اور جعلساز کے خطابات دینا انسانیت کی توہین ہے۔ اگر بلوچوں کے لوری اور مراسی جعلساز ہیں تو پھر سادات، قریشی اور دوسرے عالی قدر خانوادوں کے لوری صدق و دیانت کی کیا سند رکھتے ہیں؟ اور پھر ان تاریخوں کا کیا اعتبار ہے۔ واقدیؔ کو آج تک قبولیت عامہ کا درجہ نہیں مل سکا۔ طبری، خطیب بغدادی، روضتہ الصفا، سیر المتاخرین، ابن اثیر، ابن کثیر، تاریخ خمیس کی صدہا روایات ثقات کے نزدیک قابل قبول نہیں۔ مسلمانوں کا ایک فرقہ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اگر شکوک و شبہات کی وادی میں ایک دفعہ قدم پڑ گیا تو پھر اس دلدل سے نکلنا مشکل ہو جائے گا۔ بہر حال ہمیں ان ماخذات پر غور کرنا ہی پڑے گا۔ ان میں اغلاط بھی ہیں اور معلومات بھی، یہ ہمارے مؤرخین کا کام ہے کہ وہ کوئی ایسا معیار قائم کریں جس سے جھوٹ اور سچ میں تمیز ہو سکے۔ اگر ہم لوریوں اور مراسیوں کے اشعار کو صحیح سمجھتے ہیں تو ہمیں "بلوچی دنیا" کے اجراء اور جگہ جگہ کنونشن بلانے کی کیا ضرورت تھی؟ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمارے

دوست ہمارے خاندانی اثاثہ کو بھی جنہیں ہمارے آباؤ اجداد صدہا سال سے سینوں سے لگائے چلے آتے ہیں۔ باطل قرار دے کر ضائع کردیں۔ شجرات صرف لوریوں کے پاس ہی نہیں بلکہ بلوچوں کو بھی حرف بحرف یاد ہیں۔ آپ کس کس کی تکذیب کریں گے۔ میر جلال خان کے بعد دوسو سال تک میر لاشار اوران کی اولاد جنوبی ایران میں رہی ہے۔ میر ہوت کیچ مکران کا حاکم بنا اور پھر اس کی اولاد اسی علاقے میں بڑھتی اور پھیلتی رہی۔ اگر ہوت قبائل اس سرزمین میں کثرت سے ملتے ہیں تو اس سے ہمارے دوستوں کو تعجب کیوں ہوتا ہے۔ خاندان غلاماں، خاندان خلجی اور تغلق کو حکومت کرنے کا کتنا زمانہ نصیب ہوا ہے۔ مگر دیکھئے کہ پاک و ہند میں کتنے شہر قلعے اور مقبرے ان سے منسوب ہیں۔ اگر کوئی وادی لاشار سے شہرت پا گئی ہے تو اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ لاشار میر جلال خان سے بھی پہلے کے ہیں۔ بلوچ عبدالغفار خان، ڈاکٹر میر عالم راقب، ملک صالح محمد خان لہڑی، میر گل خان نصیر اور میر محمد سردار خان گشکوری کی کاوشیں آپ کے سامنے ہیں۔ یہ سب اس امر کو تسلیم کرتے ہیں بلوچ قافلے کئی اقساط میں اس سرزمین پر آئے۔ انہوں نے وہ قبائل بھی لکھے ہیں جو میر جلال خان کے رفیقوں میں سے تھے۔ مکران میں رند اور لاشار یا کورائی کا کوئی ذکر نہیں۔ اگر رند، لاشار یا ہوت میر جلال خان کے ہمراہیوں میں ہوتے تو ان کا چوالیس قبائل میں ذکر ضرور آتا۔

بفرض محال اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ میر جلال خان رند، لاشار اور کورا وغیرہ کا باپ نہیں ہے تو پھر اس کی اولاد دکھائی جائے یا یہ ثابت کیا جائے کہ میر جلال خان مقطوع النسل تھا اور وہ دنیا سے بے اولاد گیا۔ ہمارے احباب ایسی کوئی تحریر نہیں دکھا سکتے۔ البتہ میر خدا بخش بجارانی نے اپنی انگریزی تصنیف The Baloch Through Centuries میں میر جلال خان کا صرف ایک صاحبزادہ میر شہداد تسلیم کیا ہے۔ جیسا کہ ان کی تحریر سے ظاہر ہے۔

("After death of Mir Jalal Khan his son Mir Shahdad and after him Chakar took the Reigns of Leadership Page 46".)

”میر جلال خان کی وفات کے بعد اس کا لڑکا میر شہداد بلوچوں کا سردار بنا۔ اس کی وفات پر اس کے لڑکے میر چاکر نے بلوچوں کی قیادت سنبھالی“۔

مگر یہ کوئی بات نہیں ہے۔ وہی شجرہ ہے جو رائے بہادر ہتورام نے سرداران رند سے لے کر اپنی کتاب تاریخ بلوچستان میں درج کیا تھا۔ یعنی میر چاکر بن میر شہداد بن میر عبداللہ خان بن میر رند بن میر جلال خان (تاریخ بلوچستان از رائے بہادر ہتورام ص ۴ و ۵) یعنی بجارانی صاحب کو شجرہ نقل کرنے میں سہو ہوا ہے اور وہ رند اور عبداللہ خان کا نام لکھنا بھول گئے۔ اسی طرح میر شہداد کے بیٹے میر شہک کا نام بھی ان کے ذہن سے اتر گیا۔

غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ جب ہمارے دوست میر جلال خان کی متبادل اولاد پیش نہیں کر سکتے تو جو صاحبزادے ان سے موسوم ہیں ان سے میر جلال خان کو محروم کیوں کیا جاتا ہے؟

زط اور جتوئی کی بحث

غلام حسین خان جتوئی نے اسی روز دوسری نشست میں فرمایا کہ جب مولانا دیرمانی فرماتے ہیں عربوں میں ایک قوم زط ہے۔ زط سے جت اور جت سے جتوئی بن گئے تو ہمارا سر چکرانے لگتا ہے۔ حالانکہ ایک دنیا جانتی ہے کہ کورو پانڈوں کے زمانہ میں مید اور جاٹ دو قومیں سندھ کے کناروں پر آباد تھیں۔ ان کی آپس میں خوفناک جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ اسلامی دور سے یہی جاٹ عراق میں درآمد کئے گئے۔ وہاں یہ زط کہلائے۔ جت کو زط کہا گیا ہے نہ کہ زط کو جت۔ ابن خلدون طبری، ابن کثیر اور فتوحات واقدی تک ہم بھی پڑھے ہوئے ہیں جو کچھ ہمارے آباؤ اجداد نے اپنے نسب کے بارے میں ہمیں بتایا ہے وہی زیادہ صحیح ہے۔

نام اور ان کی وجہ تسمیہ

اپریل ۱۹۶۱ء کے اجلاس کی جو کارروائی اوپر دی گئی ہے اس میں متنازعہ امور کا کوئی تصفیہ

نہ ہوسکا اور دودنوں کی گرما گرم بحث کے باوجود وہ متنازعہ ہی رہے اور نہ ہی ہمارے پاس اتنے وزنی دلائل ہیں جس سے فریقین کو مطمئن کرسکیں۔ البتہ جو جانتے ہیں اس کا اظہار ضروری ہے۔

مولانا نے اپنے مقالات میں کئی جگہ فرمایا ہے کہ ''کور'' ندی کو کہتے ہیں۔ لفظ لاشار سطح مرتفع کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے۔ ہوت عربی میں مچھلی کو کہتے ہیں۔ اس لئے یہ آدمیوں کے نام نہیں ہوسکتے لیکن ہماری بلوچ برادری میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

جیسے میر دریا خان (مری تمن میں دریا نام کا ایک تمندار گزرا ہے۔ جیکب آباد کے کھوسہ برادران میں میر دریا خان ممتاز شخصیت کے حال ہیں)، محراب خان (محراب یعنی مسجد کا محراب) دولت خان، سمندر خان، کوہ فروش (کوہ فروش ایک لغاری سردار کا نام ہے) میر ریحان (ریحان یعنی نیازبُو ایک خوشبودار پودا ہے)، جمعہ خان (جمعہ یعنی یوم الجمعہ)، کچھی خان (کچھی بلوچستان کا ایک علاقہ ہے)، مزار (مزار بمعنی قبر)، نوبت (نوبت، مغل دور میں صبح وشام قلعے کے دروازے پر نقارے بجتے تھے۔ اسے نوبت بجنا سے تعبیر کرتے ہیں) اس لئے یہ کوئی وزنی اعتراض نہیں کہ چونکہ کورا نام ایک ندی ہے اور لاشار جنوبی ایران میں ایک سطح مرتفع ہے۔ اس لئے میر جلال خان کے صاحبزادوں کے نام نہیں ہوسکتے۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ چونکہ میر لاشار اور اس کا قبیلہ دوسو برس تک اس علاقے میں مقیم رہا۔ اس لئے وہاں کی پہاڑیاں اور ندی نالے آپ سے موسوم ہو گئے۔ اس طرح کوراندی کو میر کورائی سے منسوب کریں گے نہ کہ کورائی کو اس سے!

اسی طرح ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ایک نہر اس لئے مگس کہلائی کہ مگسیوں نے اسے احداث کیا تھا۔ مکران، مکران اس لئے کہلایا کہ جناب مکران نے اس علاقے کو شرف اقامت عطا فرمایا۔ کرمان ایک ملک کا نام اس لئے پڑا کہ حضرت کرمان نے اسے اپنی اقامت کے لئے پسند فرمایا۔ سروچ اور دشت سروچ حضرت سروچ سے منسوب ہیں۔ مدینہ دراصل مدینتہ النبی ہے۔ کاظمین، کراچی، حیدرآباد، رحیم یار خان وغیرہ سب اسی قبیل کے نام ہیں اور اپنے بانیوں کے نام پر آباد ہوئے ہیں۔

کیچ سے پسران میر جلال خان کا انخلاء

مولانا دیر مانی نے ایک موقعہ پر فرمایا کہ اگر رند اور لاشار میر جلال خان کے فرزند ہوتے تو کیچ میں ان کا چرچا ضرور ہوتا لیکن یہاں ہوت کے سوا لوگ کسی قوم سے متعارف نہیں ہیں۔ مولانا کا ارشاد بجا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جب میر جلال خان کے سعادت مند فرزند، کیچ کا تخت وتاج اپنے چھوٹے بھائی کے حق میں چھوڑ کر چلے گئے تو اس خدشہ کے پیش نظر یہ صاحبزادے پھر واپس نہ آجائیں۔ ان کے خلاف ان کے معائدین نے کچھ ایسا پروپیگنڈہ کیا کہ لوگوں کو ان کا نام تک یاد نہ رہا اور وہ کیچ کے لئے اجنبی بن کر رہ گئے۔

مثال کے طور پر ایک واقعہ عرض کرتا ہوں کہ جب حضرت امام زین العابدین صلوات اللہ علیہ اپنے لٹے پٹے قافلے کے ساتھ مدینہ طیبہ کو واپس آرہے تھے تو راستے میں ایک پیر مرد نے ان سے حسب نسب پوچھا جب آپ نے فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے امام حسین علیہ السلام کا فرزند اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ، رسول اللہ کے چچا زاد بھائی کا پوتا ہوں۔ تو وہ یہ سن کر سخت حیران ہوا۔ اس نے کہا کہ اس طرف یہ مشہور ہے کہ امیر معاویہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھائی تھے۔ حضرت علیؓ خلیفہ راشد حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کے قاتل اور باغی خلافت تھے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی صاحبزادی نہیں تھی۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر ایسا پروپیگنڈہ نہ کیا جاتا تو کربلا کا سانحہ وقوع میں کیونکر آتا؟

یزید اپنی پرائیویٹ صحبتوں میں برملا کہتا تھا کہ میری ماں سے حسین کی ماں افضل، میرے باپ سے حسین کا باپ افضل۔ میرے نانا سے حسین کا نانا افضل ہے۔ بایں ہمہ منابر پر حضرت علی (صلوات اللہ علیہ) پر سب اس لئے کرایا جاتا کہ عوام پر ان کا تفوق ظاہر نہ ہو اور ہماری حکومت محفوظ رہے۔ یقیناً رند اور لاشار کے خلاف بھی اس قسم کا پروپیگنڈہ کیا گیا ہے۔

جس کا نتیجہ آج ظاہر ہے۔ایک دو کا معاملہ نہیں۔ایک شہر اور ایک ضلع کی بات نہیں کروڑوں بلوچ اس نظریہ کے حامی ہیں۔انہیں میر جلال خان تک شجرات اس طرح نوک زباں ہیں کہ وہ فر فر سنا دیتے ہیں۔مجھے یاد ہے کہ جب میں الحاج اللہ بخش خان علیانی کے ہمراہ فورٹ منرو گیا تو وہاں مولانا صمدانی کے ہاں ایک کوہستانی بلوچ سے نیاز حاصل ہوا۔جب میں نے پوچھا کہ تم کون بلوچ ہو تو اس نے اپنا نسب میر جلال خان تک سنا دیا اور اس نے بتایا کہ ہمارے بچے ذرا سمجھدار ہوتے ہیں تو ہم کلمہ کے بعد اپنا قومی شجرہ حفظ کراتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ نسلی اعتبار سے ہمارا قبیلہ دوسرے بلوچوں پر شرف رکھتا ہے۔ہمارے قبیلے میں سے کسی نے آج تک نہ دوسرے قبائل میں شادی کی ہے اور نہ رشتہ دیا ہے۔اسی طرح جب میں نے لائل پور (فیصل آباد) اور جھنگ کے اضلاع کا دورہ کیا تو وہاں ہر قبیلے کا اپنا الگ لوری تھا۔جس کے پاس پورے قبیلے کے شجرے محفوظ تھے۔

حرف آخر

ہمیں سوچنا چاہیے کہ جب رند، لاشار، کورائی اور ہوت قبائل کو ہم سب ممتاز قبائل میں شمار کرتے ہیں تو پھر اس بحث میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے کہ وہ میر جلال خان کے بیٹے تھے، یا نہیں تھے اور جب لاکھوں بلوچ اپنے اپنے شجروں پر ایمان رکھتے ہیں ان کی تکذیب کر کے ایک قوم میں انتشار پیدا کرنا کہاں مناسب ہے۔آج تک ہم آپس میں تلوار سے لڑتے رہے ہیں۔کیا اب قلمی جنگ شروع کر دیں۔جبکہ اخلاقی طور پر کسی کے نسب میں رخنہ انداز ہونا اچھی بات نہیں ہے۔مولانا حالی کیا خوب فرماتے ہیں۔

نکالو نہ رخنے نسب میں کسی کے
نہیں اس سے کوئی رذالت زیادہ!

دانا باپ کے دانا بیٹے

اگرچہ میر جلال خان کے بیٹے کافی طاقتور تھے۔ خاص کر رند کو باپ نے اپنی زندگی میں ہی ولی عہد مقرر کر دیا تھا۔ وہ چاہتے تو باپ کے تخت پر جبراً قبضہ کر سکتے تھے لیکن چونکہ ہوت کمسن تھا اور اس کی ماں بہرحال ان کی ماں تھی۔ انہوں نے لڑنا مناسب نہ جانا اور کیچ چھوڑ کر مختلف اطراف میں روانہ ہو گئے۔

میر رند، کرائی اور جاتن بمپور کی طرف منتقل ہو گئے اور قندھار تک کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ میر لاشار ایرانی بلوچستان میں جا کر آباد ہوا۔ یہ سب بھائی اپنے اپنے علاقوں میں رہے، بسے، قلعے تعمیر کئے۔ نہریں احداث کرائیں۔ گربند بنوائے، باغات لگوائے اور شان وشوکت سے زندگی بسر کر کے مالک حقیقی کے پاس جا پہنچے۔ دو پشتوں تک میر رند، کورائی اور جاتن کی اولاد قندھار اور ہرات کے درمیان پھلتی پھولتی رہی۔ نویں صدی ہجری میں یہ علاقہ بارش نہ ہونے کے سبب کچھ ایسی بری طرح قحط کی لپیٹ میں آیا کہ رند قبائل سکونت ترک کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ آؤ یہاں سے کوچ کریں اور ان غیر آباد علاقوں کو چھوڑ دیں۔ آباد زمینوں اور ندی نالوں پر قبضہ کر کے انہیں آپس میں بانٹ لیں۔ چنانچہ اپنے اپنے قبیلے کے سرداروں نے غلاموں کو حکم دیا۔

"سبک اندام سرنگ (سرخنگ) کمیت گھوڑیوں کو اصطبل سے کھول لاؤ
اور باز جیسی تیز گھوڑیوں پر زینیں رکھو
جن میں سے ہر ایک کی قیمت نو نو ہزار روپے ہے
پہاڑی دروں سے اونٹوں کو ہانک کر لے آؤ!
اپنی بیویوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ

اپنے قلعوں سے نیچے اتر آؤ
اپنے بستر، کپڑے، دریاں سرخ قالین، تکیے، دھاری دار کمبل
سانچے میں ڈھلے ہوئے پیالے
اور مکران کے بنے ہوئے آبخورے اپنے ہمراہ لے کر جاؤ
کیونکہ سردار نے یہاں نہ رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے
اور وہ کسی دور دیس کو روانہ ہونے والا ہے۔

(The popular Poetry of Balochies by M.L Dames)

رند و لاشار، سرسبز وادیوں کی تلاش میں

میر لاشار خان کا خانوادہ بھی تین پشتوں تک ایرانی بلوچستان میں حاکمانہ اقتدار کے ساتھ بسر اوقات کرتا رہا۔ انہوں نے بھی یہاں قلعے تعمیر کئے نہریں احداث کیں۔ وادیوں کو گل و گلزار بنایا۔ مگر خشک سالی کے سبب جب ندی نالے سوکھ گئے اور جانور بھوک سے مرنے لگے تو انہوں نے بھی درۂ مولا کا رُخ کیا۔ چنانچہ بلوچوں کا یہ لشکر جرار لمبے لمبے لبادے اور سرخ رنگ کے بڑے بڑے جوتے پہنے، سروں پر خود لگائے۔ جسم پر اسلحہ باندھے، تیر اور کمان سنبھالے، نقرئی دستوں کے چاقو اور خنجر لئے۔ گھوڑوں پر سوار آگے بڑھے۔ اسی طرح ٹڈی دل کی مانند ان لوگوں نے میدانوں کا رخ کیا۔ شاداب زمینوں اور چراگاہوں پر قبضہ کرتے پہاڑیوں کو اپنی کمین گاہیں بناتے آگے بڑھتے چلے گئے۔ انہوں نے ہوتوں اور کھوسوں سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کی۔ مکران اور کیچ ان کے لئے چھوڑ دیا۔ چانڈیو کو حب ندی کی وادی میں، نوح کو نلی میں، جستگانی قبائل کو اوتھل کے قریب، ڈومبکیوں کو گاج اور سیاہ آف کے اوپر، پھرش، میر عالی

اور جتوئی وغیرہ کو سیوی اور ڈھاڈر میں رندوں کو علاقہ شوران میں آباد کیا۔ لاشار نے گنداوہ پر قبضہ کیا۔ کم وبیش تیس سال تک رند اور لاشار نے کچھی کے میدانوں میں آرام سے وقت گزارا، قلعے اور شہر تعمیر کئے۔ آپس میں رشتے ناطے کئے۔ میر شہک نے اپنی دو صاحبزادیوں کا نکاح لاشاریوں سے کر دیا۔ یعنی بی بی مدی عبداللہ خان لاشاری سے بیاہی گئی اور بی بی بانڑی میر حدہ بن میر بہرام کے جسالۂ نکاح میں آئی۔ اس وقت میر شیہک تمام بلوچ قبائل کا سردار تھا۔ ان دنوں سبی اور کچھی کے ملک پر قبضہ کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد میر شہک کا انتقال ہو گیا اور اس کے نامور فرزند میر چاکر خان رند نے سبی سے باپ کا جنازہ اٹھایا اور شاہانہ جاہ وجلال کے ساتھ کچھی کے بلند وبالا اور خوبصورت گنبدوں میں دفن کیا۔ یہ مقبرہ الہ دین خان افغان نے تعمیر کرایا تھا اور خالی پڑا تھا۔ یہ مثال اب تک مشہور چلی آتی ہے کہ "گبند الہ دین رفت و گنبد شہک شد" اس مقبرے کی اسٹیشن بیل پٹ اور دنبولی کے درمیان نشاندہی کی جاتی ہے۔

(تاریخ بلوچستان از رائے بہادر ہتورام ص ۶۵)

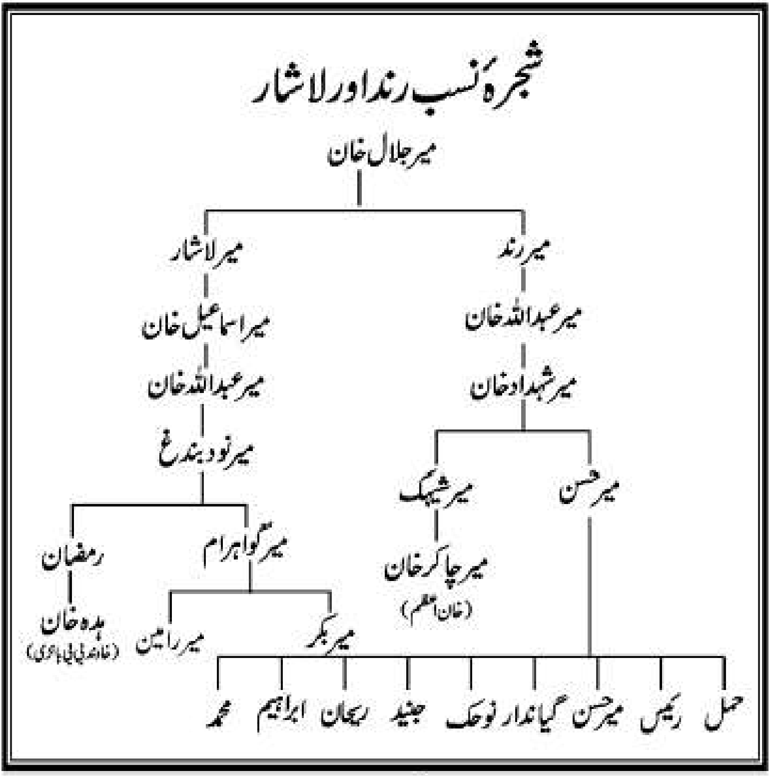

رند اور لاشار کے دو بڑے قافلے جو بیک وقت کچھی میں داخل ہوئے تھے۔ انہیں معاصرانہ حیثیت حاصل ہونی چاہیے لیکن جب ہم متداول شجروں پر نظر کرتے ہیں تو بڑا فرق معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے شجرے مرتب کرنے والوں نے احتیاط سے کام نہیں لیا اور جس ترتیب سے انہیں نسابوں سے شجرے ملے۔ انہوں نے قبول کر لئے۔ جب ہم تمام شجروں پر ایک سطحی نظر ڈالتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ امتدادِ زمانہ سے نساب شجروں کی کئی کڑیاں بھول گئے ہیں اور ایک نام کئی بار درج ہو گیا ہے۔

مسٹر ڈیمز نے میر رند کی اولاد کا جو شجرہ اپنی کتاب ''The Baloch Race'' میں دیا ہے وہ عسیر الفہم ہے۔ اس میں ایسے نام آگئے ہیں جن کا تاریخ میں وجود تک نہیں۔ ہم نے اپنے مرتبہ شجرے میں اس گنجلک کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

چاکراعظم

شعبی اساطیر کا عظیم انسان

والد ماجد کے انتقال کے بعد چاکر خان رند بلوچوں کا سردار مقرر ہوا۔ اس وقت اس کا پایۂ تخت شوران میں اور میر گواہرام کا گنداوہ میں تھا۔ چاکر خان نے قلات ریاست پر قبضہ کر کے اپنے خسر میر مندو کو اس کا گورنر مقرر کیا۔ انہی ایام میں میر حسن جو میر شہک کے حقیقی بھائی اور چاکر اعظم کے عم بزرگوار تھے۔ انتقال کر گئے۔ انہیں ان کی وصیت کے مطابق دریائے لاہڑی کے قریب پہاڑ کے دامن میں دفن کیا گیا۔ یہ مقام معروف اور زیارت گاہ خلائق ہے۔ میر حسن کے پانچ صاحبزادے تھے۔ میراں، جنید، ریحان، میر محمد خان، میر براہیم خان اور یہ چاکر خان کے دست راست تھے۔ کچھ عرصہ رند اور لاشار آپس میں پیار و محبت سے زندگی بسر کرتے رہے۔ بعد میں سبزہ زاروں، وادیوں اور سرحدی امور پر ان کے مابین تلخیاں پیدا ہوتی چلی گئیں۔ بایں ہمہ ابھی تک ظاہر داری موجود تھی۔ میلوں ٹھیلوں میں دونوں قبائل کے بچے جوان اور بوڑھے سب جمع ہو جاتے تھے۔ گھوڑ دوڑ اور کشتیوں کے مقابلوں میں حصہ لیتے۔ اونٹوں، گھوڑوں کی خرید و فروخت ہوتی اور سبی کا میلہ جو موسم بہار میں بڑے اہتمام سے منعقد ہوتا تھا۔ ان دونوں قبائل کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ایک سال حسب معمول یہ میلہ شان سے منعقد ہوا۔ گھوڑ دوڑ کے لئے کافی شہسوار تیار تھے لیکن میر ریحان رند اور میر رامین لاشار کے مقابلے کا زیادہ چرچا تھا۔ دفعتہً نقارے پر چوٹ پڑی۔ دونوں سواروں نے باگیں اٹھائیں اور میر ریحان آگے نکل گیا۔ میر رامین اپنی شکست سے بوکھلا اٹھا۔ اس نے کہا میرے ساتھ دھوکہ ہوا ہے کسی شیطان نے میری گھوڑی کا تنگ ڈھیلا کر دیا تھا۔ میدان میں عام بھگدڑ مچ گئی اور لاشاری غم و غصہ سے پیچ و تاب کھاتے گھوڑے دوڑاتے میدان سے نکل کر چلے گئے۔

کچروک (کچھڑو) کے چشمے پر!

تیسرے دن صبح سویرے چاکر اعظم سیر کے لئے باہر نکلے۔ کچروک کے چشمے پر انہوں نے دیکھا کہ بے شمار اونٹنیاں بھاگی بھاگی پھر رہی ہیں اور ان کے پستانوں سے دودھ ٹپک رہا ہے۔ میر چاکر خان نے ایک چرواہے کو بلا کر اس بارے میں سوال کیا۔ دفعتہ ایک خاتون جو اس گلے کی مالکہ تھی نمودار ہوئی۔ اس نے کہا۔ میرے آقا جانوروں میں وبا پھیل چکی ہے۔ اس لئے شتر بچے مرتے جارہے ہیں۔ مامتا کی ماری اونٹنیاں بے چین ہو کر ادھر ادھر بھاگی پھرتی ہیں اور ان کا دودھ بے اختیار پستانوں سے ٹپک رہا ہے۔

چاکر اعظم نے اس بی بی سے رنج وغم سے ملے جذبات کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور گھوڑے کو آگے بڑھایا لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ چپے چپے پر اس بی بی کے شتر بچے کٹے پڑے ہیں۔ جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ انہیں تلوار سے ذبح کیا گیا ہے۔ میر چاکر نے ایک چرواہے کو پاس بلا کر کہا سچ سچ بتاؤ کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ چرواہے نے دست بستہ عرض کی۔ میرے آقا! پرسوں چند لاشاری نوجوان گھوڑے دوڑاتے ہوئے آئے اور انہوں نے شتر بچوں کو ذبح کر ڈالا۔ حضور! پرسوں سے اونٹنیاں بے قرار پھرتی ہیں۔ بچاری کل تک اپنے بچوں پر گری پڑی تھیں۔ ہم لوگ ڈنڈے مار مار کر یہاں سے ہٹا لے گئے۔ میری مالکن نے اصل واقعہ حضور کے آگے اس لئے نہیں رکھا کہ وہ حضور کی غیرت سے اچھی طرح واقف ہے اور نہیں چاہتی کہ اس کی وجہ سے ناحق خون خرابہ ہو۔

چاکر اعظم غم وغصہ پر قابو پا کر بولے۔ ”اے مظلوم خاتون! تم اس مقام سے کوچ کرو اور سنی کی طرف چلی جاؤ۔ جب تک تیرا بدلہ نہ لے لوں میرے لئے گھر کا پانی حرام ہے۔ میر چاکر نے فوراً اپنی فوج طلب کر لی۔ جو علی الصبح گاجان اور اس کے نواحی علاقے پر حملہ آور ہوئی۔ اس نے میر گواہرام کے ایک دُگ کو ہلاک کر ڈالا اور اونٹوں کے گلہ بان کا ایک بازو کاٹ دیا۔

وار کونسل

چاکر اعظم نے سبی پہنچ کر اپنے فوجی سرداروں کو طلب کیا اور کہا کہ طبل جنگ بج چکا ہے اب بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ جام مندو نے کہا کہ قبیلے کی عورتوں کو ''کوند'' کے محفوظ پہاڑ میں پہنچا دینا چاہیے اور ہمیں یہ جنگ پہاڑوں اور چٹانوں میں لڑنی زیادہ مناسب ہے۔ بی برگ نے بھی اسی خیال کی تائید کی کہ اگر جنگ لڑنی ہے تو قلعے اور خیمے گرا دیں نہری جائیداد اور مال متاع کو چھوڑ دیں اور کسی محفوظ مقام کا تعین کریں۔ میر حان نے کہا ہم پایۂ تخت چھوڑیں گے اور نہ میدانی علاقے، ہمیں آنے والی نسلوں کے لئے انہیں محفوظ رکھنا چاہیے۔ اپنے پوتوں کے لئے جو ہمارے بعد آئیں گے! فوج طلب کر لی گئی یہ تمام رند نسل سے تھے۔ سب کے سب سروں پر خود رکھے، ریشمی کوٹ اور گلوبند پہنے گھوڑوں پر سوار تھے۔ انہوں نے سرخ رنگ کے موزے پہن رکھے تھے۔ خنجروں کے دستے چاندی کے تھے۔ انگلی میں سونے کی انگوٹھی اور ہاتھ فولادی دستانوں میں چھپے ہوئے تھے۔ یہ لوگ تیر کمانوں اور حمائل سے لیس تھے۔ جنگ آزما بہادروں میں میر حان، خدا پرست حُدا، مشہور شہسوار ریحان، تلوار کا دھنی پیرو شاہ، میر بجار، صوبہا میہن، علی، جام سہاگ، علن، ہیبتان، بیبرگ، میر حسن اور میر ابراہیم جیسی نامور شخصیتیں شامل تھیں۔

(تاریخ بلوچستان ص ۹)

ادھر میر گواہرام نے بھی ایک عظیم لشکر تیار کیا۔ وہ قبیلہ نوحانی کے ہاں گئے۔ عمر نوحانی نے ایک قابل قدر کارنامہ انجام دیا کہ اس نے لاشاری لشکر کے لئے سترہ سو بیل، اٹھارہ سو دنبے ذبح کئے اور ایک سو بیس من گندم کا آٹا مہمانی کے طور پر پیش کیا۔ (سید کامل القادری صاحب نے بلوچی دنیا کے ثقافت نمبر میں سات سو مویشی اور آٹھ سو بھیڑیں درج کی ہیں۔ مگر قومی دفتر میں یہی تعداد درج ہے۔ جو ہم نے لکھی ہے۔

شاعر کہتا ہے:۔

ھبدہ سد پنڈ روہژدہ سد میش گندیم ورشتیٔ سد گوالغ

"سترہ سو بیل اور اٹھارہ سو دنبے۔ ایک سو بیس من گندم کا آٹا"

(قدیم بلوچی شاعری ص ۲۱)

میر چاکر کو لاشاریوں کے تازہ اقدام کا علم ہوا تو اس نے اپنے آدمی دشت بیابان میں جاسوسی کے لئے روانہ کئے۔ انہوں نے واپس آ کر کہا کہ ہم نے لاشاریوں کے سو گھرانوں کو ایک ساتھ کوچ کرتے دیکھا ہے۔ رند خوش ہوئے اور ان کا لشکر حرکت میں آ گیا۔ اس موقع پر بی برگ آگے بڑھا اور اس نے سردار کے گھوڑے کی لگام تھام لی اور کہا "اے چاکر! اپنی تلوار کو نیام میں کر لے۔ صرف نوحانیوں کی فوج ہزار جوانوں پر مشتمل ہے اور سرخ میانوں والے لاشاری یہاں جنگ کے ہیرو ہیں اور کفن سر پر باندھ چکے ہیں" چاکر اعظم نے کہا "یہ سب صحیح لیکن مجھے اپنی رعایا کی نظروں میں ذلیل ہونا گوارا نہیں۔ مجھے اپنے ناموس پر قربان ہونے سے نہ روکو!" بی برگ نے کہا "اے سردار! اگر آپ نے لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو پھر اپنے ناقابل تسخیر قلعے میں بیٹھ کر دشمن کا مقابلہ کیجئے تب میر جاڑو اور ریحان نے آگے بڑھ کر کہا کہ بی برگ تیروں سے ڈرتا ہے۔ اسے ہندی تلواروں سے ہول آتا ہے۔ جب ہم اپنی تلواریں لڑائی کے لئے نکالیں گے تو اسے تیروں اور تلواروں کی زد سے دور بٹھا دیں گے!"

یہ سنتے ہی بیبرگ نے چاکر کے گھوڑے کی باگ چھوڑ دی اور کہا "میں قوم کی باعصمت خواتین کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اب تم سب آؤ میں میدان جنگ میں تمہاری رہنمائی کروں گا۔

(سوگند گرانین زرتگن، نامءَ جنانی گپتگن، بیاییت سرد گءَ نون منن)

چاکر اعظم نے گھوڑا آگے بڑھایا اور للکار کر کہا "بہادرو آگے بڑھو اور دشمن کو تہس نہس کر دو!" دوسری طرف سے میر گواہرام کی گرج سنائی دی۔ "شاباش، لاشاری بہادرو، شاباش! رند

سردار میدان جنگ میں کود پڑا ہے میں اس کے مقابلے کے لئے آگے بڑھتا ہوں!''

ہر دو اطراف سے جوش دلانے کے لئے ڈھول بجنے لگے۔ پہلے ہر لشکر نے غنیم کی تیروں سے ضیافت کی۔ ازاں بعد تلواریں نیام سے نکل پڑیں۔ شدت کی جنگ شروع ہو گئی۔ رندوں کا مشہور سردار میر جاڑو مارا گیا۔ ایک لاشاری نے میر حسن کو تاک کر ایسا تیر مارا کہ اس کے سینے میں ترازو ہو کر رہ گیا۔ وہ لڑھکا اور چک پھیری کھا کر زمین پر گر گیا۔

دو بہادر رفیقوں کی موت نے چاکر اعظم کو برافروختہ کر دیا۔ تیروں کی بوچھاڑ میں آگے بڑھا اور چلا کر بولا ''بہادرو!! جاڑو اور حسن کی روحیں تمہاری بہادری کا تماشہ دیکھ رہی ہیں۔ آگے بڑھو اور دشمنوں کو کچل کر رکھ دو!''

رند بپھرے ہوئے شیر کی طرح آگے بڑھے۔ علی رند نے تاک کر ایسا تیر مارا کہ گواہرام کے پہلو میں پیوست ہو گیا۔ رامین لپک کر اس کے پیچھے سوار ہو گیا اور لاشاری سردار کو بچا لے گیا۔ لاشار کے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی۔ رندوں کا لشکر تعاقب کرنے کے لئے بڑھا مگر چاکر اعظم نے روک دیا اور پکار کر کہا ''بہادرو! تلواریں روک لو! بھگوڑوں کا تعاقب کرنا جوانمردوں کا کام نہیں۔ آؤ! رب جلیل کا شکریہ ادا کریں۔ جس نے ہمیں فتح و نصرت عطا کی۔ وہ ہمیشہ حق پر چلنے والوں کا ساتھ دیتا ہے''۔

رندوں کی پسپائی

یہ لڑائی تیس سالہ جنگ کے نام سے مشہور ہے (The Thirty year War) عرب کے ایام جاہلیت میں بنی بکر اور بنی تغلف کے مابین بھی اسی قبیل کی طویل جنگ ہوئی تھی۔ جو حرب بسوص سے موسوم ہے۔ اگرچہ مؤرخین آغاز جنگ کی تاریخ ۱۵۴۰ء لکھتے ہیں لیکن میر رحیم داد خان مولائی شیدائی ۱۴۸۰ء بیان کرتے ہیں۔ اخوند زادہ محمد صدیق لکھتا ہے کہ یہ جنگیں پچیس دفعہ لڑی گئیں۔ جن میں دس بار لاشاریوں کو اور پندرہ بار رندوں کو فتح ہوئی لیکن قابل ذکر تین

جنگیں ہیں پہلی جنگ دابانی کے قریب ہوئی۔ جس میں میر گواہرام کو شکست ہوئی۔ دوسری نلی کے مقام پر لڑی گئی اس میں لاشار نے رندوں سے اپنی شکست کا بدلہ چکا لیا۔ آخری جنگ میں رندوں کو فتح ہوئی اور لاشار ہزیمت اٹھا کر گجرات کی طرف منتقل ہو گئے۔ اب ہم دوسری جنگ کا ذکر کر رہے ہیں۔

گواہرام جب ہوش میں آیا تو اس نے اپنے دوستوں کو طلب کیا اور کہا ایک بار پھر قسمت آزمانے کے لئے تیار ہو جاؤ! ۔عمر نوحانی نے مشورہ دیا کہ اس وقت ہمیں اپنے طاقتور ہمسائیوں سے بھی مدد لینی چاہیے۔ میر گواہرام نے اس مشورہ کو پسند کیا۔ بھٹو سرداروں کے پاس عمر نوحانی کو روانہ کیا اور خود زخموں کے باوجود ڈھٹھ جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ اس موقع پر بے اختیار یہ چند اشعار میر گواہرام کی زبان پر آ گئے۔ جوان کے خیالات واحساسات اور جذبات کے بہترین عکاس تھے۔

منہ کہ شیئر منہ طنجہ وا، واتھ
چاکرا، گورتھے منہ سرا بیتھ

''میں نے طنز کے طور پر جو نظم کہی تھی اس سے میر چاکر کے دماغ میں فتور آ گیا ہے۔''

چوں ناں گمراہ کھنہ ملک بیتھ
چوں منیں مڑداں نہ مریں نی

''سچ مچ یہ سمجھنے لگا ہے کہ شاید اس جیسا بادشاہ دنیا میں کوئی ہوا ہی نہیں۔ اور وہ ہم جیسے لوگوں کی پرواہ تک نہیں کرتا''۔

شاہ مناں باری ائے دا، روشے
منہ سمہ وہ بھٹی آں بہ چاری آں

''خدا مجھے کسی دن موقع دے گا۔ میں سمہ اور بھٹی افواج کا منتظر ہوں!''

ٹھٹھہ وی پوڑاں منہ سرا ، ریشاں

آسا پہ چاپوآں، مان داراں

"میں ٹھٹھہ کی فوجیں اس پر چڑھالاؤں گا جو ہاتھوں میں غضب کی آگ لئے آئیں گے اور رندوں کے لشکر کو آگ لگا کر ایسا منتشر کردوں گا جیسے کہ جنوبی ہوا جلتی آگ کو پھیلا دیتی ہے۔"

بنگراں گراں نپں، لوغ موغیں ماں نی

توسہ غا، دلی ترک، دلینجی بنت

"اپنے دشمنوں کے گھروں کو جلا کر بھسم کردوں گا ایسی آگ لگاؤں گا کہ اس کے دوست دہلی کے ترک بھی نہ بجھا سکیں گے"۔

الغرض لاشار اتحادی لشکروں کے ساتھ بڑی شان سے رندوں کی طرف بڑھے۔ بیبرگ کی طرح لاشار میں بھی ایک صلح جو اور شانتی پسند انسان تھا اور وہ میر گواہرام کا بوڑھا باپ میر نودبندغ تھا۔ جب اس نے سمہ اور بھٹو کی فوجیں بیٹے کی کمک پر دیکھیں تو حیران رہ گیا۔ بولا بیٹا، کل تک تم دو بھائی لڑ رہے تھے۔ آج تم غیروں کو چڑھالائے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا! اگر چاکر کو شکست ہوئی اور رند ختم ہو گئے تو نقصان کس کا ہے؟ میر گواہرام نے عرض کیا۔ ابا جان جنگ کے دوران صلح کی باتیں مناسب نہیں ہوتیں۔ لوگ اسے بزدلی پر محمول کرتے ہیں۔ چاکر اپنی فتح کے نشے میں بدمست ہو رہا ہے۔

میر نودبندغ نے فرمایا۔ چاکر نے فتح پانے کے باوجود تمہارے گھروں پر حملہ نہیں کیا۔ کسی کا مال نہیں چھینا۔ تمہاری رعایا کو پریشان نہیں کیا۔ اس نے جوانمردوں کی طرح اپنی بے عزتی کا بدلہ لے لیا ہے اور اب وہ مطمئن ہے۔ اگر تم پہل نہ کرو تو وہ بھی تم پر حملہ نہیں کرے گا۔ بیٹا! تم سے منت کرتا ہوں کہ جو آگ بڑی مشکل سے بجھی ہے اسے پھر ہوا نہ دو!

گواہرام نے عرض کیا۔ پیارے ابا! تمام لاشاری شرم سے گھروں میں دبکے پڑے

ہیں۔ اگر ہم نے رندوں سے شکست کا بدلہ نہ لیا تو ہمارا قبیلہ غیرت وحمیت کھو بیٹھے گا۔ مجھے صرف ایک دفعہ اپنی شکست کا بدلہ لینے دیجئے پھر تلوار کو توڑ ڈالوں گا!

المختصر، میر نود بندغ کی جوانوں کے آگے ایک نہ چلی اور رند ولاشار ایک دفعہ پھر گتھم گتھا ہو گئے۔ چاکر اعظم بڑی بے جگری سے لڑ رہے تھے۔ جس صف پر حملہ کرتے اسے ختم کر کے رکھ دیتے۔ میر گواہرام الگ شمشیر زنی کے جوہر دکھا رہا تھا۔ کئی دنوں تک یہ خوفناک لڑائی ہوتی رہی۔ رند بڑی بہادری سے لڑے مگر چونکہ تعداد میں تھوڑے تھے۔ لاشار کو مغلوب نہ کر سکے۔ میر حان نرغے میں پھنس گیا اور لاشاریوں نے گھیر کر قتل کر دیا۔ بی برگ گھوڑا دوڑا کر آگے بڑھا۔ گواہرام مقابلے پر نکلا۔ دونوں سرداروں نے خوب داد مردانگی دی۔ مگر ایسے عالم میں عمر خان نوحانی نے بی برگ پر تیر پھینکا اور وہ زخمی ہو گیا۔ اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”گواہرام، افسوس! بہادر اس طرح نہیں لڑا کرتے!!“

چاکر اعظم نے جب یہ کیفیت دیکھی تو اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اس کے بہادر ساتھی ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے تھے۔ وہ اپنے خون میں نہائے مگر وفاداری کے پرچم کو بلند رکھا۔ چاکر زخموں سے چور چور ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود گھوڑے پر سوار اور اپنے جوانوں کے حوصلے بڑھا رہا تھا۔ گواہرام جانتا تھا کہ چاکر شمشیر زنی میں ید طولیٰ رکھتا ہے اور کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس کے دستے نے پے بہ پے کئی تیر پھینکے جو ٹھیک نشانے پر پڑے۔ میر چاکر کی گھوڑی چھلنی ہو کر گر پڑی اور ساتھ ہی خود بھی زمین پر آ رہے۔ شجاعت وجرات کا یہ آفتاب غروب ہونے کو تھا کہ دفعتاً میر نود بندغ آ پہنچا۔ اس نے چاکر کو اٹھا کر اپنی گھوڑی پھول پر سوار کیا اور کہا بہادر چاکر! اب کسی طرف نکل جاؤ، دشمن تیری تلاش میں ہیں!

چاکر نے تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ وہ میری تلاش میں کیوں ہیں۔ میں خود ان کی تلاش میں ہوں۔ میں انہیں ڈھونڈ کر ان کا مقابلہ کروں گا۔ ابھی میری نبضیں کام کر رہی ہیں اور

میرے جسم میں خون کے چند قطرے باقی ہیں۔

میر نود بندغ نے کہا ''جاؤ چاکر! دیر نہ کرو۔لڑنے کا وقت کافی پڑا ہے۔جب تمہارے زخم مندمل ہو جائیں پھر دشمنوں سے حساب چکالینا!''

میر نود بندغ نے گھوڑی کو چھڑی لگائی اور وہ ہوا ہو گئی۔

شاعر کہتا ہے:۔

''میر چاکر مسلسل لڑنے کے سبب تھک گیا تھا۔

باایں ہمہ ننگی تلوار لئے میدان جنگ میں جما کھڑا تھا۔

اور تھکاوٹ کی وجہ سے صرف ڈھال سے لاشاری تیروں کی مدافعت کر رہا تھا!

یکا یک لاشاریوں کے تیر کی بوچھاڑ ہوئی۔

میر نود بندغ کی نظر چاکر پر پڑی۔

اس نے اپنی پھولؔ نامی گھوڑی کو موڑ کر میر چاکر کو بزور اس پر بٹھایا۔

اور گھوڑی کو بھگا دیا۔

خدا کی قدرت سے

خون سے لت پت میدان جنگ

گھیرے کھڈوں سے اس کی گھوڑی ''پھول'' صاف نکل گئی!

دشوار پہاڑوں اور گہری غاروں سے

جہاں مارخوروں کی رہائش ہوتی ہے

گھوڑی پھولؔ پہاڑ کی چوٹی پر جا پہنچی۔''

آخر یہ راز فاش ہو کر رہا اور لاشاریوں کو چاکر کے بچ کر نکل جانے کا علم ہو گیا۔میر گواہرام تو ادباً کچھ نہ کہہ سکا لیکن دوسرے لاشاری کہاں معاف کرتے۔ بہار خان نے میر نود بندغ کو

طنزاً شاباش دیتے ہوئے کہا۔ ”اے نودبندغ! تم رند ہو، لاشاری کبھی نہیں بنو گے۔ آج چاکر کو کون زندہ چھوڑتا! ہم اس کی گردن جوار کے سٹے کی طرح کاٹ ڈالتے اور سبی کی حکومت ایک ہی حملے میں جیت لیتے“۔

نودبندغ نے جواب دیا:۔

”میں رند نہیں، بلکہ لاشاری ہوں

البتہ میری ماں رند ضرور تھی

میں نے اس خاتون کا دودھ پیا ہے

جب وہ مجھے خوبصورت پنگھوڑے میں سُلا کر لوری دیتی تھی۔ تو کہتی تھی

اے نورالعین! کسی دن میر چاکر کے کام آنا!

جنگ وجدل اور قتل وغارت کے موقع پر

جب اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے

تو اسے صاف بچالینا!

مجھے ایسے ہی دن کا انتظار تھا

ورنہ چاکر کا لحاظ کون کرتا!!“

چاکر تھنک

کوہستان مری میں ایک جگہ ”چاکر تھنک“ مشہور ہے اور ایک پہاڑ کے اوپر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں چاکر کی زرہ پڑی ہوئی ہے۔ یہ پہاڑ بہت اونچا ہے۔ مری بگٹی کے کوہستانی قبائل یقین رکھتے ہیں کہ میر چاکر، صاحب کرامات تھے اور اعجازی طور پر اس جگہ آمدو شد رکھتے تھے۔

(تاریخ بلوچستان رائے بہادر ہتورام ص۔ ۱۹۔ ۲۰)

بلاشبہ اس مقام تک ہر شخص کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ میر چاکر نے لاشار سے شکست کھانے

کے بعد کچھ عرصہ یہاں گزارا۔ دشمن یہ جاننے کے باوجود کہ چاکر اس جگہ موجود ہے انہیں گرفتار نہ کرسکا۔ جب اس کے زخم مندمل ہو گئے تو اس نے چند سرداروں کی معیت میں ہرات کا رخ کیا۔

چاکر اعظم ہرات میں

چاکر خان رند ہرات کے ارادہ سے جب گھوڑی پر سوار ہونے لگے تو بے اختیار یہ اشعار ان کی زبان پر آ گئے

"مجھے اپنے مانگ والے سر کی قسم ہے جس پر پگڑی باندھتا ہوں
ایک بار لاشار پر میں ایسی آفت ڈھاؤں گا
ان کے جسم میرے تیروں اور نیزوں سے چھاننی کی طرح چھلنی ہو جائیں گے
میرے مقابلے پر آنے کی صرف وہی شخص جرأت کرسکتا ہے
جس کی موت آچکی ہو اور جس کی زندگی کا پیالہ لبریز ہو چکا ہو!"

ان اشعار سے میر چاکر کے آئندہ عزائم کی جھلک نظر آتی ہے۔ جب ان کا قافلہ ہرات کے قریب پہنچا اور سلطان کو ان کے آنے کی اطلاع ہوئی تو اس نے اپنا ایک معزز سرداران کے استقبال کے لئے بھیجا اور بڑی عزت سے اپنے ہاں ٹھہرایا۔ ہرات پر ان دنوں تیموری نسل کا ایک بادشاہ سلطان حسین حکومت کرتا تھا۔ اس سے بلوچوں کے تعلقات بے حد اچھے تھے۔

میر چاکر نے کہا:۔

"اے سلطان! ہم لوگ امن اور چین کی زندگی بسر کر رہے تھے کہ لاشار نے بلاوجہ میری بے قصور رعایا کے جانور ذبح کر ڈالے۔ ان کے گھروں کو آگ لگا دی۔ ندی، جس پر میرے ملک کی معیشت کا انحصار تھا بند کر دی۔ کھیت سوکھ گئے اور جانور پیاسے مرنے لگے۔ اس پر ان کے اور ہمارے

درمیان جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کئی بار ہمیں شکست ہوئی اور کئی دفعہ انہیں، آخری بار وہ سندھ اور بھٹو کی فوجیں لے آئے۔ ان کے مقابلے میں ہم بہت تھوڑے تھے۔ اس لئے شکست کھائی"۔

سلطان نے کہا کہ جام فیروز اور بھٹو کو پرائے جھگڑے میں ٹانگ اڑانی مناسب نہ تھی۔ یہ ان کی زیادتی ہے۔ اس کے بعد میر چاکر نے گراں قدر تحائف پیش کئے اور سلطان نے فوج کے ہمراہ کر دینے کا وعدہ کرلیا!۔

لاشاری وفد کی بازیابی

میر گواہرام کو چاکر اعظم کی روانگی کا علم ہوا تو اس نے فوراً جنگی کونسل طلب کی اور کہا:۔

"دوستو! آپ پر واضح ہو چکا ہوگا کہ شکست کھانے کے باوجود رند قبائل کی نخوت میں رتی بھر فرق نہیں آیا۔ وہ ایک اور حملے کی تیاری میں مصروف ہیں۔ آپ لوگ ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے باوجود ان کے قلعوں کی ایک اینٹ بھی قبضے میں نہیں لا سکے۔ میرے خبر رساں سپاہیوں کا کہنا ہے کہ رند سردار فوجی دستے کے ہمراہ ہرات کو روانہ ہو چکا ہے۔ شاہ حسین سے اس کے گہرے مراسم ہیں وہ یقیناً ایک زبردست کمک لے کر آئے گا۔ اگر ہم غافل پڑے رہے تو ہماری تباہی یقینی ہے۔

امراء نے مشورہ دیا کہ ہمیں بھی بلاتوقف سلطان حسین سے رجوع کرنا چاہیے اور اس سے غیر جانبدار رہنے کی درخواست کی جائے۔ ساتھ ہی بھٹو اور سمہ امراء سے مزید فوجیں منگوائی جائیں۔

چنانچہ میر گواہرام نے اپنے بہادر بیٹے میر بی بکر کو قیمتی تحائف دے کر چاکر خان کے تعاقب میں روانہ کیا اور عین اس وقت جبکہ چاکر سلطان کے دربار سے فوجی وعدے لے کر نکل رہا تھا۔ نقارے پر چوٹ پڑی اور چوبدار نے پکار کر کہا لاشار قبائل کے سردار کا ولی عہد میر بی بکر شرف باریابی حاصل کرنے کے لئے حاضر ہے!

سلطان نے فکر مند ہو کر کہا ”میربی بکر، یہ کیسے آ گیا۔ اچھا اسے حاضر کرو!“ میربی بکر ایرانی امراء کی معیت میں حاضر ہوا اور کورنش بجالانے کے بعد تحائف پیش کئے۔ ان میں ایک قالین ایسا تھا جو سونے کی تاروں سے بنایا گیا تھا۔ سلطان نے ان تحائف کو بڑی بے اعتنائی سے قبول کیا۔ کیونکہ یہ باتیں اس کی وعدہ ایفائی میں سنگ راہ بن رہی تھیں۔

شاعر کہتا ہے:۔

”سترہ سو بہادر جوانوں اور بھائیوں کے قتل کے غم میں چاکر نے ایک پہر بھی آرام نہ کیا

اور ہرات کے مشہور اور دولت سے معمور شہر میں جا پہنچا

اس نے سلطان سے امداد کیلئے درخواست کی

یہ سن کر میربی بکر، راہین اور گواہرام نے بھی (سلطان کی خدمت میں)

سونے کی تاروں سے بنا ہوا قالین بھجوایا

جسے ترک سلطان نے بے اعتنائی سے قبول کیا“

میر چاکر کے حربی کمالات اور فہم و تدبر کا امتحان

سلطان کی خدمت میں لاشاری وفد نے واشگاف الفاظ میں استدعا کی کہ یہ ہماری آپس کی جنگ ہے اور سلطان دونوں فریقوں کا دوست ہے۔ اس لئے اسے غیر جانبدار رہنا چاہیے۔ اس موقع پر سلطان کو ایک تجویز سوجھی اور اس نے اس پر فوراً عمل بھی کیا۔

اس نے اپنے ایک امیر کے ذریعے میر چاکر کو کہلا بھیجا کہ ہمارے امراء فوجی امداد دینے سے پہلے آپ کے حربی کمالات اور فہم و تدبر کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ کیا آپ اس آزمائش کے

لئے تیار ہیں؟ میر صاحب اصل مطلب کی تہہ تک پہنچ گئے لیکن سوائے اس کے اور چارہ ہی کیا تھا۔ جواب دیا کہ اگر بادشاہ کی یہی منشاء ہے تو مجھے کیا عذر ہوسکتا ہے!''

میر چاکر فوراً دربار میں حاضر ہوگئے۔ ان کے چہرے پر کسی قسم کے فکر وتردد کا نشان تک نہ تھا۔

نہتے سردار پر ہاتھی کا حملہ

بادشاہ نے کہا۔ ''اے بہادر سردار! اگر ایک آدمی تنہا ہو اور اس کے پاس ہتھیار بھی نہ ہو تو وہ اپنا بچاؤ کیسے کرسکتا ہے؟

میر چاکر نے جواب میں کہا مقابلے کے لئے اطمینان قلب ضروری ہے۔ اگر حواس قائم رہیں تو ہاتھ اور دل خود ہی اپنا ساتھی ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ہتھیار وہی ہے جو ضرورت کے وقت ہاتھ کو میسر آجائے۔

بادشاہ نے میر چاکر سے ہتھیار لے لئے اور ان کے تمام وفادار ساتھیوں کو بھی نہتا کردیا۔ انہیں ایک میدان میں لے گئے۔ بادشاہ اور امرائے دولت یہ تماشا دیکھنے کے لئے دیوان عام کی چھت پر چڑھ گئے اور میر چاکر سے کہا کہ آپ اپنی بہادری، اولوالعزمی اور مستقل مزاجی کا ثبوت دینے کے لئے ٹھہرے رہیں۔ اسی اثناء میں ایک بدمست اور خونی ہاتھی کو لے آئے۔ جس نے چھوٹتے ہی میر چاکر پر حملہ کردیا۔ رند سردار نے دائیں بائیں دیکھا۔ اس کو اور تو کوئی چیز نہ ملی۔ ایک کتیا پاس لیٹی تھی میر چاکر نے اسے ایک ٹانگ سے پکڑ کر ہاتھی کی سونڈ پر دے مارا۔ کتیا سونڈ سے چمٹ گئی اور ہاتھی گھبرا کر چنگھاڑتا ہوا واپس بھاگ گیا۔ چاروں طرف سے واہ واہ کا شور اٹھا اور سردار فاتحانہ انداز میں اپنی قیام گاہ کو لوٹ آیا۔

وحشی گھوڑے کی سواری

تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ دوبارہ ایک ایلچی تیزی سے آیا اور کہا چاکر! بادشاہ نے تمھیں طلب کیا ہے اور تم سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہے! میر چاکر پھر دربار میں گئے۔ بادشاہ نے کہا۔

''اے سردار! شاہی اصطبل میں ایک گھوڑا ہے، جو سات پشتوں سے خالص نسل کا چلا آتا ہے دوستوں اور دشمنوں کے سامنے اس پر اسی جگہ سواری کرو!''

میر چاکر نے بلا کسی تردّد کے جواب دیا ''لے آئیے! میں! اس پر سواری کروں گا!'' چنانچہ سات آدمی فولادی لگام تھامے اور سات آدمی پکڑے دھکڑے گھوڑے کو لے آئے اور ایک اندھے کنوئیں کے پاس لا کھڑا کیا۔ گھوڑے نے اُچھلنا کودنا اور ہنہنانا شروع کر دیا۔ میر چاکر گھوڑے کے قریب آئے اور کہا۔ گھوڑے کو چھوڑ دو اور تم سب چلے جاؤ!''

میر چاکر نے گھوڑے کو تھپتھپایا اور اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا:۔

''اے گھوڑے تم دُلدل کی اولاد ہو
اور میں شیہک بزرگ کا بیٹا ہوں
تمہارے ساتھ جبر کیا جا رہا ہے
اور میرے ساتھ دھوکا اور بے ایمانی
تمہارے پاس قوت ہے اور میرے پاس ذہن
سامنے والے کنوئیں کو دیکھ! جس کا منہ ہوشیاری سے ڈھکا ہوا ہے
خبردار! دوستوں اور دشمنوں کے سامنے خاموشی سے کھڑا رہ، اور دم نہ مار!''

یہ سن کر گھوڑا نرم پڑ گیا۔ اس قدر نرم کہ بچہ بھی اس کی باگ پکڑ سکتا تھا۔ چاکر اعظم لپک کر اس پر سوار ہو گئے اور سرپٹ دوڑا کر دربار عام سے باہر لے گئے اور پھر واپس لے آئے۔ دربار

ایک دفعہ پھر تالیوں سے گونج اٹھا۔ بادشاہ نے کہا ''شاباش رند سردار! آپ اس آزمائش میں بھی پورے اترے!''

میر چاکر اپنی قیام گاہ کو لوٹ گئے۔ بادشاہ انہیں کسی دوسری آزمائش میں ڈالنے کے لئے تیار نہ تھا۔ مگر لاشار امراء نے سلطان کو پھر رشوت کے طور پر قیمتی چیزیں پیش کیں۔ جس پر سلطان نے تیسری بار چاکر کی طرف اپنا ایلچی بھیجا۔

شیر سے مقابلہ

شاعر کہتا ہے۔

قاصد دوڑتے ہوئے آئے کہا

''اے چاکر! بادشاہ تمہیں پھر یاد کر رہا ہے

اور تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہے

چاکر دربار میں حاضر ہوا

بادشاہ نے کہا

میرا ایک طاقتور خونی شیر ہے

میں نے تیری موتیوں جیسی تلوار کی شہرت سنی ہے

لہٰذا اپنی تلوار اس شیر پر آزماؤ!''

ایک بڑا آہنی پنجرا لایا گیا۔ تمام لوگ مکانوں اور دیواروں پر چڑھ گئے۔ صرف رند سردار تن تنہا کھڑا رہ گیا۔ تین دن کے بھوکے شیر کو کھول دیا گیا۔ شیر دھاڑتا ہوا چاکر پر حملہ آور ہوا۔ رند سردار نے تلوار نیام سے نکالی اور اس انداز سے وار کیا کہ شیر کو کاٹ کر رکھ دیا۔ لال موزے پہنے

والے امیر کو اس دفعہ پھر فتح نصیب ہوئی۔ مذبوح شیر کی صدائے ضعیف بلند ہوئی اور ہر طرف سے آفرین آفرین کی آوازیں آنے لگیں!

مادرِ سلطان کا انتباہ

جب دربان اور خواجہ سرا سلطان کی ماں کے پاس یہ خبر لے گئے تو بیگم نے اپنے بیٹے سے کہا:۔

"چاکر رند قبائل کا سب سے بڑا سردار ہے
اور وہ تمہارے پاس مدد کے لئے آیا ہے
اب اسے زبردست فوج دو
اسے جنرل ذوالنون کی قہار فوجیں دے دو
اگر ایسا نہ کرو گے
تو میر چاکر کی خاطر
میں اپنی تیس سالہ خلوت نشینی ختم کر کے
سرخ نقاب کو الٹ کر باہر نکل آؤں گی!"

یہ سن کر بادشاہ نے (ازراہ عزت افزائی) ایک شتر بچہ میر چاکر کے نام پر ہیچ نامی مراسی کو بخش دیا۔ غالباً مراسی نے اس موقع پر میر چاکر کی بہادری پر کوئی قصیدہ پڑھا ہوگا!

فیصلہ کن جنگ

اس طرح کئی قسم کی مشکلات اور آزمائشوں سے دو چار ہونے کے بعد چاکر اعظم ایک عظیم لشکر کے ساتھ پیر لاکھا اور لاکھو کے مقام سے گزرتا ہوا سبی کے قریب پہنچ گیا۔ ہر طرف پیادے دوڑے اور آن کی آن میں کچروک (کچھڑو) کا میدان لاکھوں سواروں اور پیادوں سے بھر

گیا۔ ایک طرف رند بلوچوں کا بے قیاس لشکر تھا۔ دوسری جانب جام فیروز، بھٹو اور لاشار کی عظیم فوج، رند جوش انتقام میں لال بھبوکا ہو رہے تھے۔ اُدھر لاشار بھی پوری طرح تیار تھے۔ رند سردار نے اپنی فوج کی کثرت اور طاقت پر بھروسہ کرتے ہوئے میر گواہرام کو خطاب کیا!

"ایک مرتبہ تم اپنے کھیل میں کامیاب ہوئے اور رندوں کی تیز رفتار گھوڑیوں کو ہلاک کیا۔

جن کے ٹاپوں کا نشان درہ مولا کے نشیبی میدان میں صاف طور پر اُبھرا ہوا ہے۔

لیکن انتقام کو یاد رکھو!

کیونکہ بنگی، حسن اور ابن نودک، آدم، نودبندغ، احمد اور عظیم الشان کلو ایک ساتھ قتل ہوئے ہیں!

تم نے میدان چھوڑ دیا۔ اس کشمکش کے دن

جب رندوں کے تیر پیچھے پنڈلیوں پر برسنے لگے

تم ڈاب کے قلعہ سے بھاگ کھڑے ہوئے اور درۂ مولا کے مدخل پر جا کر سانس لی

اس کے باوجود اس قسم کا طنز ییں نے تم پر نہ کیا

اور نہ گویوں کی ٹولی طعن و تشنیع کے لئے تمہاری طرف روانہ کی!

کہ وہ تار پر مضراب مار مار کر تمہیں ایسا گانا سنائیں جس سے تمہاری خفت ہو!

یاد رکھو!

اب میں انسان ہونے کی حیثیت سے تم پر ٹوٹ پڑوں گا!

جیسے کہ ایک آدمی

جسے اس کے بھائیوں نے تباہ کر دیا ہو!

ہم تیز گھوڑیوں والے رند ہیں۔ اب ہم تمہیں پھونک دیں گے!

ہوا میں اوپر کو ہم حملوں میں دونوں جانب سے آتے ہیں

اور جو کچھ تمہارے پاس ہے اس میں سے اپنے حصے کا مطالبہ کرتے ہیں!

اے گواہرام! کان کھول کر سن!

اسی طرح میر گواہرام نے بھی اپنے لشکر کو آراستہ کرتے ہوئے چند اشعار گنگنائے جن کا ماحصل درج ذیل ہے:۔

''اہاہا! ہماری فتح بھی کیسی فتح تھی!

میں نے اپنے دشمنوں پر ایک ہلہ بولا اور جنگلی گھوڑے بھاگ کھڑے ہوئے

گورخروں کی طرح، مع پیالہ نما کھروں کے!

سبی میں ہر ایک کی زبان پر یہی تھا کہ کیا چاکر اس صدمہ سے جانبر ہو سکے گا!

چاکر مخروطی چٹان پر چڑھ گیا

مندو کے پیارے بیٹے نے پیٹھ موڑ لی

تھکا دینے والا بھیڑیا چھتنار درخت کے سائے میں اسے دیکھتا رہا!

اور وہ اس ملک میں چلا گیا جہاں جنگلی بیری پکی ہوئی تھی!''

پھر اس نے عظیم فوج سے خطاب کیا:۔

''بہادرو! ہوشیار ہو جاؤ! رند سردار اپنی خفت مٹانے کے لئے

ترکوں کی بے پناہ فوج لے کر چڑھ آیا ہے۔

ترکوں سے تم ناواقف نہیں ہو اور رندوں سے تم گزشتہ جنگ میں لڑ چکے ہو۔

آج وہ پھر تمہاری تلواروں کی زد میں ہیں۔

انہیں ایسا سبق دو کہ وہ پھر بھول کر بھی اِدھر کا رُخ نہ کریں!''

عمر نوحانی گرج رہا تھا:۔

''بہادرو! آج تم نے خود اپنی قوت بازو سے اپنی تقدیر بنانی ہے۔

یادرکھو! ذلت کی صد سالہ زندگی سے عزت کا ایک لمحہ بہتر ہے۔

اپنے گھوڑوں کو مہمیز کرو اور رندوں پر چھا جاؤ!''

رامین کہہ رہا تھا:۔

''شاباش بہادرو! اپنی زندگی کا ثبوت دو۔

اگر رند اچھے شمشیر زن ہیں، تو تمہاری تیر افگنی کا بھی جواب نہیں۔

اگر ان کے ہمراہ ترکوں کی کمک ہے۔

تو تمہارے ہمرکاب بھی ٹھٹھہ اور بھٹو کی زبردست فوجیں ہیں۔

خوب جم کر لڑو اور دشمنوں کے دانت کھٹے کر دو!''

دونوں لشکر ایک دوسرے کے محاذ میں پہنچ چکے تھے۔ گھوڑوں کے ہنہنانے اور سپاہیوں کے شوروغل سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ رندوں کے لشکر سے خان اعظم میر چاکر خان کی گرج سنائی دے رہی تھی اور وہ کہہ رہے تھے۔

''میرے شیر دل دوستو! گزشتہ جنگ میں ہم طاقت اور قوت میں دشمن سے بہت کم تھے۔

آج خدا کے فضل سے ہم ان سے تعداد اور طاقت میں زیادہ ہیں۔

دشمن پچھلی فتح کے گھمنڈ میں آج بھی فخروغرور سے سر اٹھائے چلا آتا ہے۔

آج تم نے ان سے میرحان کا بدلہ لینا ہے۔

تمہارے کتنے بہادروں کو انہوں نے دھوکہ سے مارا ہے۔

ایک ایک کے بدلے میں دشمن کے سینکڑوں سپاہی کاٹ کر رکھ دو!''

بی برگ کہہ رہا تھا:۔

''بہادرو! تمہارے جو دوست گزشتہ جنگ میں مردانہ وار لڑتے ہوئے مارے گئے تھے۔

آج ان کی روحیں تمہاری مردانگی کا تماشا دیکھنے کیلئے آسمانوں سے جھانک رہی ہیں۔

دشمن پر برق صاعقہ بن کر گرو اور انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دو!''

چاکر اعظم کا جھنڈا حرکت میں آ گیا۔ نقارے پر چوٹ پڑی۔ گھوڑے ہنہنانے لگے۔ تلواروں کی کھٹا کھٹ اور مار دھاڑ کے شور وغل سے قیامت برپا ہوگئی۔ رند اور لاشار کی جنگ جو تیس سال پیشتر شروع ہوئی تھی۔ آج پورے شباب پر تھی۔ چاکر اعظم اور ان کے بہادر رفقاء انتہائی بے جگری سے لڑ رہے تھے۔ جدھر رخ کرتے تھے صفوں کی صفیں الٹ کر رکھ دیتے تھے۔ بہادر نودبندغ جو پیرانہ سالی کے باوجود جوانوں کی طرح لڑ رہا تھا۔ ترکوں کے نرغے میں گھر گیا!

میر گواہرام نے رفیقوں سے کہا بائیں طرف زور کرو اور ابّا کو بچانے کی کوشش کرو!'' چاکر اعظم نے یہ نقشہ دیکھا تو گھبرا کر کہا ''میر نصرت! ذرا دیکھنا، میر نودبندغ ترکوں کی زد میں ہیں، میں اس پیر مرد کا مرنا پسند نہیں کرتا۔ اسے ہر قیمت پر بچاؤ!''

میر نصرت نے جواب دیا۔ ''محترم سردار! اس موقع پر اپنی فوج کو روکنا یا اسے کوئی اشارہ کرنا بھی تو ٹھیک نہیں۔ اس وقت ادنیٰ سی لغزش ہمارے لئے شکست کا موجب بن سکتی ہے''۔

اسی اثناء میں میر نودبندغ پر ترکوں کی طرف سے تیروں کی زبردست بوچھاڑ پڑی اور وہ چھلنی ہو کر گر پڑے۔ چاکر اعظم انہیں سنبھالنے کیلئے لپک کر پہنچے اور سپاہیوں کو ڈانٹ کر کہا:۔

''ہٹ جاؤ، چھوڑ و اس پیر مرد کو! یہ میرا محسن ہے۔ اس نے میری جان بچائی تھی!''

میر نودبندغ نے پانی طلب کیا۔ چاکر اعظم گھوڑے سے چھلانگ لگا کر اترے اور اپنی چھاگل سے نودبندغ کے حلق میں پانی ٹپکانے لگے۔

نودبندغ میں ابھی جان باقی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر غور سے دیکھا اور میر چاکر کو پہچان کر مرتعش آواز میں کہا:۔

''چاکر بیٹا! جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ خاندان کی عورتوں کا خیال رکھنا!'' اور ہچکی لے کر اس دارفانی سے رخصت ہو گئے۔ چاکر اعظم نے حکم دیا کہ اس بزرگ کی لاش کو بڑی عزت واحترام

سے میرے خیمہ میں لے جاؤ!

ادھر میر گواہرام کو جب صورتحال کا علم ہوا تو اُس پر رنج وغم کے بادل چھا گئے۔ایک آہِ جگر دوز کھینچ کر کہا۔اُف! میرا شفیق والد مجھ سے ہمیشہ کیلئے بچھڑ گیا۔آہ! ابّاً جان، آپ کے بغیر جینا بے کار ہے!

عمر نوحانی نے کہا۔''میر گواہرام! یہ وقت افسوس کا نہیں، خاندان کے ناموس اور عزت بچانے کا ہے''۔

اس سے میر گواہرام کے خیالات نے یکلخت پلٹا کھایا اور کہا آپ نے ٹھیک کہا۔ میں اپنے قبیلے پر سے تصدق ہونا چاہتا ہوں۔ للکار کر کہا۔''آؤ بہادرو! آگے بڑھیں!''میر گواہرام انتہائی پامردی اور جوش سے تلوار چلانے لگے۔میدان جنگ میں ایک دفعہ پھر جان پڑ گئی۔ چاکر اعظم پکار رہے تھے:

''شاباش بہادرو! دشمن تھک چکا ہے۔

یہ اس کی آخری کوشش ہے۔

آگے بڑھو اور تیس سال کی طویل جنگ کو اسی لمحے میں ختم کردو!''

ادھر سے میر گواہرام کی درد بھری آواز آرہی تھی:۔

''میرے جان نثار رفیقو! لاشار قبائل کے ناموس کی لاج رکھو۔ یادرکھو، تمہاری تھوڑی سی غفلت لاکھوں لاشاریوں کو موت کے منہ میں جھونک سکتی ہے''۔

اسی اثناء میں رندوں کی طرف سے تیروں کی بے پناہ بارش شروع ہوگئی۔ایک تیر آیا اور میر گواہرام کے سینے میں ترازو ہوگیا۔''اُف دشمن کا مقصد پورا ہوگیا''۔یہ کہا اور میر گواہرام گھوڑے سے گر پڑا۔

عمر خان نے کہا۔دوڑو! میر گواہرام کو پامال ہونے سے بچالو''۔رندوں کا لشکر پوری شدت

سے حملہ آور ہوا۔ بے سردار کا لشکر منہزم ہو کر پیچھے ہٹنے لگا۔ چاکر اعظم کے لشکر میں فتح کا نقارہ بج رہا تھا۔ لاشار مسلسل پسپا ہوتے چلے گئے۔ چاکر اعظم نے حکم دیا کہ لڑائی سے ہاتھ روک لو اور کسی کا تعاقب نہ کرو!

ترک سردار نے کہا۔ ”اے سردار! اگر تعاقب نہ کریں تو ہمیں مال غنیمت کہاں سے ملے گا“

میر چاکر نے مکرر فرمایا۔ ”میں مال غنیمت سے منع نہیں کرتا۔ مگر لاشار میری قوم ہے اس کا ناموس مجھے اپنی جان سے بھی عزیز ہے!“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”میر صاحب! تم ناموس کی حفاظت کرو، ہم اپنے مال غنیمت کی حفاظت کریں گے“۔

لاشار کا تعاقب

لاشار سردار میر گواہرام کے قتل ہو جانے پر میر رامین نے شکست خوردہ قبائل کو تباہی سے بچانے کے لئے انہیں متحد کرنے اور ٹھٹھہ کی طرف بحفاظت لے جانے کی کوشش کی اور میر چاکر کی فوج بھی ان کے تعاقب میں بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ جب لاشار ٹھٹھہ میں پہنچے تو میر رامین نے اپنے بھائی میر ابوبکر کو مع عیال واطفال بڑودہ کی طرف روانہ کر دیا اور خود بچی کھچی فوج کو لے کر دشمن کی طرف متوجہ ہوا۔ ٹھٹھہ کے قریب جو مقام اب ”رامین اوتھل“ کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں زبردست جنگ ہوئی۔ میر رامین انتہائی پامردی کے باوجود غنیم کی افواج قاہرہ کو شکست نہ دے سکا اور گجرات کی طرف منتقل ہو گیا!

لاشار گجرات میں!

لاشار قبائل کا پہلا قافلہ میر ابوبکر خان، میر احمد خان اور مراد خان کی نگرانی میں گجرات کو روانہ ہوا تھا۔ جب وہ مع الخیر پہنچ گیا تو میر ابوبکر خان نے کہلا بھیجا کہ یہاں اونٹوں کی کمی ہے۔ آپ

وہاں سے کچھ اونٹ بھجوا دیں۔ میر رایئن کو چاکر خان سے اوتھل کے مقام پر شکست ہوئی تو اس نے کافی اونٹ جمع کئے اور میر پور بٹھورو سے گجرات کو روانہ ہوا۔ حاکم سمہ کو علم ہوا تو اس نے اپنے سپہ سالار کو حکم دیا کہ بلوچوں کو مع اونٹوں کے گرفتار کرلو۔ جب فوج ریگستان میں داخل ہوئی تو سپہ سالار کو ایک جگہ ترائی میں دودھ نظر آیا۔ اس نے وہاں کے لوگوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ میر رایئن جگہ جگہ نشان کے لئے اس قسم کی ترائیوں میں دودھ چھوڑتا گیا ہے۔ سپہ سالار نے کہا کہ جو شخص ہمارے لئے نشان چھوڑتا جارہا ہے وہ اونٹ کس طرح دے سکتا ہے۔ اس لئے وہ مع فوج کے واپس لوٹ آیا اور میر رایئن بخیریت گجرات میں اپنے بھائی کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے بعد بلوچوں نے خاص طور پر کھوسہ بلوچوں نے کچھ، مالوہ اور نربدا تک اپنے جانوروں کے لئے چراگاہیں بنائیں اور تجارت شروع کی۔ جس میں انہیں کافی ترقی ہوئی۔

سلاطین گجرات کے تاریخی حالات سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں بلوچوں نے سیاست میں خاصہ مقام پیدا کرلیا تھا۔ میر فتح خان بلوچ اور اختیار الملک حسن خان دکنی نے سلطان احمد کی بجائے ساہو سلطان کو تخت نشین کیا۔ مگر اعتماد خان اور اور سید مبارک کی مدد سے سلطان احمد دوبار تخت پر قابض ہو گیا۔ چنانچہ لاشاری قبائل اعتماد خان وزیر اعظم کی مخالفت کی تاب نہ لاکر وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ واقعہ ۹۶۴ھ کے قریب کا ہے۔ میر رحیم داد خان مولائی شیدائی کا بیان ہے کہ گجرات میں لاشاری بلوچوں نے سمی اور وراہی نام کی دو ریاستیں قائم کرلی تھیں۔ (تاریخ ریاست ہند از جی بی پالیسی مطبوعہ ملتان ۱۸۷۵ھ) ابھی تک اس طرف لاشاری اور کھوسہ بلوچ بکثرت آباد ہیں اور سیاست میں خاصہ مقام رکھتے ہیں۔ بایں ہمہ لاشار کی غالب تعداد میر فتح خان کے انحطاط کے بعد سندھ کو واپس چلی آئی تھی۔ ضلع تھرپارکر میں جو لاشار قبائل آباد ہیں۔ یہ اسی دور کی یادگار ہیں۔

میر خدا بخش بجارانی مری نے ''قدیم بلوچی شاعری'' میں میر بی بکر کی ایک نظم شائع کی ہے

جوانہوں نے ۱۹۵۲ء میں کوہلو کے مقام پر میر آزاد خان بجارانی مری سے سن کر قلمبند فرمائی تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ میر بی بکر شکست کے چند سال بعد اپنے کچھ ساتھیوں سمیت بھیس بدل کر اپنے پرانے مقبوضات (کچھی) کے حالات کا جائزہ لینے کی غرض سے آیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ کل تک جہاں لاشار کا طوطی بولتا تھا۔ اب مقبوضات پر مگسی قابض ہیں۔ یہ حالات دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا۔ غم و افسوس کے ملے جلے جذبات نے اشعار کی صورت اختیار کر لی۔ اس نے طویل نظم کہہ ڈالی۔ جس میں اس نے بلوچ سرداروں کی باہمی حقد و عداوت اور جنگ و جدل پر خون کے آنسو بہائے اور پھر اپنی سابقہ اور موجودہ حالت کا موازنہ کر کے جگر دوز آہیں کھینچیں۔ یہ نظم بلوچی شاعری میں اہم مقام رکھتی ہے۔ چند اشعار کا ماحصل آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

میر گوہرام کا بیٹا میر بی بکر کچھی کو مخاطب کر کے کہتا ہے:۔

"اے علاقہ کچھی! اب تو مجھے ورغلا نہیں سکتا۔

تیری آباد فصلیں اور سنہرے گندم کے سرخ گوشے میرے لئے کوئی کشش نہیں رکھتے!

سورَی سے لے کر آباد مٹھڑی تک کا تمام علاقہ میری سبز نامی گھوڑی کے خرچ کی جاگیر تھی!

اور آج ایک قبیلہ جسے **مگسو** کہتے ہیں!

جن کی انگلیاں میری خیرات چاٹتے چاٹتے پک گئی تھیں، یہاں آباد ہے

یہ لوگ (مگسی) آباؤ اجداد سے ہمارے اسلحہ بردار تھے

افسوس کہ خوشحالی اور آسائش کو بلوچ سہہ نہ سکے۔

غرور اور تکبر میں چاکر اور گواہرام ایک دوسرے سے ٹکرائے۔

دولت اور طاقت کے گھمنڈ میں ان بہادروں نے آپس کی جنگ مول لی

اور ہاتھیوں کے پاؤں تلے روندے گئے!

ترکوں (مغلوں) نے میرے شجاع بھائیوں کو ایک ایک کر کے محلوں سے اُتارا

اورخون کے دریا بہادیئے

بے شمار فوجیں۔اور موتیں جمع ہوئیں!

جن کا شمار سینکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں ہوتا تھا!

علی الصبح بلوچ میدان جنگ میں کود پڑے!

صبح سے شام تک جنگ ہوتی رہی

اس طرح نڈر اور مغرور بہادروں کے سر

جوار کی فصل کی طرح کاٹ ڈالے گئے!!''

(قدیم بلوچ شاعری از میر خدا بخش بجارانی مری،ص ۹۷،۹۸)

میر چاکر کے تاثرات

اسی طرح رند سردار میر چاکر خان نے لاشار کو عبرتناک شکست دینے کے باوجود اس المیہ پر رنج وغم کا اظہار کیا۔اگر چہ اب وہ اپنے ملک کے علاوہ لاشار کے وسیع خطے پر بھی قابض تھا۔مگر اس کا دل اس طویل جنگ کے بعد سبیؔ اور اس کے مضافات سے متنفر ہو گیا تھا۔وہ اس سرزمین میں کیسے رہ سکتا تھا۔جس میں اس کے ہزاروں اعزاو اقارب شہید ہو چکے تھے۔اسے بتایا گیا کہ شیر خان نام کے ایک سپاہی نے شہنشاہ ہمایوں کو شکست دے کر دہلی کے تخت پر قبضہ کرلیا ہے۔ اس کے دل میں ایک نیا ولولہ پیدا ہوا کچروک (کچھڑو) کا فاتح سبی کے دشت بیدار کو چھوڑ کر پنجاب کی سرزمین پر اپنا جھنڈا لہرانے کا متمنی تھا۔وہ سبی کو چھوڑنے سے پیشتر تیس سالہ جنگ سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح سے کرتا ہے:۔

"میں مردم خور بسی کو چھوڑ دوں گا
قہر ٹوٹے میرے ناپاک دشمنوں پر (جام سمّہ اور بھٹو امراء)
ٹھٹھہ کے جام کو سہ روزہ عیش منانے دو!
تیس سال تک ہم ان دیو پیکر لوگوں سے لڑتے رہے
میری تلوار خون سے رنگین ہو گئی
وہ پکے ہوئے کماد کی طرح خمیدہ ہو گئی
چنانچہ وہ اس کجی کے سبب نیام میں نہ جائے گی
لاشار کا قلعہ ویران ہو گیا!
غضب ناک ترکوں اور رندوں نے اسے منہدم کر دیا!
اعلیٰ نسل کی گھوڑیوں پر سواری کرنے والا گواہرام اپنے دونوں قلعوں سے محروم ہو گیا!
افسوس! اب وہ گنداواہ اور دوستوں کی قبروں سے ہمیشہ کیلئے بچھڑ گیا!
دوستو! تم جہاں کہیں ہو
ہماری اس خانہ جنگی سے سبق لو
اگر رند اور لاشار متحد ہو کر مشرق کی طرف بڑھتے
تو آج ہند، چین اور جاپان ہمارے قدموں کے نیچے ہوتے!
مگر ہم نے ایک دوسرے کے گلے کاٹنے پر اپنی طاقتوں کو صرف کر دیا
اور ہمارا نصف عنصر تباہ و برباد ہو گیا!
بلوچ بھائیو! ہماری تیس سالہ جنگ تمہارے لئے درس عبرت ہے!
ہر قیمت پر آپس میں متفق و متحد رہو
ورنہ تمہارا بھی یہی حشر ہو گا جو آج ہمارا ہوا ہے"
من نہ کردم شما حذر بکنید!

رندولاشار کی جنگ پر ایک نظر

بلاشبہ رندولاشار کی جنگ دنیا کی بہت بڑی جنگ تھی جو تیس سال کے عرصہ میں پچیس بار لڑی گئی۔ پندرہ بار رندوں کو اور دس بار لاشاریوں کو فتح ہوئی۔ رندوں کو ۶۷ اور لاشار کو ۳۹ قبائل کی حمایت حاصل تھی۔ چند دوستوں نے کہا ہے کہ اس جنگ کو بلوچ تاریخ سے حذف کر دیا جائے۔اس میں کچھ شک نہیں کہ اس جنگ کے ذکر سے دل کو سخت صدمہ پہنچتا ہے کہ بلوچوں کی دو عظیم قوتیں کس طرح آپس میں ٹکراتی رہیں اور قوم کو کس قدر نقصان پہنچا لیکن اگر اتنی بڑی جنگ کو جس سے بلوچوں کے ستر اسی قبائل کے علاوہ قندھار اور سندھ کی دوز بردست حکومتیں بھی متاثر ہوئی تھیں۔ خارج کر دیا جائے تو پھر بلوچوں کی تاریخ میں رہ کیا جاتا ہے!

اس قسم کی جنگیں دنیا کی اکثر قوموں میں لڑی گئی ہیں۔ مگر کسی قوم نے انہیں اپنی تاریخ سے خارج کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ علامہ ابوالفرح اصفہانی نے عرب کی قبل از اسلام جنگوں کا جو تخمینہ لگایا ہے وہ ایک ہزار سات سو ہے۔ ان میں خرب فجار، عویرض، حرب البسوس، حرب الفروق، حرب واحس وغیرہ۔ جنگ بعاث خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان لڑائیوں میں شجاعان عرب نے داد مردانگی دی ہے۔ ان پر عرب لوگ آج تک فخر کرتے چلے آتے ہیں۔ مثلاً ربیعہ، ورید بن حمہ، عروہ بن درد، عنترہ، عتیبہؔ، عامرؔ، طفیلؔ، ابوتمامؔ وغیرہ۔ جنگوں کا سلسلہ اسلام کے بابرکت دور بنو عباس کے آخری عہد تک مسلسل قائم رہا ہے۔ وجہ خواہ کچھ کیوں نہ ہو۔ بہر حال جنگیں ہوتی رہیں۔ چاکر و گواہرام تو خیر اپنے قبائل کے سردار تھے۔ لیکن جنگ جمل میں ایسے جلیل القدر صحابہ نے حصہ لیا تھا جن کا مرتبہ فرشتوں سے بھی کہیں بڑھ کر تھا کیا امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ، سیدنا حسنؓ، سیدنا حسینؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، عمار بن یاسرؓ، محمد بن طلحہؓ اور محمد بن ابی بکر رضوان اللہ

علیہم کے فضل وکمال سے کسی کو انکار ہوسکتا ہے! اسی طرح جنگ صفین میں بھی بلند پایہ صحابی شامل تھے۔آج تک کسی مؤرخ نے ان لڑائیوں کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ ان جنگوں سے بھی لوگوں نے اچھے اچھے نتائج اخذ کئے جو آج تک اخلاقی اقدار کو اجاگر کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ مثلاً دونوں اطراف کے سپاہی جنگ کے بعد لشکروں میں آزادانہ آمد و شد رکھتے تھے۔ بنوامیہ کے لشکری حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پیچھے نماز ادا کرتے تھے اور علوی لشکر کے اکثر آدمی شامی دستر خوان پر کھالیتے تھے اور فخریہ کہتے کہ کھانا تو شامی دستر خوان پر مزہ دیتا ہے لیکن نماز علیؓ کے پیچھے مزہ دیتی ہے۔ دونوں لشکروں کے جرنیلوں نے اعلان کر دیا تھا کہ بھاگتے ہوؤں کا تعاقب نہ کیا جائے۔ کسی کو مثلہ نہ کریں۔ جنگ کے بعد مقتولوں کو اٹھانے کی اجازت تھی۔ جنگ جمل کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو زنانہ فوج کی حفاظت میں مدینہ طیبہ روانہ کیا تھا اور کسی سے انتقام نہیں لیا تھا۔

کوروؤں پانڈوؤں کی جنگ صرف اٹھارہ دن لڑی گئی۔ مگر وہ آج تک ''جنگ مہا بھارت'' کے نام سے ہندوؤں میں متداول چلی آتی ہے۔ کرشن جی نے اس موقع پر جو تقریر کی تھی وہ ''گیتا'' کے نام سے ہندوؤں کی مذہبی کتاب میں شامل ہے۔ اسے پڑھنا ثواب سمجھا جاتا ہے۔ ہندو رامائن، اور مہا بھارت کے اس حصے کو زیادہ دلچسپی سے پڑھتے ہیں جو حرب وضرب پر مشتمل ہے۔ جب ان جنگوں کے ذکر سے کسی کو نقصان نہیں پہنچتا تو رند و لاشار کی جنگ کے ذکر سے کیا خطرہ لاحق ہوسکتا ہے! کچھ دوستوں کا کیا خیال ہے کہ ایک عورت خواہ وہ گوہر کیوں نہ ہو، چاکر اعظم کو اس کی فریاد نہیں سننی چاہیے تھی؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ میر رامین نے چلتی ندی کو بند کر دیا تھا؟ ایسی حالت میں جبکہ رندوں پر پانی بند ہوچکا تھا ان کے کھیت خشک ہو گئے تھے۔ رعایا ''العطش، العطش'' پکار رہی تھی۔ سوائے جنگ کے اور چارہ کار ہی کیا رہ گیا تھا۔ چاکر اعظم کی

فوج میں میر جاڑو خان، میر خان، پیروز شاہ، میر بجار، ریحان، ہیبتان، بیبرک اور میر حسن جیسے فخر روزگار شجاع اور عقلمند لوگ موجود تھے۔ میر گواہرام کا لشکر بھی داناؤں سے خالی نہ تھا۔ کیا انہوں نے خون خرابے کو روکنے کیلئے کوشش نہ کی ہوگی!

ہم دیکھتے ہیں کہ بلوچوں کے ایک سردار نے پہل کی دوسرا سردار مقابلے میں ڈٹ گیا۔ ایک نے بھاگ کر سندھ کے حکمران سے کمک حاصل کی دوسرا قندھار کے بادشاہ کو چڑھا لایا۔ تیس سال تک لوہے سے لوہا ٹکراتا رہا۔ خون کی ندیاں بہہ نکلیں۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ مگر جب تک ان دو طاقتوں میں سے ایک ختم نہ ہوگئی۔ جنگ کی گھٹا پوری شدت سے بلوچستان کے ریگزار پر چھائی رہی۔ اس جنگ کے تلخ نتائج مُسلّم۔ مگر کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہمیں اس زمانہ کے تمدن کی صحیح جھلک اس جنگ نامہ میں ہی نظر آتی ہے۔ مثلاً

- اس دور کے بلوچ قلعوں میں رہتے تھے۔
- وہ تیر کمانوں سے لڑتے تھے۔
- ان میں گھوڑ دوڑ اور شمشیر زنی کے مقابلے ہوتے تھے۔
- وہ دیندار تھے۔ رند اور لاشار کی جنگ میں کئی حفاظ اور قاری شریک تھے۔
- جنگ کے دوران انہوں نے اخلاقی قدروں کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا تھا!
- وہ مخالف کا نان و نمک قبول نہیں کرتے تھے۔ اس لئے کہ مقابلے میں نمک حرامی کا ٹیکہ ماتھے پر نہ لگے۔ (ا۔ میر بی برگ نے میر گواہرام کا مہمان ہونے کے باوجود اس کا کھانا اس لئے قبول نہ کیا تھا کہ اگر کل کو اس سے جنگ لڑنی پڑے تو نمک حرامی کا داغ نہ لگے)
- وہ نہتے پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔

◉ ـــــ میر نودبندغ نے میدان جنگ میں میر چاکر خان رند کو اپنی گھوڑی دے کر خطرے سے نکالا

◉ ـــــ اور چاکر خان نے نودبندغ کو زخمی ہو جانے پر حفاظت سے اسے خیمے میں پہنچایا اور اس کی وصیت کا خیال رکھا!

◉ ـــــ چاکر خان کو ہرات میں کئی طرح کی آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا۔ جن کا اس نے مردانہ وار مقابلہ کیا اور ان پر پورا اترا۔

◉ ـــــ بلوچوں کے ہتھیار کس قسم کے تھے۔ وہ کس قسم کا لباس زیب تن کرتے تھے۔ وہ کس طرح لڑتے تھے اور صلح کے اوقات میں کس طرح گزارا کرتے تھے۔ ہمیں یہ سب کچھ رند اور لاشار کی جنگ سے ہی معلوم ہوتا ہے!

جنگ کے بعد

انگریز مؤرخین کا بیان ہے کہ رند لاشار جنگ کا آغاز ۱۵۴۰ء میں ہوا تھا۔ مگر میر رحیم داد خان مولائی شیدائی ۱۴۸۰ء لکھتے ہیں۔ اس جنگ کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ پچیس سال اور بروایت دیگر تیس سال کی مدت میں لڑی گئی تھی۔ اگر ان روایات کو صحیح مان لیا جائے تو آغاز جنگ کی دونوں تاریخیں غلط قرار پاتی ہیں۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ آخری فیصلہ کن جنگ ۸۹۰ھ مطابق ۱۴۸۵ء میں ہوئی تھی اور ۱۴۸۶ء میں چاکر اعظم نے سمہ اور بھٹو کے متحدہ محاذ کو دندان شکن شکست دے کر لاشار پر کامل فتح حاصل کر لی تھی۔ اس جنگ میں ذوالنون بیگ کا نام کئی بار آیا ہے۔ یہ قندھار کا حاکم اور سلطان حسین والی ہرات کا صوبیدار تھا۔ سلطان کے حکم سے ہی اس نے میر چاکر کی مدد کی تھی۔ قاضی عبدالحق، تمن ڈومبکی کے تاریخی پس منظر میں لکھتے ہیں کہ لاشار کو شکست دینے کے بعد میر چاکر خان نے بھاگ سے چھ میل جنوب کو خانقاہ پیر اولیاء کے

قریب فتح پور نام سے ایک شہر آباد کیا تھا اور اسی میں سکونت اختیار کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ تا حال بام چاکر کا اس جگہ نشان موجود ہے۔

میر چاکر نے اس دارالحکومت میں کچھ عرصہ سکھ چین سے گزارا۔ پھر ان کے چچا زاد بھائیوں میر محمد خان اور میر ابراہیم خان نے کچھ اس طرح کی خودسرانہ حرکتیں شروع کیں کہ میر چاکر ان سے رنجیدہ ہوگئے اور پانچ دریاؤں کی سرزمین کو اپنا وطن بنانے کی غرض سے ملتان کو روانہ ہوئے۔ تمن ڈومبکی کا متن یہ ہے:۔

"بخیال گرفتن ملک پنجاب و ہندوستان کو چیدہ رواں گشت!"

پھر لکھتا ہے کہ:۔

"وقت کوچیدن از کچھی یکے نائب خودسیوی دوم درشوان سوم نائب مسمی مندو درقلات مقرر نمودہ رفتہ بود"۔

(میر چاکر خان نے کچھی سے روانہ ہونے سے پیشتر اپنے مقبوضات میں نائب مقرر کئے۔ انہوں نے اپنی مملکت کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔

(۱) سبی (۲) سُوران (۳) قلات

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ریاست قلات پر بروہیوں کا قبضہ میر چاکر خان کے پنجاب جانے کے بعد ہوا۔ جب تک میر چاکر خان بلوچستان میں رہے وہ پورے بلوچستان پر حکومت کرتے رہے۔ مستونگ گرمائی اور سبی ان کے سرمائی صدر مقامات تھے۔ ان شہروں میں جو میلے لگتے ہیں۔ یہ چاکر اعظم کی ہی یادگار ہیں۔

خان اعظم کی روانگی پر ابتداً تو میر ابراہیم خان وغیرہ اپنی ہٹ پر قائم رہے لیکن جب یہ ملک رند بہادروں سے خالی ہوگیا تو یہ بھی اس ملک میں نہ ٹک سکے اور میر چاکر خان کے عقب میں چل پڑے۔

(دفتر تمن ڈومبکی محررہ ۲۵ ستمبر ۱۸۹۹ء)

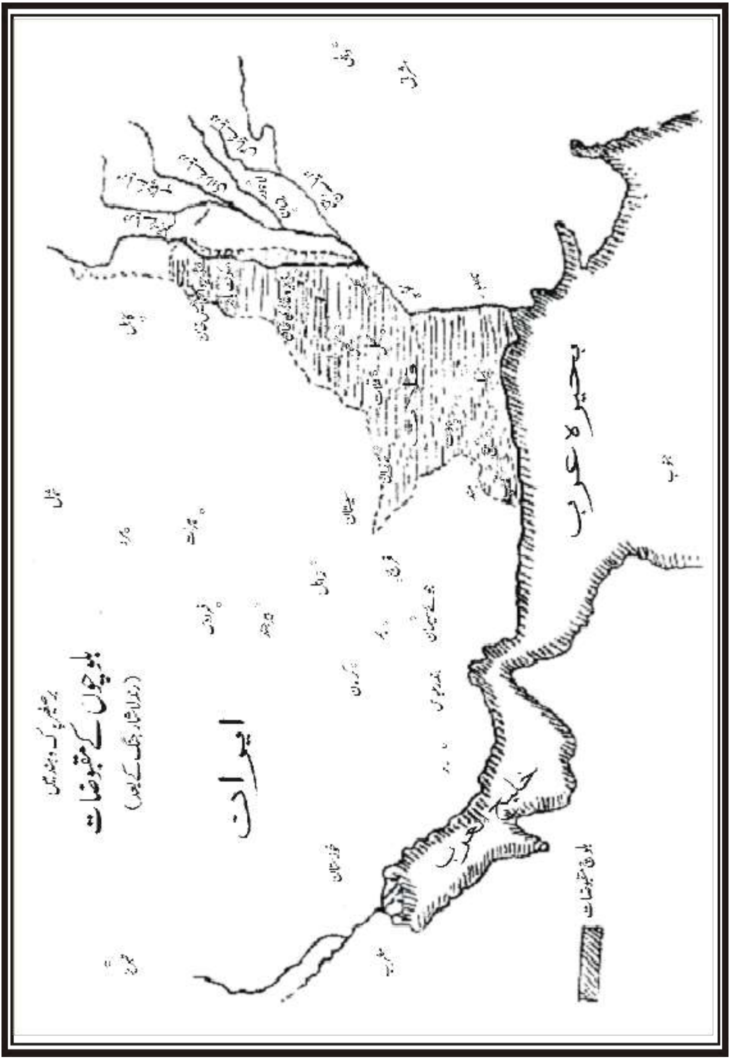

پرتگیزوں کے مقبوضات
ایران
بحیرۂ عرب

بلوچوں کا پاک و ہند میں داخلہ

چاکر اعظم کے پنجاب کی سرزمین میں داخل ہونے سے پہلے اس ملک کی کیا حالت تھی۔ اس دور میں بلوچ کہاں کہاں پہنچ چکے تھے۔ ملک کی سیاسیات میں انہیں کیا مقام حاصل تھا۔ وہ اس باب میں ملاحظہ فرمائیں۔

خشک سالی کے سبب جب رند اور لاشار کے قبائل جنوبی ایران سے کچھی کی طرف روانہ ہوئے تھے تو کورائی اور چند دوسرے قبائل اپنے اپنے سرداروں کی ماتحتی میں شمال کی طرف بڑھ گئے تھے اور کئی درہ سخی سرور کے راستے پانچ دریاؤں کی سرزمین میں چلے آئے تھے۔

گنگا اور سندھ کی وادیوں میں بلوچوں کی آمد کا ذکر متعدد کتابوں میں ملتا ہے۔ جن میں فرشتہ، نظام الدین احمد بدخشی، ذکاء اللہ، شرر، برلاس، طباطبائی اور معصومی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان سے زیادہ اعتماد کے لائق شیخ شہر اللہ لنگاہ کا بیان ہے جو سلطان حسین لنگاہ کے معاصر اور اپنے دور کے ولی اللہ تھے۔ انہوں نے ''تذکرہ حمیدیہ'' کے نام سے فارسی میں اپنے پیر طریقت سلطان التارکین حمید الدین حاکم رحمتہ اللہ علیہ کی سیرت مدون فرمائی ہے۔ انہوں نے شیخ جمال اُچی علیہ الرحمتہ کے حوالے سے بلوچوں کی آمد کا ذکر بڑے دلچسپ پیرائے میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:۔

''بکھر اور ملتان کے گرد و نواح میں لتھ قوم نے لوٹ مار سے ایک قیامت برپا کر رکھی تھی۔ کوئی شخص امن چین سے زندگی بسر نہیں کر سکتا تھا۔ ایک دن سلطان التارکین شیخ حمید الدین حاکم علیہ الرحمتہ خوش بیٹھے تھے۔ چند مریدوں نے حاضر ہو کر التماس کی کہ حضرت! ہم ان ڈاکوؤں اور لیٹروں کے ہاتھوں سخت پریشان ہیں جو لتھ قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ زاں بعد ڈھاٹا کھول کر مغرب کی طرف رخ کر لیا۔ ایک سندھی فقیر نے جو حضرت سے کافی بے تکلف تھا عرض کی کہ مغرب سے ٹھنڈی ہوا آرہی ہے۔ شاید جناب نے اسی وجہ سے اس جانب منہ کر لیا ہے۔ فرمایا۔ یہ بات نہیں بلکہ قوم لتھ کے استیصال کے لئے اپنے شیر بچگان کو بلا رہا ہوں۔ شیخ جمال اُچی فرماتے ہیں کہ آپ کے اس ارشاد کے تھوڑا عرصہ بعد بلوچ قوم گروہ در

گروہ اس طرف بڑھنا شروع ہوئی اور اس نے قوم لتھ کو کلیۃً ختم کر دیا''۔

(تذکرہ حمیدیہ از شیخ شہر اللہ لنگاہ ص ۴۹)

سلطان التارکین حمید الدین حاکم علیہ الرحمتہ کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ آپ مکران کے بادشاہ تھے۔ آپ نے بادشاہت ترک کر کے درویشی اختیار کی اور کیچ سے مؤ مبارک چلے آئے۔ جو ضلع رحیم یار خان کا ایک معروف مقام ہے چونکہ بلوچ آپ کے مرید تھے اور آپ کا خاندان کافی عرصہ تک بلوچوں پر حکومت کرتا رہا تھا۔ اس لئے آپ بلوچوں کو ''شیر بچگان'' سے موسوم کرتے تھے۔ آپ سلطان شمس الدین التمش کے معاصر ہیں۔ اس روایت کی رو سے باور کرنا پڑتا ہے کہ خاندان غلامان کے آغاز میں ہی بلوچوں نے اس جانب بڑھنا شروع کر دیا تھا۔

معصومی نے اپنی تاریخ میں اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ خسرو خان (کشلو خان) گورنر ملتان نے جب سلطان محمد تغلق سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا تو اس نے کوہ سلیمان کے دامن سے بلوچوں کو طلب کر کے اپنی فوج میں بھرتی کیا۔ نظام الدین احمد بھی لکھتا ہے کہ محمد تغلق سے بغاوت کرنے میں کشلو خان نے بلوچوں سے مدد لی تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ملتان کے گردو پیش اس زمانے میں بھی بلوچ آباد تھے۔ ورنہ قریب العہد مؤرخین بلوچوں کا ذکر اس انداز میں نہ کرتے!

لیفٹیننٹ میکلیگن نے بھی ایک فارسی دستاویز کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ سلطان حسین لنگاہ کے زمانے میں کوہ سلیمان کے دامن میں بلوچ بڑی طاقت رکھتے تھے اور انھوں نے سلطان کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اس سے زیادہ وزنی شہادت شہنشاہ بابر کی ہے۔

۱۵۱۹ء میں اس نے جب ہندوستان پر حملہ کیا اور وہ بھیرہ کے قریب خیمہ زن ہوا تو اس نے بلوچوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے ایک مصاحب حیدر علمدار کو ان کے پاس بھیجا۔ چنانچہ بھیرہ اور اس کے گردو پیش کے بلوچ سردار شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ایک کمیت گھوڑا

بطور نذرانہ پیش کر کے اپنی اطاعت کا اظہار کیا۔ بابر نے ان کی جاگیریں ان کے نام بحال رکھیں اور آگے بڑھ گیا۔ (تزک بابری)

۱۵۲۵ء میں بابر نے جب دوبارہ حملہ کیا اور دولت خان صوبیدار سے لاہور فتح کر لیا تو اسے سرزنش کرتے ہوئے کہا کہ میں نے تمہیں اور تمہارے بیٹوں کو بلوچوں کے ہاتھوں بے عزت ہونے سے بچایا ہے (اے تزک بابری) شہنشاہ کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاہور اور اس کے مضافات میں بلوچ امراء اتنا سیاسی اقتدار حاصل کر چکے تھے کہ جسے چاہتے لاہور کا صوبیدار بنا دیتے اور جسے چاہتے ہٹا دیتے۔ لودھی حکومت برائے نام رہ گئی تھی۔ اس لئے شہنشاہ نے دولت خان پر واضح کیا کہ اس نے لاہور فتح کر کے گویا اس پر ایک قسم کا احسان کیا ہے۔

شمالی سندھ میں بلوچوں کی آبادیاں

ایسے حالات میں جبکہ لاہور اور بھیرہ میں بلوچ سرداروں کا طوطی بول رہا تھا۔ بلوچوں کا ایک اور کارواں پنجاب کی طرف بڑھا۔ اس نواح پر چھا جانے کی تفصیلات نظام الدین احمد بدخشی سے سنیے، لکھتے ہیں کہ:۔

ان دنوں ملتان پر سلطان حسین خان لنگاہ حکومت کر رہا تھا چونکہ اسے آئے دن کوہ سلیمان کے بلوچوں کی بغاوتوں اور شورشوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ اس لئے اس نے ان سے پیچھا چھڑانے اور اپنی عسکری طاقت بڑھانے کے لئے اپنے قدیم دوستوں ملک سہراب خان دودائی اور جام اسماعیل خان ہوت کو ملتان آنے کی دعوت دی۔ یہ لوگ مکران سے ہزاروں جانباز بلوچ نوجوانوں کو جلو میں لئے ملتان پہنچے اور سلطان نے دین کوٹ سے کوٹ کروڑ تک کا علاقہ ان کی سرداری میں دے دیا۔ جب یہ خبر سندھ پہنچی تو سردار حاجی خان میرانی بھی اپنے جواں سال بیٹے غازی خان اور اپنے قبیلے کے سینکڑوں کڑیل نوجوان ہمراہ لے کر ملتان آ گیا۔ سلطان نے اسے بھی ہاتھوں

ہاتھ لیا اور کوٹ کروڑ سے سیت پور کا علاقہ کوہ سلیمان کے دامن تک اسے دے دیا۔ جب کوہستانی لوگوں کو نئے قابضین کی آمد کا علم ہوا تو وہ بڑے جُز بز ہوئے اور اپنی اپنی گھاٹیوں سے نکل کر دریائے سندھ تک پھیل گئے۔ سردار حاجی خان کو اپنی ریاست پر قبضہ کرنے کے لئے ان سے کافی جنگیں لڑنا پڑیں اور اس نے اتنے قبائلی قتل کئے کہ ان کے خون سے دریائے سندھ کا پانی سرخ ہو گیا۔

اسی طرح ملک سہراب اور جام اسماعیل کو بھی اپنے علاقوں پر قبضہ کرنے میں خاصی دشواریاں پیش آئیں۔ چونکہ ملک سہراب کو سلطان نے اپنے دربار سے وابستہ کرلیا تھا۔ اس لئے وہ مستقل طور پر ملتان میں رہتا تھا۔ جاگیر میں اس کا بیٹا بابر بن سہراب حکومت کرتا تھا۔ ابتداءً ملک بابر بن سہراب نے اپنے نام پر کوٹ بابر کی بنیاد ڈالی اور لسکانی، کلاچی، کورائی اور دوسرے بلوچ سرداروں کے علاوہ جام اسماعیل خان نے بھی اسی کو اپنا مستقر قرار دیا اور جب اس کی اپنی جاگیر لیٹروں اور قبائل حملہ آوروں سے خالی ہو گئی تو اس نے کوٹ بابر سے بیس میل شمال کو دریائے سندھ کے غربی کنارے اپنے نام پر ڈیرہ اسماعیل خان آباد کیا۔ بابر کو کافی عرصہ میرانی اور کوہستان بلوچوں سے جنگیں لڑنا پڑیں۔ آخر کار طویل حرب وضرب سے تنگ آ کر اپنے والد کے ہاں ملتان چلا آیا۔ یہاں شہر سے دو میل مغرب کو ملک سہراب نے اس کے نام پر ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ جس کے کھنڈرات سُورہ میانی کے راستے میں سر اٹھائے نظر آتے ہیں۔ اس میں رہائش اختیار کی اور باپ کی طرح لنگاہ دربار سے منسلک ہو کر رہ گیا۔

چاکر اعظم کی آمد اور ملک سہراب کا اضطراب

چاکر خان رند پانچ دریاؤں کی سرزمین کو اپنا وطن بنانے کے لئے ملتان کی جانب بڑھا چلا آرہا تھا۔ میر محمد خان اور میر ابراہیم خان بدستور اس کے لئے دردِ سر بنے ہوئے تھے اور چند منزلیں پیچھے پیچھے چل رہے تھے اور یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ ان کا تعاقب کیا معنی رکھتا ہے۔ اس لئے چاکر اعظم نے اوچ کے حاکم جام ابراہیم سمہ سے کچھ اراضی طلب کی تاکہ عارضی طور پر قیام کر کے اپنی فوج کو تازہ دم کر سکے اور ساتھ ہی عمزادگان کی نقل و حرکت پر بھی نظر رکھ سکے۔ اگرچہ جام ابراہیم لنگاہ حکومت کا صوبیدار تھا مگر سلطان محمود کی غلط روش کے سبب یہ تقریباً خودمختار ہو چکا تھا لیکن چونکہ ملتان کی فوجی طاقت سے اسے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا۔ اس لئے اس نے چاکر اعظم کی آمد کو غنیمت جان کر اوچ اور ملتان کے درمیان معقول اراضی پیش کی۔ یہ علاقہ دریائے چناب اور ستلج کے درمیان واقع تھا۔

کوٹ چاکر

چاکر اعظم نے اس اراضی پر اپنے نام پر ایک قلعہ تعمیر کرایا جو اب تک جلال پور پیر والا اور لودھراں روڈ پر سر اٹھائے بلوچوں کے قافلے کی واپسی کی انتظار کر رہا ہے۔ جو قبائل خان اعظم کے ہمراہ آئے تھے انہیں یہاں چھوڑ کر چاکر خان اپنے بڑے لڑکے میر شہداد اور چند سرداروں کے ہمراہ سلطان محمود لنگاہ دربار میں بمقام ملتان حاضر ہوا۔ اس زمانے میں لنگاہوں کا تو صرف نام تھا۔ ان کے پردے میں بلوچ حکومت کر رہے تھے۔ ملک سہراب وزیر اعظم اور لنگر خان کی آمد آمد سنی تو ملک سہراب سہم گیا اور اسے اپنا اقبال نقش بر آب نظر آنے لگا۔ اس نے سلطان سے

صاف صاف کہہ دیا کہ جو شخص اقتدار کی خاطر اپنے تیس ہزار بھائیوں کا گلہ کاٹ سکتا ہے وہ ہمیں کب چھوڑے گا۔ بالخصوص جبکہ وہ جام ابراہیم سے جاگیر حاصل کر چکا ہے۔ اس پر اعتماد کرنا احتیاط کے منافی ہے۔ بہتر ہے کہ اسے چلتا کیجئے ورنہ میرا استعفیٰ قبول فرما لیجئے۔

سلطان چاکر اعظم کی خون آشامی سے پہلے خائف تھا۔ ملک سہراب نے اس پر رنگ وروغن چڑھایا تو وہ گھبرا اٹھا اور اس نے چاکر اعظم سے کہا کہ ملتان ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ آپ جیسے اولوالعزم اور رزم آزما جرنیل کی کیونکر متحمل ہوسکتی ہے۔ دہلی کا میدان خالی ہورہا ہے۔ آگے بڑھ کر قسمت آزمائی کیجئے۔ چونکہ ملتان کی حکومت چند دنوں کی مہمان نظر آتی تھی اور اس لئے بھی حکومت کے اہم عہدوں پر بلوچ فائز تھے چاکر خان نے کسی سے الجھنا پسند نہ کیا اور شور کوٹ کی طرف بڑھ گیا۔ شور کوٹ کا فرمانروا جام بایزید، جام ابراہیم کا قریبی رشتہ دار تھا۔ اس نے چاکر خان کو اپنا معتمد دوست سمجھ کر بڑی عزت دی اور اپنی ذاتی جاگیر میں سے اسے اور اس کے لڑکوں کو معقول اراضی عطا کی جو راوی سے دیپال پور تک پھیلی ہوئی تھی۔ فرشتہ اپنی تاریخ میں اس واقعے کی نشاندہی اس طرح سے کرتا ہے:۔

"دریں خلال ایں احوال میر چاکر رند و پسر میر شہداد از جانب سیوی ملتان آمدند۔ چوں ملک سہراب دودائی بیش سلطان لنگاہ عزت تمام داشت، میر چاکر آنجا نتوانست بود و از انجا بجام بایزید رفت، جام بایزید بسار بعزت آمدہ پارہ ازولایت دروجۂ خاصۂ خود مقرر کردہ بود، میر چاکر و فرزندان او داد و ایں جام بایزید مرد محسن و کریم العزت بود۔"

(تاریخ فرشتہ صفحات ۶۰۸ تا ۶۱۲)

اس زمانے کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جام برادران کی یہ داد و دہش مصلحت سے خالی نہیں تھی۔ جام ابراہیم نے میر چاکر کو اپنے اور لنگاہوں کے درمیان اراضی دے کر ایک قسم کی سد سکندری کھڑی کرلی تھی اور وہ ملتان کی طرف سے بے خوف ہوگیا تھا۔ جام

بایزید لودھی حکومت کا خوف مسلط تھا اور پھر بابر بھی عقاب کی طرح وادی پنجاب پر منڈلا رہا تھا۔اس نے بھی اپنے اور لاہور کے درمیان چاکر خان کو حائل کر کے گویا اپنے گرد ایک مضبوط حصار کھڑا کرلیا۔سردار غلام رسول خان قرائی تو اتنا لکھ گئے ہیں کہ میر چاکر کو پنجاب کی طرف آنے کی دعوت ہی جام برادران نے دی تھی اور خان اعظم ان کے بلاوے پر ہی اس طرف آئے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"شاہ محمود لنگاہ کی تخت نشینی پر جاموں اور دودائیوں میں تنازعہ ہوا۔جاموں نے میر چاکر کی طرف جو سبی کا رند بلوچ تھا۔ دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔میر چاکر نے جاموں کی درخواست کا جواب فوری طور پر آمنا وصدقنا میں دیا۔"

(بلوچ پنجاب میں ص ۱۸، سردار غلام رسول خان کورائی)

ملتان پر ارغون کا حملہ

میر چاکر خان نے جدید اراضیات پر قبضہ کرنے کے بعد انہیں آباد کرنے اور ان میں اپنے اور اپنے لڑکوں اور عزیزوں کے لئے محلات اور قلعے تعمیر کرنے شروع کئے کیونکہ وہ حملہ آور نہیں تھا کہ لوٹ مار کر چلا جاتا بلکہ وہ تو اپنی قوم کے لئے ایک زرخیز اراضی حاصل کرنے اور اسے اپنا اور اپنی آل اولاد کا وطن بنانے آیا تھا۔ چنانچہ اس نے اوکاڑہ کے قریب جدید ست گھرہ کی بنیاد رکھی۔عالی شان محلات تعمیر کرائے اور ان کے گرداگرد سربفلک فصیل کھڑی کر کے ایک ایسا قلعہ بنا کھڑا کیا جو لاہور کے شاہی قلعے سے چشمک زنی کرتا تھا۔اسی طرح میر چاکر کے بڑے فرزند میر شہداد نے راوی کے کنارے اپنے نام پر ایک شہر آباد کیا۔اسے کوٹ میر شہداد سے موسوم کیا اور کچھ فاصلے پر اپنے بیٹے میراں کے نام پر میر پور تعمیر کیا۔اسی طرح پاک پتن کے قریب میر شاہو خان نے اور ساہیوال وست گھرہ کے مابین میر شہک نے اپنے اپنے نام سے قلعے اور شہر

تعمیر کئے۔ ست گھرہ اور کوٹ میر شہداد کے درمیان گشکوری اور گورگیج امراء کو جاگیریں دی گئی تھیں۔ جن میں کوٹ گشکوری، فتح پور اور گور گیج نام سے کئی قلعے سطح زمین پر ابھر آئے۔ میر چاکر خان اور ان کے صاحبزادے اگرچہ اپنے نئے وطن کو سنوارنے میں لگے ہوئے تھے تاہم ملتان کے حالات سے غافل نہیں تھے۔ ست گھرہ، لاہور اور ملتان کے درمیان واقع تھا۔ تمام قافلے جو ملتان سے لاہور کو جاتے تھے یہاں سے ہو کر گزرتے تھے۔ (ست گھرہ دریائے بیاس کے کنارے واقع تھا اور دہلی کو ملتان سے ملانے والی سڑک اس کے پاس سے گزرتی تھی) اس طرح چاکر اعظم کو ہر روز نہ صرف ملتان بلکہ بلوچستان تک کا حال معلوم ہو جاتا تھا۔ لنگاہ بادشاہ چونکہ میر چاکر خان سے تعاون کرنے میں قاصر رہا تھا۔ اس لئے میر چاکر خان، ارغون کے حملے میں پوری طرح غیر جانبدار رہے۔ بلاشبہ ملک سہراب بڑا منتظم انسان تھا۔ لنگر خان کی سوجھ بوجھ بھی مسلمہ تھی۔ اگر میر سہراب مر نہ جاتا تو شاید لنگاہوں کی حکومت کو اتنا جلد زوال نہ آتا مگر چونکہ اس کی طبعی عمر ختم ہو چکی تھی۔ اس لئے حالات بھی سرعت سے بدلنے شروع ہوئے۔ تمام مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ جب تک بلوچ لنگاہ سلطنت میں دخیل رہے۔ یہ روزافزوں ترقی کرتی رہی۔ اگر شور کوٹ اور اُچ کی ریاستیں لنگاہوں کے قبضہ اقتدار سے نکل گئیں تو اس کی ذمہ داری سلطان کے شوریدہ سر لنگاہ امراء پر عائد ہوتی ہے۔ جنہوں نے بلاوجہ جام بایزید کے صاحبزادے جام عالم خان کو سر دربار ذلیل کیا تھا۔ اس وقت جام بایزید ہی اس سلطنت کا وزیر اعظم تھا۔ جام برادران کی بغاوت کے موقع پر اگر ملک سہراب اور لنگر خان ملک کے نظم ونسق کو نہ سنبھال لیتے اور سلطان کو شور کوٹ پر نہ چڑھا لے جاتے تو اسی روز دولت خان لودھی آگے بڑھ کر ملتان پر قبضہ کر لیتا۔ یہ بلوچ ہی تھے جنہوں نے لنگاہ اقتدار کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دیا مگر افسوس ہے کہ ملک سہراب کے انتقال پر جس شخص نے وزارت عظمٰی کا قلمدان سنبھالا وہ نہ صرف یہ کہ نااہل تھا بلکہ بددیانت بھی تھا۔ یہ تاریخ میں شجاع بخاری سے معروف ہے۔ سلطان حسین اوّل چونکہ سادات کا بے حد معتقد

تھا۔اس لئے اس نے اسے اپنی دامادی کا شرف عطا کیا تھا اور شاہ محمود نے ملک سہراب کے انتقال پر اسے اپنے سیاہ وسفید کا مختار بنا دیا تھا۔مگر اس نے ایسی بے ہودہ حرکتیں کیں کہ ان کے ذکر سے انسانیت شرماتی ہے۔ مولانا ذکاء اللہ اور معصوم شاہ بکھری دونوں کا بیان ہے کہ شجاع بخاری نے سلطان حسین اوّل کا داماد ہونے کے باوجود اہل حرم خاصہ خیل میں کسی کے ساتھ خیانت کی تھی اور قبل اس کے شاہ محمود اس سے انتقام لیتا اس نے زہر ہلاہل سے اس کا کام تمام کر دیا اور ایسے موقع پر سلطان کو مار ڈالا جبکہ وہ اسی ہزار نفوس کے لشکر جرار کو جلو میں لئے شاہ حسین ارغون کے ساتھ لڑنے جا رہا تھا۔مولنا بہلول اور مخدوم بہاء الدین قریشی کی سفارش پر ارغون تو ستلج کو حد فاصل قرار دے کر واپس چلا گیا لیکن لنگاہوں کے لشکر میں جو انتشار پیدا ہو گیا تھا اس کا مداوا نہ ہوسکا۔

مادر سلطان اور امرائے سلطنت کے مشورہ سے شہزادہ حسین کو تخت نشین کیا گیا تھا۔مگر چونکہ یہ کمسن بچہ تھا۔جس طرح اسے ماں یا خاندان کی دوسری عورتیں کہتیں اسی طرح کرتا تھا۔ شجاع بخاری اتنی بڑی خیانت کے مرتکب ہونے اور سلطان کو شہید کرنے کے باوجود ابھی تک وزارت عظمیٰ پر قابض تھا۔ اس لئے لنگاہوں کی وہ عظیم الشان سلطنت جو شور کوٹ سے سکھر تک پھیلی ہوئی تھی۔اب راوی سے ستلج تک سمٹ کر رہ گئی تھی۔لنگاہ امیروں کا حوصلہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ جسے چاہتے مار ڈالتے اور کوئی ان سے اتنا نہ پوچھ سکتا تھا کہ مقتول کا قصور کیا تھا۔یہاں تک کہ انہوں نے دو گردیزی (ان کے مزارات چوک شہیداں ملتان کی ایک مسجد کے پہلو میں واقع ہیں اور چوک بھی انہی سے موسوم ہے) سادات کو جن میں سے ایک خالو اور دوسرا بھانجا تھا بے وجہ شہید کر دیا۔اس پر اہل ملتان نے مشتعل ہو کر بابر کی خدمت میں قاصد بھیجے کہ خدا کے لئے ملتان کو لنگاہوں کے ظلم وتعدی سے نجات دلائیے۔ بادشاہ نے شاہ حسین ارغون کو لکھا کہ بڑھ کر ملتان پر قبضہ کر لو چنانچہ ۹۳۳ھ میں شاہ حسین ارغون پھر ملتان کی طرف متوجہ ہوا اور منزل بمنزل

مارا مار کرتا ملتان آپہنچا۔ اس پر بھی لنگاہ امراء کا مزاج درست نہ ہوا اور وہ اپنی سابقہ روش پر قائم رہے۔ اقبال خان جو متوفی سلطان کا کوکہ اور لنگاہوں کا دلی خیر خواہ تھا قوام خان اور لنگر خان جو صاحب اقتدار امیر تھے۔ حالات کی اصلاح میں کوشاں ہوئے بھرے دربار میں ان کا مذاق اڑایا گیا۔ بجائے اس کے کہ بادشاہ انہیں ٹوکتا الٹا ہنس ہنس کر مزے لیتا رہا جس پر یہ تینوں اکابر امراء ادھر سے کٹ کر سلطان حسین سے جا ملے۔

ارغون نے آتے ہی ایک معمولی جھڑپ کے بعد شہر کا شدت سے محاصرہ کرلیا اور قحط نے اتنی نازک صورت اختیار کی کہ لوگ کتے بلی کھانے (آخر کار رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک آپہنچی کہ اگر کسی وقت کوئی بلی اور کتا ہاتھ لگ جاتا تو اس کے گوشت کو حلوان اور برہ کی طرح کھاتے تھے (تاریخ ہند از مولوی ذکاء اللہ جلد ۴ ص ۷۵) پر مجبور ہو گئے۔ اس پر شجاع بخاری نے یہ ظلم کیا کہ جس شخص کے گھر میں گندم کا گمان ہوتا اسے لوٹ لیتا تھا۔ اس نہج پر ایک سال گزر گیا۔ خلق خدا تنگ آ گئی۔ انجام کار ربیع الاوّل ۹۳۳ھ میں ارغون کے بہادروں نے فیصلہ کن حملہ کر کے ملتان کا لوہاری دروازہ توڑ دیا اور شہر میں داخل ہو کر لوٹ مار شروع کر دی۔ سات سال سے ستر سال کی عمر تک کے آدمی قید کر لئے گئے۔ لنگاہ سر چھپانے کے لئے حضرت شاہ رکن عالم علیہ الرحمتہ کے مقبرے میں گھس گئے۔ مگر محب ترخان نے انہیں چن چن کر قتل کیا اور جو بچے انہیں اسیر کرلیا۔

شاہ حسین نے دولت آخور، خواجہ شمس الدین اور لنگر خان بلوچ کو ملتان کے انتظام کے لئے چھوڑا اور خود بکھر کو روانہ ہو گیا۔ خواجہ نے شیخ شجاع بخاری کو خوب جھنجھوڑا اور اس نے اپنے ولی نعمت سے جو نمک حرامی کی تھی اور جو بد سلوکی اس نے اہل ملتان سے کی تھی ایک ایک کا حساب چکایا اور جو مال و نقد اس نے خلق خدا کو تنگ کر کے جمع کیا تھا۔ وہ سب وصول کرلیا۔ اسی طرح لنگاہ امراء کا بھی اچھی طرح سے صفایا کیا۔ گیارہ مہینے ملتان ان تین حاکموں کے نیچے دبا رہا اور خواجہ شمس الدین، شجاع بخاری اور اہل شہر کا آپریشن کرتا رہا۔ لیکن لنگر خان خاموشی سے شہر کی مرمت (لنگر خان نے ملتان کو

پھر آباد کیا، تاریخ ہند مولانا ذکاء اللہ جلد چہارم ص ۷۵) اور اہل شہر کی دلجوئی میں مصروف رہا۔لوگ جس قدر خواجہ اور شجاع بخاری سے نفرت کرتے تھے اسی سے کئی گنا زیادہ لنگر خان سے محبت کرنے لگے ۔جس سے اس کا اہل شہر سے رابطہ بڑھ گیا اور اس نے خاصی قوت پیدا کرلی اور ایک دن اس نے خواجہ کو نکال کر ملتان پر قبضہ کرلیا۔ چونکہ وہ اپنی بادشاہت پر یقین نہیں رکھتا تھا۔اس لئے اس نے چاکر خان سے مشورہ کیا۔ چاکر اعظم نے کہلا بھیجا کہ بہتر ہے ہم اور تم مل کر یہاں بلوچ سلطنت قائم کریں۔ میں تمہیں اپنا وزیر بنالوں گا۔اگر خدانخواستہ یہ صورت قابل قبول نہ ہوتو پھر تم ملتان کو بابر کے حوالے کردو۔ میں جانوں اور وہ جانے! لنگر خان نے دوسری صورت کو پسند کیا اور وہ بابر کے پاس چلا گیا۔ جو دہلی کے فتح کرنے کے بعد اپنی سلطنت کو وسیع کرنے میں مصروف تھا۔

بابر، لنگر خان کی اس پیشکش پر بہت خوش ہوا چونکہ پنجاب اور کابل اس نے مرزا محمد کامران کو دے رکھے تھے۔ اس لئے ملتان بھی اسے عنایت کیا۔ مرزا محمد کامران نے ملتان کو اپنے مقبوضات میں شامل کیا اور لنگر خان کو کابل کی صوبیداری مرحمت کی۔مرزا نے سلاطین سلف کے قاعدے کے مطابق لنگر خان کو لاہور میں آباد ہونے کی ہدایت کی۔ چنانچہ لنگر خان اہل وعیال کو لاہور میں چھوڑ کر کابل روانہ ہوگیا۔(سلاطین سلف کا یہ قاعدہ تھا کہ وہ جب کسی امیر کو کسی اہم صوبے کی حکومت تفویض کرتے تو اس کے اہل وعیال کو ضمانت کے طور پر دارالخلافے میں ٹھہرا لیتے تھے تا کہ وہ امیر بغاوت نہ کر سکے۔ چنانچہ لنگر خان کو جب کابل کی گورنری مرحمت ہوئی تو ساتھ ہی لاہور میں اسے وسیع رقبہ محلات کی تعمیر کے لئے عنایت ہوا۔لنگر خان نے اس قطعہ اراضی میں اپنے لڑکوں اور عزیزوں کے لئے محلات تعمیر کرائے اور ان کے گرد اگرد ایک محلہ آباد کیا۔جس کے مکین زیادہ تر بلوچ تھے۔ یہ تمام آبادی گزر لنگر خان کہلاتی تھی۔لنگر خان کے پیر طریقت سید محمد غوث بالا پیر علیہ الرحمتہ ست گھرہ میں رہتے تھے۔لنگر خان نے انہیں بھی لاہور میں قیام فرمانے کی درخواست کی اور اپنے محل کے متصل ان کے لئے مکانات تعمیر کرائے۔اس آبادی کو حضرت

مخدوم نے رسول پور سے موسوم کیا۔

سید محمد غوثؒ لاہور اور ست گھرہ دونوں مقامات میں رہائش رکھتے تھے۔آپ نے ست گھرہ میں انتقال فرمایا اور وہیں دفن ہوئے۔آپ کے صاحبزادے سید عبدالوہاب کا مزار بھی آپ کے پہلو میں ہے۔سید عبدالوہاب کے فرزند سید عبدالرزاق الملقب بہ شاہ چراغ نے مستقل طور پر لاہور میں سکونت اختیار فرمائی اور انتقال کے بعد وہیں دفن ہوئے۔ چنانچہ آپ کا مقبرہ ہائی کورٹ لاہور کی عمارت کے پہلو میں زیارت گاہ خلائق ہے۔

لنگر خان کے انتقال کے بعد اس کا خاندان خالصہ دور حکومت تک اس محلے میں بڑے طمطنے سے آباد رہا۔سکھوں نے میر نصیر خان نوری کے حملے کے بعد انتقام لینے کی غرض سے محلے پر ہلہ بول دیا۔بلوچوں کو قتل و غارت کیا اور سونے چاندی کے لالچ میں محلات کی بنیادیں تک کھود ڈالیں۔ انگریزوں نے اپنے عہد میں اس جگہ کو سپاٹ میدان بنا کر سرکاری عمارتیں تعمیر کرائیں۔گویا ہائی کورٹ، اکاؤنٹنٹ جنرل کا دفتر اور اسٹیٹ بینک کی عمارتیں بلوچوں کی ہڈیوں پر ایستادہ ہیں۔

(استفادہ از تحقیقات چشتی۔تاریخ لاہور از مسٹر لطیفی و نقوش لاہور نمبر)

مزنگ

محلہ لنگر خان کے قریب ہی شاہجہان کے زمانے میں حضرت عبداللہ شاہ بلوچ الرحمتہ نے ایک کوٹ تعمیر کرایا تھا ابھی وہ مکمل نہ ہوا تھا کہ حضرت کا انتقال ہو گیا۔آپ کے جانشین ملک ایزد بخش علیہ الرحمتہ نے آپ کو اسی کوٹ میں دفن کر دیا اور خود بھی وفات پا کر حضرت کے پہلو میں دفن ہوئے۔ان کے فرزند ملک سردار خان نے مقبرہ کے پاس خوبصورت مسجد تعمیر کی جو فنی اعتبار سے شہر کی مساجد میں خاص امتیاز رکھتی ہے۔ملک سردار خان مسجد کے جنوب میں محو خواب ہیں اور ان کی اولاد اس محلے میں آباد ہے۔

سردار عبدالمجید خان لاشاری

مزنگ کا دوسرا قابل ذکر خاندان ملک برکت خان کا ہے۔ یہ مزنگ کے سب سے بڑے رئیس اور مالک تھے اور اپنی قوم کے سردار تھے۔ ان کے دو صاحبزادے تھے۔ ملک فتح خان اور ملک عبدالمجید خان چونکہ ملک برکت خان کے انتقال کے وقت مؤخرالذکر کمسن بچے تھے۔ اس لئے ان کے بڑے بھائی ملک فتح شیر خان نے انہیں بمثل اولاد کے پرورش کی۔ ملک فتح شیر خان بڑے دھڑلے کے انسان تھے۔ زندگی بھر لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر رہے۔ صوبہ بھر کے بلوچ ایم ایل اے اسمبلی ہال میں جانے سے پہلے ان کے ہاں جمع ہوتے اور ایجنڈے پر بحث کی تیاری کرتے تھے۔ ۱۹۴۵ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اب سردار عبدالمجید خان لاشاری ایڈووکیٹ ہی مزنگ کے بلوچوں کے سربراہ ہیں۔ سردار صاحب میں جنگ جو، جنگ آزما جسور اور غیور قوم کے تمام اوصاف موجود ہیں۔ ان کا حسن اخلاق، جمالیاتی ذوق، نکھرا ہوا شعری رجحان ملاقاتی کو مسحور کر لیتا ہے۔ آپ کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''لغزشیں'' چھپ چکا ہے۔ ملک کے ممتاز اور نیک شہرت بیوروکریٹ کامران لاشاری ان کے لائق صاحبزادے ہیں۔

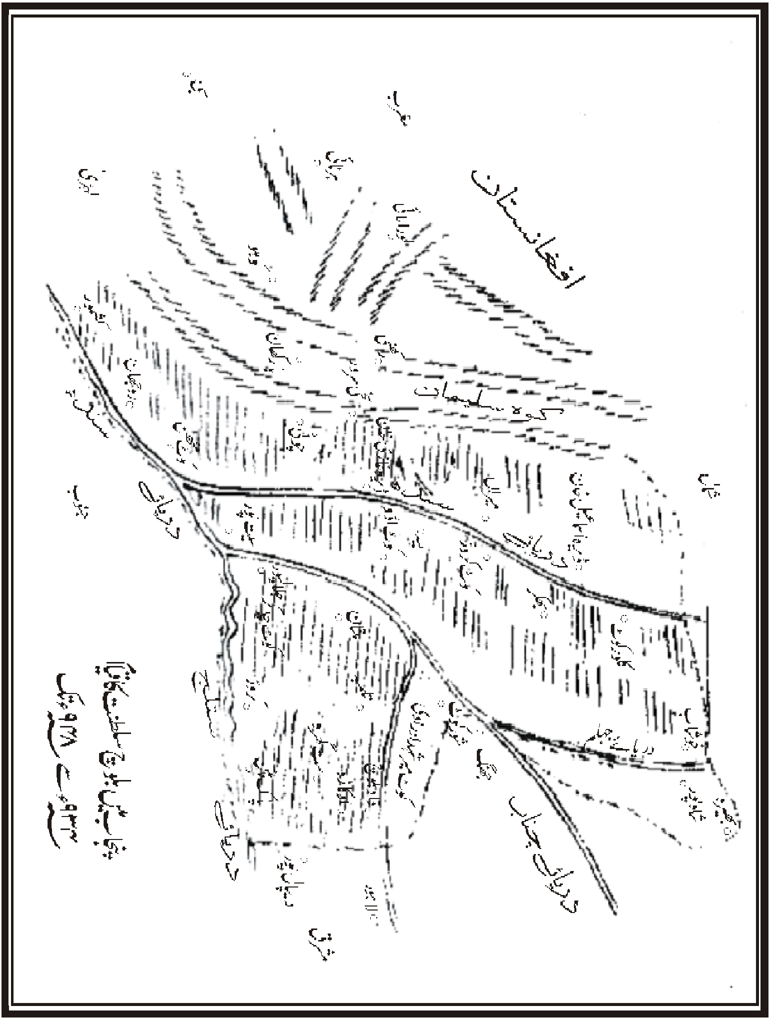
افغانستان
کوہ سلیمان
دریائے چناب

پنجاب میں بلوچی سلطنت کا قیام

وہ آیا______اس نے حملہ کیا______اور سب کچھ فتح کر لیا!

بلاشبہ چاکر خان ایک زبردست جرنیل تھا!

میر چاکر خان قبائلی تنظیم کے سلسلے میں روجھان مزاری میں مقیم تھا۔اسے شہنشاہ ہمایوں کی صحرانوردی کا علم ہوا تو وہ کوہستان مری میں پہنچ کر بادشاہ سے ملا اور اپنی خدمات پیش کیں۔لیکن ہمایوں اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ وہ بلوچوں کی فوجی قوت پر بھروسا نہ کر کے آگے بڑھ گیا۔ممکن ہے شہنشاہ نے خان اعظم کو قبائل کے منظم کرنے اور فوجی طاقت بڑھانے کا مشورہ دیا ہو، بہرحال ایسی کوئی بات ضرور ہوئی کہ چاکر اعظم نے شہنشاہ سے پلٹتے ہی ملتان پر حملہ کر کے کامران مرزا کے گورنر کو نکال بھگایا اور اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔اب میر چاکر خان کا ارادہ دہلی کی طرف بڑھنے کا تھا لیکن جن سرباز رفیقوں نے رند لاشار جنگ میں مردانگی کے جوہر دکھائے تھے۔وہ آگے چلنے پر رضامند نہ ہوئے۔میر چاکر خان کے اپنے چچازاد بھائی میر ابراہیم خان اور میر محمد خان اس معاملے میں پیش پیش تھے۔وہ وزیری کے مقام سے کچھی کے ارادہ سے آگے بڑھے اور محمد واہ میں پہنچ کر خیمہ زن ہو گئے اور در پردہ چاکر خان کے فوجی افسروں کو اپنے ہمراہ واپس بلوچستان چلنے کی دعوت دینے لگے۔

میر چاکر خان کو عمزادگان کے تازہ ارادوں کا پتہ چلا تو وہ بہت برہم ہوئے اور گرج کر کہا۔ کوئی ہے جو محمد واہ جا کر ان باغیوں کو قرار واقعی سزا دے لیکن اس وقت میر محمد خان وغیرہ کی عسکری قوت اتنی بڑھ چکی تھی کہ کسی نے اس مہم پر جانے کا بیڑہ نہ اٹھایا۔انجام کار دودائی بہادر تیار ہو گئے۔ انہوں نے محمد واہ پہنچ کر میر محمد خان وغیرہ سے شدید جنگ کی جس میں میر محمد خان، میر بشریز خان، میر ابراہیم خان کا بہادر بیٹا تھا قتل ہو گئے۔نیز محمد ابراہیم خان بھی زخموں کی تاب نہ لا کر فوت ہو گیا۔میرو خان پسر میر محمد خان اور میر آدم خان پسر میر ابراہیم خان کو کوہ سلیمان کے دامن میں منتقل ہونا پڑا۔

چاکر اعظم کو اپنے عمزادگان کی شہادت کا علم ہوا تو وہ سخت نادم ہوئے۔ دودائیوں کو طلب کر کے سخت سرزنش کی کہ تم نے میرے چچازاد بھائیوں کو کیوں قتل کیا۔ انہوں نے کہا کہ آپ کا ہی حکم تھا۔ چاکر اعظم نے فرمایا کہ میں نے تو کہا تھا کہ انہیں خوف دلاؤ اور ان کی طاقت توڑ دو نہ کہ انہیں قتل کر دو۔

خان اعظم غصہ سے بے قابو ہو گئے چونکہ میر محمد خان کی لڑائی میں ستر افراد قتل ہوئے تھے۔ ان کے بدلے ستر دودائی تہ تیغ کرا دیئے۔ (دودائی ہارا طلبا یندہ گفت کہ چرا عمزادگان مرا کشتہ پدر اوشاں گفتند کہ بحکم آں صاحب میر چاکر۔ باز گفت کہ من گفتہ بودم کہ اوشاں را خوف بدہید۔ نہ کہ اوشاں بقتل رسانید۔ آخر الامر ازیں غصہ ہفتاد کس دودائی را در کچہری خود گردن زنانید (تمن ڈومبکی کا تاریخی پس منظر) کچھ عرصہ انہوں نے ملتان (چند مدت در شہر ملتان بحکومت گزرانید زاں بعد بطرف ہندوستان روانہ گشت (تمن ڈومبکی کا تاریخی پس منظر) میں حکومت کی اور پھر اپنے بیٹے میرو خان بلوچ کو ملتان کا صوبیدار مقرر کر کے ست گھرہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اب ان کی عسکری طاقت کمزور ہو چکی تھی۔ بلوچ بہادروں کا وہ عظیم لشکر جو سبی سے سیلاب کی طرح پانچ دریاؤں کی سرزمین کی طرف بڑھا تھا وہ کئی ٹکڑوں میں بٹ چکا تھا۔

میر ہیبتان اور میر بجار پھڑ جو بلا شبہ میر چاکر خان کے دست بازو تھے۔ میر محمد خان وغیرہ کے قتل کے واقعہ سے مشتعل ہو کر میر چاکر خان سے الگ ہو چکے تھے۔

مری کی وجہ تسمیہ

میر چاکر نے میر بجار کو رام کرنے کی ہر چند کوشش کی مگر اس کے غیظ وغضب کا وہی عالم رہا۔ اور اس نے کہلا بھیجا کہ جو اپنے بھائیوں کو قتل کر سکتا ہے وہ میرا بھی کسی وقت خاتمہ کر سکتا ہے۔ اب میرا آپ کے ساتھ کسی صورت نباہ نہیں ہو سکتا۔ میر چاکر نے یہ پیغام سن کر فرمایا کہ

بجار مری ہے اسے زیادہ مجبور نہ کرو۔ اس دن سے بجار مری مشہور ہو گیا اور اس کی قوم بھی اسی نام سے موسوم ہوئی۔ مری بلوچی لفظ ہے اس کے معنی ہیں جن۔ یعنی بجار جن ہے۔ دوسرے لفظوں میں ضدی آدمی ہے۔

(تاریخ بلوچستان رائے بہادر ہیتو رام ص ۷۹)

میر چاکر خان تن بہ تقدیر آگے بڑھے۔ ابھی ملتان کے مضافات میں ہی تھے کہ نواب حاجی خان فرمانروائے ڈیرہ غازی خان کا قاصد خط لے کر حاضر ہوا جس میں اس نے ان حملہ آوروں کا ذکر کیا جو میر ہیبتان کی سرکردگی میں ڈیرہ تک بڑھ آئے تھے۔ میر چاکر نے ہیبتان کو پیغام بھیجا کہ خدا کا ملک وسیع ہے۔ اگر ہمارے ساتھ موافقت نہیں کر سکتے تو کسی اور طرف نکل جاؤ لیکن اپنے بھائیوں کو تنگ نہ کرو مگر ہیبتان کا تو اس چھیڑ چھاڑ سے مقصد ہی میر چاکر کے راستے میں کانٹے بکھیرنا تھا۔ اس نے میر چاکر کے پیغام سے کوئی اثر قبول نہ کیا اور بڑی شدت سے دودائیوں پر حملے کرنے شروع کر دیئے۔

میر ہیبتان کی وحشیانہ حرکتیں!

چاکر اعظم، قصبہ تلمبہ میں خیمہ زن تھے کہ انہیں میر ہیبتان کے حملوں کی اطلاع ملی انہوں نے امرائے دربار کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ کوئی ایسا ہے جو واپس جا کر میر ہیبتان کی گوشمالی کرے۔ مزاریوں کے سردار میر باطل خان نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں اپنے قبائل کو واپس لے جا کر اس سے جنگ کروں گا۔

چاکر اعظم میر باطل خان کی جرأت و بسالت پر خوش ہوئے انہوں نے اپنے بیٹے میر شہک اور میر بجار خان (بجار نام کے کئی سردار تھے) نامی ایک سردار کو جو رند و لاشار کی جنگ میں بڑا نام پیدا کر چکا تھا اس کے ہمراہ کر دیا۔ دریائے سندھ کو عبور کر کے دونوں فوجیں آمنے سامنے ہو

گئیں۔ میر ہیبتان نے شدید حملہ کر کے باطل خان کی فوج کو منتشر کر دیا۔ میر بجار خان اور میر شہک مارے گئے۔ ہیبتان نے اس موقع پر ایسی درندگی کا مظاہرہ کیا کہ جب تک دنیا قائم ہے۔ لوگ اس پر لعنتیں بھیجتے رہیں گے۔ اس نے چاکر اعظم کے حسین و جمیل شہزادے میر شہک (اسحق) کی لاش منگوائی اور اس کے سینے کا گوشت کاٹ کر کباب بنایا۔ اسی طرح اس نے میر بجار خان کی لمبی داڑھی کی چنوری بنائی لیکن اس حرکت کے بعد وہ بھی انتقام سے خوفزدہ رہنے لگا اور اس نے اپنی لمبی داڑھی اس خیال سے منڈوا ڈالی کہ کہیں اس سے بھی وہ سلوک نہ ہو جو وہ خود میر بجار سے کر چکا ہے۔

بیٹے کا انتقام

چاکر اعظم دیپالپور کے قریب پہنچ چکا تھا کہ اسے وحشت ناک واقعہ کی خبر ملی۔ اس نے آگے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ خان اعظم نے فوراً اپنی تلوار بے نیام کر لی اور انتقام انتقام کا نعرہ بلند کیا۔ وہ اپنے قشون قاہرہ کے ساتھ بگولے کی طرح سندھ کے کنارے آپہنچا اور دریا عبور کرنے کے بعد پوری شدت سے ہیبتان (عبدالقادر خان لغاری نے اپنے مقالے میں ہیبتان بلوچ کو ہیبت خان اعظم ہمایوں سمجھ لیا ہے جو کہ صحیح نہیں ہے کیونکہ تاریخ میں ہیبت خان اعظم ہمایوں کا سلیم شاہ سوری کے دور تک زندہ رہنا ثابت ہے۔) پر ٹوٹ پڑا۔ گھمسان کا رن پڑا مگر کوئی فیصلہ نہ ہوا کیونکہ دشمن بھی پوری طرح سے تیار تھا۔ آخر کار میر چاکر نے ایک جنگی چال کے تحت اپنی فوج کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ جسے ہیبتان نے میر چاکر خان کی پسپائی پر محمول کیا۔ سرکنڈوں کے جنگل میں میر چاکر کا نامور جرنیل میر شاہنواز خان مزاری چھ ہزار سواروں کے ہمراہ دشمن کی گھات میں تھا۔ جب ہیبتان کا لشکر صفیں توڑ کر آگے بڑھا تو میر شاہنواز خان نے اس پر حملہ کر دیا۔ ادھر سے میر چاکر خان نے جوابی حملہ کیا۔ جس پر ہیبتان کا لشکر تباہ ہو کر بھاگ گیا۔ ہیبتان جان بچانے کے لئے

پہاڑ کی طرف بھاگا مگر کسی غار میں گر کر مر گیا ایک سرگانی مزاری جو اس کے تعاقب میں تھا۔ غار میں اترا اور اس کا سر کاٹ کر میر صاحب کے پاس لے آیا۔ چاکر اعظم نے کہا:۔

''اے جوان: تو نے کیا کیا اس کی لاش کو وہیں چھوڑ آیا۔ جب سے شہک کی پسلیوں کے کباب بننے کی خبر سنی ہے میری ایک ایک پسلی کباب بن رہی ہے۔ اچھا اس کا سر توڑ کر کھوپڑی آگے لاؤ!''

خدام نے فوراً سر توڑ کر پیالہ نما کھوپڑی آگے بڑھائی۔ چاکر اعظم کی آنکھیں جوش انتقام سے شعلہ جوالہ بن رہی تھیں۔ اس نے کھوپڑی میں پانی ڈال کر چند گھونٹ نوش جان کئے اور پھر کھوپڑی پھینک دی۔

(بلوچی دنیا جولائی و اگست ۱۹۶۵ء ص ۲۶)

چاکر خان اپنے فرزند دلبند اور پرانے رفیق کار کے خون اور ان کی ہتک کا بدلہ لینے کے بعد پھر دہلی کی طرف بڑھا۔ اس بار میر بجار پھر سنگ راہ بن گیا۔ میر حاجی خان نے لکھا کہ میر بجار نے کوہ سلیمان کے بلوچوں کی مدد سے میرے ملک کو تباہ و برباد کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس کی جمعیت کافی ہے اور میں تن تنہا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میر چاکر خان نے بجار کو پیغام بھیجا کہ حاجی خان ہمارا بھائی ہے اس سے کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہ کرو ممکن ہے میر بجار اس تہدید و تخویف سے رک جاتا لیکن اس کے حلیفوں کوہ سلیمان کے قدیم بلوچ قبائل نے صورت حال کچھ ایسی پیدا کر دی کہ لڑائی ناگزیر ہو گئی ڈیرہ جات کے تمام سرداروں نے خواہ وہ کلاچی تھے یا دودائی۔ لُنڈ تھے یا میرانی، میر بجار کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیا۔

میر بجار کی بہادری اور شجاعت کی بے اختیار داد دینا پڑتی ہے۔ جب ہم یہ پڑھتے ہیں کہ اس مرد میدان نے تن تنہا تین چار حکمرانوں کا بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا اور ان کے چھکے چھڑا

دیئے تو ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی ۔ الغرض میر بجار اور ڈیرہ جات کے سرداروں کے مابین یہ جھڑپیں جاری تھیں کہ ست گھرہ سے چاکر اعظم، عظیم لشکر لے کر دودائیوں کی مدد کو آپہنچے ۔ شدید جنگ کے بعد میر بجار کو شکست ہوئی اور وہ سبی کی طرف پسپا ہو گیا۔

میر خدا بخش مری، بجارانی، میر بجار خان کی پسپائی کو نہیں مانتے وہ لکھتے ہیں کہ :۔

''میر بجار رند اور ملک سہراب دودائی کے مابین یہ جنگیں موجودہ ڈیرہ غازی خان کے مقام پر کم و بیش دس سال تک ہوتی رہیں نتیجہ کے طور پر ڈیرہ غازی خان کا علاقہ میر بجار اور دودائی قبائل کے درمیان بحصہ برابر بٹ گیا چونکہ میر بجار خان کو سبی کی یاد ہمیشہ ستاتی رہتی تھی ۔ اس لئے وہ اپنے چند ماتحت قبائل ضلع ڈیرہ غازی خان میں آباد کر کے باقی ماندہ افراد کے ہمراہ سندھ اور بلوچستان کی طرف منتقل ہو گئے ۔ جہاں یہ پہنچے اس مقام کو فتح کر کے اپنے آدمی آباد کئے چنانچہ ان کے رشتہ کا ایک گھرانہ ضلع جیکب آباد میں اب تک آباد ہے اور وہ بجارانی کہلاتا ہے ۔ ڈیرہ بگٹی کے پہاڑوں سے گزر کر میر بجار نے کاہان کو فتح کیا جو مری قبیلے کا صدر مقام ہے (پہلے یہ بلیدیوں کے قبضے میں تھا) بجارانی قبائل کئی نسلوں تک اس علاقے پر حکمران رہے ہیں ۔ میر خدا بخش مری کی کتاب کا متن درج ذیل ہے :۔

In these battles between Bijars Rinds and Malik Sohrabs, Dodais in present Dera Ghazi Khan District which lasted for about ten years which resulted in Division of the Country between Bijars followers and Dodais.Mir Bijar always irtended to retake Sibbi the original seat of Balochies, he after sitting some of his followers in Dera Ghazi Khan District, Left with rest of Rinds towards sind and Balochistan, wherever he went he settled his followers Descendents of one of his relatives live in Jacababad District and are Knouras Bijaranis.Passing through Dera Bugti Mountains, he captured kohan town town

of Present Mari tribal area from Buledi tribe where his descendents were rulers for many generations.

لیکن حقائق مری صاحب کے اس دعویٰ کی تائید نہیں کرتے کیونکہ ضلع ڈیرہ غازی خان میں کوئی ایسا تمن نہیں ملتا۔ جس کا میر بجار سے نسبی یا سیاسی تعلق رہا ہو۔ مزاری، لغاری، دریشک، کھوسہ، بزدار، قیصرانی، لُنڈ، چانڈیے، یہ تمام قبائل چاکر اعظم سے رشتہ جوڑتے اور عقیدت ظاہر کرتے ہیں۔ ان کا تاریخی پس منظر بھی اس امر کا شاہد ہے کہ یہ قبائل میر چاکر خان کے فوجی افسران کی اولاد ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو دہلی کی جنگ میں میر چاکر خان کا ساتھ دے چکے ہیں اور پھر جب بجار کاہان پہنچتا ہے تو اس کے ساتھ یک صد افراد ہوتے ہیں (مری صاحب سے واقعہ نویسی میں ایک اور سہو بھی ہوا ہے کہ انہوں نے میر حاجی خان کی بجائے ملک سہراب دودائی لکھ دیا ہے۔ ڈیرہ غازی خان سے ملک سہراب کا کیا تعلق؟ البتہ بابر بن سہراب میر حاجی خان کی پشت پر ضرور رہا ہے ۔ نیز میر بجار خان کی فاتحانہ رجعت بھی صحیح نہیں۔ (مؤلف) (ملاحظہ ہو تاریخ بلوچستان رائے بہادر ہیتو رام ص ۷۹) ظاہر ہے کہ گنتی کے ان چند نفوس سے نہ تو کوئی ملک فتح کر سکتا ہے اور نہ ہی اپنی آبادیاں قائم کر سکتا ہے۔ البتہ خان گڑھ (جیکب آباد) اور سبی کے مضافات میں میر بجار خان کے تعلق دار آباد تھے۔ جنہوں نے انہیں اپنا سردار تسلیم کر لیا اور یہ وہاں ایک اسٹیٹ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

بابر کی چشم پوشی

اس دور میں جبکہ کیچ مکران سے دیپالپور تک بلوچوں کا طوطی بول رہا تھا۔ بابر کو بلوچوں کے اس غلبے کی اطلاع ملی کہ اس نے ان کیخلاف کوئی کارروائی نہ کی خانی خان کا بیان ملاحظہ ہو۔

''انہی دنوں صوبہ بہار سے سلطان محمود کی بغاوت اور ملتان میں بلوچوں کی فتنہ انگیزی کی خبریں ملیں۔ بابر نے ملتان کے فتنہ پر شرقی علاقے کی بغاوت کو مقدم جانا۔ کیونکہ اس طرف ہر

سال ہر ماہ فتنہ اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ بادشاہ نے ولایت بہار کی طرف کوچ کرنے کا حکم دے دیا‘‘۔

(منتخب اللباب اردو ترجمہ جلد اوّل ص ۱۹۱)

۹۳۲ھ میں شاہ حسین ارغون نے ملتان کو فتح کیا تھا۔ اس کے گیارہ ماہ بعد تک خواجہ شمس الدین کا غلبہ رہا۔ لنگر خان کے عہد کو اگرچھ ماہ تک بھی طول دے لیں تو بھی ماننا پڑتا ہے کہ ۹۳۴ھ میں ملتان چاکر اعظم کے قبضۂ اقتدار میں آچکا تھا۔ شیر شاہ کے جرنیل ہیبت خان نے ۹۴۸ھ میں چاکر خان کے صاحبزادے میراں شاہ بلوچ کو شہید کر کے ملتان پر قبضہ کیا تھا۔ اس لحاظ سے پندرہ برس تک ملتان اور اس کے مضافات پر چاکر خان کی حکومت تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ اگر حالات مساعد ہوتے اور بلوچ قبائل خان اعظم کا ساتھ دیتے تو اس ملک پر بلوچوں کی اتنی زبردست حکومت قائم ہو جاتی کہ شاید بابر کو بھی اس طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی لیکن افسوس ہے کہ پہاڑوں میں بسر اوقات کرنے والے بلوچوں کو میدانی زندگی راس نہ آئی اور وہ ملتان اور ست گھرہ میں اتنی جمعیت کے ساتھ آباد نہ ہو سکے کہ ضرورت کے وقت ایک زبردست لشکر تیار ہو سکتا۔

بلوچوں کا پایۂ تخت ست گھرہ تاریخ کے اوراق میں

چاکر اعظم کو اس وقت اگر کچھ دھڑکا تھا تو دہلی کا اس لئے اس نے ملتان کی بجائے ست گھرہ کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ یہ شہر ہندوؤں کا تیرتھ تھا اور پاک و ہند کے ہر گوشے سے ہندو وہاں آتے اور تالاب میں اشنان کرتے تھے۔ چاکر اعظم نے پرانے شہر کے قریب ہی نئے شہر کی بنیاد رکھی۔ مضبوط فصیل، عالی شان محلات، دیوان عام، دیوان خاص تعمیر کرائے۔ دریا سے نہریں نکالیں، دلکش باغات اور بہترین اشجار کے پودے لگوائے۔ خوشنما پھولوں کے تختے سجائے اور اس شہر کو بہشت بریں کا نمونہ بنا دیا۔

دنیا کا شروع سے یہی دستور چلا آیا ہے کہ جب کوئی چھوٹی طاقت "جہد الابقا" کی مرتکب ہوتی ہے تو بڑی طاقتیں اسے فتنہ انگیزی اور بغاوت پر محمول کرتی ہیں لیکن جب کوئی بڑی طاقت اسی فعل کا ارتکاب کرتی ہے تو اسے کشور کشائی کا نام دیا جاتا ہے۔ شیر خان کی ابتدائی جنگیں فتنہ انگیزی سے تعبیر ہوئیں مگر جب وہ دلی کا تاجدار بن بیٹھا تو اس کی بقیہ جنگوں نے کشور کشائی کا نام پایا۔ بڑی طاقتیں چھوٹی طاقتوں کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھتی آئی ہیں۔ اس کا اطلاق صرف غیاث الدین بلبن، محمد تغلق اور علاؤ الدین خلجی پر ہی نہیں ہوتا بلکہ ناصر الدین محمود، بہلول لودھی اور اورنگزیب عالمگیر جیسے خدا یاد اور دیندار سلاطین بھی اس طورہ کی ہم آہنگی سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکے۔ امور مملکت میں تمام شہنشاہوں کا ضابطہ یکساں رہا ہے چنانچہ جب لنگاہ ختم ہو گئے اور میر چاکر خان نے ملتان پر قبضہ کیا تو بابر نے بھی اسے فتنہ انگیزی کا نام دیا۔

اب ایک اور کجکلاہ کی سنیئے۔ جس نے ایک سلطان بن سلطان سے ابھی ابھی تخت چھینا ہے جس کے دامن پر لاکھوں بے گناہ مسلمانوں کے خون کے دھبے ہیں۔ وہ بھی بلوچوں کی نشاۃ ثانیہ کو گوارا نہیں کر سکتا اور اپنے جرنیل کو لکھتا ہے کہ:۔

"ملک ملتان را کہ بلوچان تخت تصرف خود آوردہ اند خلاص سازد و تمردان ایں دیارت را بکیفر کردار ساند و نیز ملتان کہ ویران کردہ اند آباد سازد"

(تاریخ شیر شاہی عباس خان شیروانی ص ۹۳)

شیر شاہ بلوچوں کو دو تہمتوں سے متہم کرتا ہے ایک یہ کہ انہوں نے سرکشی کی۔ دوسرا یہ کہ ملک کو ویران کیا۔ حالانکہ صرف تاریخیں ہی نہیں بلکہ قلعوں کے کھنڈرات بھی اس حقیقت کے شاید ہیں کہ چاکر اعظم نے قدیم ست گھرہ کے پہلو میں جدید ست گھرہ تعمیر کرایا۔ اس کے گرد و پیش میر صاحب کے صاحبزادوں کے محلات اور باغات نظر آنے لگے۔ پچیس پچیس میلوں کے فاصلے پر میر شہداد، میر شہک، میر اللہ داد، میر شاہو خان اور دوسرے سرداروں کے قلعے تعمیر ہوئے۔ ہر

جگہ امن قائم ہوا اور رعایا مسرت وشادمانی سے ہمکنار ہو کر امن وعافیت کی زندگی بسر کرنے لگی۔ہم اپنے دعویٰ کے ثبوت میں مقامات داؤدی کے اقتباسات پیش کرتے ہیں جسے الہامی کتابوں کے بعد صدق و دیانت کے اعتبار سے اہل اللہ کے ارشادات کا درجہ ہے کیونکہ انہیں نہ تو لومۃ لائم کا خوف ہوتا ہے اور نہ ہی کسی کے تملق کا ان پر اثر پڑ سکتا ہے جو دیکھتے ہیں وہی لکھتے ہیں اور جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں۔ ''مقامات داؤدی، حضرت مخدوم شاہ داؤد بندگی قادری علیہ الرحمۃ کا ملفوظ ہے۔ جسے علامہ عبدالباقی نے حضرت شاہ ابوالمعالی قادری قدس سرہٗ کے مشورے سے فوائد الفواد کے اسلوب میں لکھنا شروع کیا تھا اور ۱۰۵۶ھ میں یہ صحیفہ صدق تکمیل کو پہنچا۔یعنی میر چاکر خان کی وفات سے صرف چوراسی سال بعد میر چاکر خان کے پوتے یقیناً زندہ موجود ہوں گے۔

علامہ عبدالباقی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں کہ جس زمانے میں ملتان دارالوبال بنا ہوا تھا اور شاہ حسین ارغون کے حملے نے اہل ملتان کو گھروں سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔صرف ست گھرہ ہی ایسا شہر تھا جسے دارالامن سمجھ کر علماء ومشائخ اکناف عالم سے کھچے چلے آتے تھے۔ چنانچہ ملتان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''اکثر مردم ازاں اجلاوطن شدہ بدر رفتہ وبسے ازاعزاء آں دیار فرار اختیار کردہ ''

اور پھر ایک مقدس قافلے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''بصوب ست گھرہ روانہ شد''

ست گھرہ کی امنیت اور فارغ البالی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

''درآں عصر معمورہ دائرہ میر چاکر بلوچ کہ آبادانی آں الآں بہ ست گھرہ مشہور ومعروف است نقطہ پرکارِ دولت ومرکز ادوار جمعیت اکابر واشراف ہر دیار بود چند ہزار سوار ازاعیان واہالی قصبات جوار جاگیر میر چاکر بودند!''

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں:۔

''سید رحمت اللہ وحضرت ایشاں بسے حیراں و پریشاں دائرۂ میر چاکر را دارسفیان انگاشتہ وآں

مسکن مامون راجودی سفینہ امن و امان پندا شتہ بہ صفتے غریب و حالتے عجیب پُرساں بمقصد رسیدند''۔ (حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان فرمایا تھا کہ جوشخص ابوسفیان کے گھر داخل ہو جائے اسے امان ہے۔مراد یہ ہے کہ ست گھرہ بھی اس زمانے میں دارسفیان کی طرح دارالامن بنا ہوا تھا۔)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

''چندیں دیگر از اقربا آمدہ دریں دائرہ امن توطن گزیدند وروزگارے بعز وکامرانی گذرانیدند!''

یعنی چند اور قریبی رشتہ دار بھی اس امن کے گہوارے میں آئے اور انہوں نے اسے اپنا وطن بنایا اور عزت وکامرانی سے زندگی بسر کی۔

ست گھرہ، دائرۂ امن

اور''روزگارے بعز وکامرانی گذرانیدند''میں ست گھرہ کی امنیت اور شہریوں کی باعزت اور کامیاب زندگی کی پوری کیفیت آجاتی ہے۔ایک اچھے حاکم اور اچھے شہر کی اس سے زیادہ تعریف اور کیا ہوسکتی ہے۔اُچ سے گیلانی مخادیم کا بھی ایک گھرانہ یہاں آکر آباد ہوا تھا۔حضرت مخدوم سید محمد غوث بندگی رحمتہ اللہ اس خانوادہ کے سربراہ تھے۔میر چاکر اعظم اور ان کے تمام رفیقوں اور عزیزوں نے ان کے دست حق پرست پر بیعت کی۔انہوں نے ست گھرہ سے قدرے فاصلے پر اقامت کی طرح ڈالی تھی۔مگر روزانہ صبح کی نماز ست گھرہ میں آکر پڑھاتے تھے۔ڈاکٹر غلام محمد خان سکنہ ست گھرہ کی روایت ہے کہ ایک سوبیس پالکیاں صبح کے وقت مسجد کے دروازے پر اترتی تھیں۔گویا اتنے بلوچ سردار حضرت کی اقتداء میں نماز ادا کرتے تھے۔عوام کا تو شمار ہی نہ

تھا۔مخدوم سید حامد گنج بخش علیہ الرحمۃ (مقامات داؤدی کی یہ عبارت ملاحظہ ہو"ہماں زماں از راہ ملتان گشتہ ست گھرہ آمدم و بخدمت حضرت شیخ حامد قدس سرہ العزیز مشرف شدم!) کئی بار ست گھرہ آئے اور فرد کش رہے۔اسی طرح کئی اور خاندان دہلی اور لاہور سے یہاں آ کر آباد ہوئے۔مقامات داؤدی میں میر چاکر کے عدل و انصاف کی تعریف کی گئی ہے۔لکھا ہے کہ ست گھرہ کی پوری ریاست امن و سلامتی کا گہوارہ بنی ہوئی تھی۔ست گھرہ کے گردوپیش بلوچ رؤسا کے باغات تھے۔چنانچہ نواب اللہ داد خان بلوچ کے باغ کا تعارف مؤلف "مقامات داؤدی "اس طرح سے کراتا ہے:۔

"روزے (حضرت شاہ داؤد بندگیؒ) درست گھرہ تشریف آوردند و از کثرت مزاحمت وہجوم آیندگان بزیارت دلتنگ شدہ۔در باغ اللہ داد خان بلوچ درآمدند۔ورزیر گلبن سمن کہ نشیمن خاص او بود۔ساعتے آرام کردند و شاخ و برگ آں گلبن در رنگ چترمدوّر وشگوفہ و گلہائے او بساں مسلسل چترنظر غیرے مکررمے نمود"۔ (مقامات داؤدی ص ۱۳۱)

"نواب الہ داد خان نے اپنے باغ کے درمیان اپنی نشست گاہ بنا رکھی تھی۔جس پر سدا بہار پودوں کی ٹہنیوں اور پتیوں نے چتر کی ہیئت اختیار کر لی تھی اور پھر پودوں کے شگوفے اور پھول چتر کے اردگرد جھالر کی شکل میں نظر آتے تھے۔

شیر گڑھ بھی چاکر اعظم نے آباد کیا تھا۔جہاں ایک پولیس چوکی تھی۔لاہور سے جو مسافر ملتان کو آتے تھے اس جگہ ان کے پاسپورٹ کی پڑتال کی جاتی تھی۔چنانچہ مولانا عبدالباقی لکھتے ہیں:۔

"پیش از ورود سعادت آنحضرت (شاہ داؤد کرمانی) درعہد افاغنہ جماعہ از میر چاکر خان بلوچ برسم راہ داری دریں جاے نشستند وھادر، و وارو راہ ملتان راہ بسلامت مے گزرایند یک چار دیواری پیراموں نشیمن خود برآوردہ وایں مقام را شیر گڑھ نام کردہ بودند"۔ ("بسلامت

گزرانیدند'' سے ملازمین کے اچھے رویے کا ثبوت ملتا ہے)

''شیر'' کی نسبت شیر خان سے نہیں جبکہ خود میر چاکر خان سے تھی جو بلا شبہ بلوچی دُنیا کے شیر ژیاں تھے۔ بعد میں اس مقام کو حضرت غوث زماں بندگی مخدوم شاہ داؤد کرمانی علیہ الرحمتہ کی اقامت کا شرف حاصل ہوا۔ جس نے شیر گڑھ کو مثیل بغداد بنا دیا۔ چنانچہ مولانا عبدالباقی ایک قصیدہ میں حضرت سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں

روح قدسی شود از نغمۂ تسبیح تو مست — غیر داؤد کہ دگر ایں نغمہ سرود

درسواد خوش آب بحر شیر گڈھ ہست — طالباں را بنظر دجلۂ بغداد نمود

(بحر شیر گڑھ سے دریائے بیاس مراد ہے جو ان دنوں شیر گڑھ کے پاس سے ہو کر بہتا تھا!)

ان اقتباسات کی روشنی میں کسی کے لئے یہ تسلیم کئے بغیر اور کوئی چارہ ہی نہیں رہتا کہ بلوچوں کے اقتدار اعلیٰ کا یہ زمانہ خواہ وہ کتنا مختصر کیوں نہ ہو عوام کے لئے آیۂ رحمت سے کم نہیں تھا۔ اس زمانے میں تو کہیں چوری چکاری کا نام تھا اور نہ ہی تاریخوں میں کسی قسم کی بدامنی کا سراغ ملتا ہے۔ مگر تقدیر کے آگے کسی انسان کی خواہ وہ کتنا شجاع اور پختہ کار کیوں نہ ہو، کچھ نہیں چلتی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں۔ ''عَرفت رَبّی بفسخُ العزائم'' میں نے اپنے رب کو ارادوں کے ٹوٹنے میں ہی پہچانا ہے۔ میر چاکر خان رند بھی جو منصوبے بنا کر سبی سے چلا تھا یا جس توقع کے تحت اس نے ملتان فتح کر کے اپنی حکومت کا اعلان کیا تھا۔ یہ تمام آرزوئیں، یہ تمام منصوبے اب خاک ملتے دکھائی دے رہے تھے۔ شیر خان ہمایوں کو ملک سے باہر نکال کر شیر شاہ بن چکا تھا اور اب وہ بلوچوں کے درپے ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے ایک تجربہ کار جرنیل خواص خان کو اس مہم پر مقرر کیا۔ وہ بڑے لاؤ لشکر سے بلوچوں پر حملہ آور ہوا مگر میر چاکر خان نے اس کی ایک نہ چلنے دی اور مار مار کر بھگا دیا۔ پھر اس نے ہیبت خان نیازی کو بلوچوں کے استیصال پر تعینات کیا۔ میر چاکر خان نے اپنے بیس سالہ مگر شجاع فرزند میراں شاہ بلوچ کو جو ملتان کا گورنر بھی

تھا۔ دشمن کے استقبال کیلئے روانہ کیا۔ ہڑپہ کے مقام پر بلوچ خان اور ہیبت خان کے درمیان خونریز معرکہ ہوا۔ ہیبت خان کو شکست ہوئی اور میراں شاہ بلوچ فتح ونصرت کے پھریرے اڑاتا ملتان پہنچ کر والد بزرگوار کے قدم بوس ہوا۔ میر چاکر خان کو یقین تھا کہ ہیبت خان اب نچلا نہیں بیٹھے گا اور پوری طاقت سے حملہ کرے گا۔ اس لئے بلاتوقف ڈیرہ غازی خان پہنچا تا کہ اپنے بلوچ بھائیوں کو آنے والے خطرے کے لئے تیار کرے۔ مگر یہ معلوم کر کے اس کی تمام توقعات پر اوس پڑ گئی کہ میر حاجی خان اور جام اسماعیل خان و فتح خان سب خوشاب پہنچ کر شیر شاہ کے آگے سرنگوں ہو چکے ہیں۔ میر چاکر خان ان سرداروں کو اپنا دست و بازو خیال کرتے تھے۔ خاص کر میر حاجی خان کی خاطر تو میر چاکر نے اپنے دو بڑے امیروں سے جنگ کی تھی اور اپنا پیارا بیٹا میر شہک اس مہم کی بھینٹ چڑھایا تھا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ شیر شاہ کی اطاعت قبول کر کے ڈیرہ جات کے سرداروں نے اپنے گرد شہنشاہ کی حمایت کا حصار قائم کرلیا تھا۔ مگر اس سے بلوچی قوت کو دھچکا لگا اس کا مداوا نہ ہوسکا اور میر چاکر خان نے بلوچ سلطنت کا جو خواب دیکھا تھا وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ اگر ڈیرہ جات کی عسکری قوت میر چاکر خان کو دھوکا نہ دیتی تو خدا معلوم بلوچی فتوحات کا سیلاب کہاں جا کر رکتا۔ بقول حکیم شیرآزؔ :

ہر کس از دست غیر نالہ کند
سعدیؔ از دست خوشیتن فریاد

چاکر خان کو بھی اگر کچھ گلہ ہے تو اپنوں سے، پہلے عمرادگان نے علم مخالفت بلند کیا۔ پھر ہیبت خان اور بجار نے مصیبتیں کھڑی کیں۔ اب جن کے لئے انہوں نے اپنوں سے بگاڑا تھا وہ بھی دھوکہ دے گئے۔ بالخصوص میر حاجی خان میرانی کے رویے کا میر چاکر خان کو سخت افسوس ہوا گویا:

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ بامن ہرچہ کرد آں آشنا کرد

چاکرخان کی حفاظتی تدبیریں

میر چاکرخان نے دیکھا کہ پانسہ بدل گیا ہے اور ایسے حالات میں آگے بڑھنا اپنی قوم کو تباہ کرنا ہے تو اس نے اعلان کیا کہ تمام بلوچ سردار میدان خالی کر کے پہاڑ کی جانب آجائیں اور اپنے قلعوں میں برائے نام چند آدمی رہنے دیں۔ (ان نامساعد حالات کی بنا پر جب کوئی حاکم شہر کو چھوڑنا چاہتا ہے تو کسی غیر جانبدار شخص کو عارضی طور پر قلعہ حوالے کر دیتا ہے۔ اس سے نقص امن اور خون خرابے کا خطرہ نہیں رہتا۔ اس لئے میر چاکر نے بھی اپنے قلعے غیر بلوچ امراء کے حوالے کر دیئے) جو شیر شاہی حکام کے آنے تک ضبط و نسق کو قائم رکھ سکیں۔ چنانچہ بلوچ جس سرعت سے آگے بڑھے تھے اتنی تیزی سے رجعت قہقری کرتے ہوئے کوہ سلیمان کے دامن میں گھس گئے۔ چاکر خان ہمایوں سے برابر خط و کتابت کر رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ بہت جلد آئے گا اور ہم اس کے ساتھ مل کر دشمن کو قرار واقعی سزا دے سکیں گے۔ میر چاکر خان نے ملتان سے دیپال پور تک کا دورہ کیا اور بلوچوں کے لئے خوراک کا اس قدر ذخیرہ جمع کر لیا جو دس سالوں تک ان کے لئے مکتفی ہو سکتا تھا۔ پھر ست گھرہ پہنچ کر اس نے اپنے تمام اعزا و اقارب اور سامان واسلحہ وغیرہ کو روجھان کی طرف روانہ کیا اور اپنے وکیل فتح خان کمبوہ کو ہیبت خان کے پاس بھیجا اور اسے اطلاع کی کہ ہم لوگ آپ سے لڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ آپ خوشی سے اس ملک پر قبضہ کر سکتے ہیں۔ شیر شاہ کا ہیبت خان کو حکم مل چکا تھا کہ وہ قبولہ کے فتح خان کو گرفتار کرے اور ملتان کو بلوچوں کے دست تصرف سے آزاد کرائے۔ اس حکم کے پہنچتے ہی ہیبت خان نے میر چاکر خان کے وکیل سے کہا اپنے سردار کو اطلاع دو کہ میں اس طرف آرہا ہوں اور ان کی فوج کا جائزہ لوں گا۔

ہیبت خان کو میر چاکر خان کی اصل کارروائی کا علم نہیں تھا اور نہ ہی میر چاکر خان نے اپنے ارادے کو کسی پر ظاہر کیا تھا۔ ہیبت خان نے یہی خیال کیا تھا کہ چاکر خان نے شیر شاہ کی

اطاعت قبول کر لی ہے اور وہ اپنی فوج بادشاہ کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔اس لئے فوج کا جائزہ لینے کی غرض سے بڑھا چلا آ رہا تھا اور ادھر یہ کیفیت تھی کہ فوج بجائے خود رہی اسلحہ اور سامان تک منتقل کیا جا چکا تھا۔اس لئے میر چاکر خان کو سخت فکر لاحق ہوئی کیونکہ نہ فوج موجود تھی اور نہ ہی مختصر وقت میں ہیبت خان کے لشکر کی راشننگ کا انتظام ہوسکتا تھا اور ساتھ ہی اپنی زندگی کا فکر تھا۔ چنانچہ وکیل السلطنت فتح خان کمبوہ کا بیان ہے کہ جب میں نے میر چاکر خان کو ہیبت خان کا پیغام دیا تو وہ سخت فکر مند ہوئے کہ اتنے تھوڑے عرصہ میں فوج کس طرح جمع کی جاسکتی ہے اور نہ ہی فوری طور پر فوج کی راشننگ کا انتظام ممکن ہے۔تاریخ شیر شاہی کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

"دوئم روز خبر آمد کہ ہیبت خان از ست گھرہ دوازدہ کردہ آمد چاکر خان ازیں خبر سراسیمہ شد کہ من ہنوز لشکر جمع نہ کردہ ام و نہ مہمانی کہ لائق حال او باشد تیار کردہ ام چہ خواہد شُدّ"۔

"دوسرے دن صبح سویرے مخبر نے اطلاع دی کہ ہیبت خان آپہنچا ہے۔ایسے عالم میں تھوڑی دیر کے لئے میر چاکر کی روشن پیشانی پر تردد کے آثار ظاہر ہوئے مگر بہت جلد افکار و آلام کی یہ گھٹا چھٹ گئی"۔معلوم ہوتا تھا کہ خان اعظم نے کوئی حل سوچ لیا ہے۔وہ فی الفور گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنے چند رفیقوں کے ہمراہ ہیبت خان کی پیشوائی کو پہنچ گیا۔ ہیبت خاں نے اس جلیل القدر سردار کو دیکھا تو اس کی تمام رعونت و نخوت اس کی شخصیت کے آگے جھک گئی اور دیکھتے ہی بولا: خان اعظم! در دیپال پور خواہم کرد مبادا فتح خان بگریزد!"

"خان اعظم! محلہ (محلہ فوج کی اصطلاح تھی جسے فوج کے جائزہ اور معائنہ کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔اس تقریب پر فوجی فاخرہ لباس میں ملبوس، عمدہ ہتھیار سجائے نذرانے اور تحائف لے کر کھڑے ہوتے تھے۔ظاہر ہے کہ اس اہتمام کیلئے کافی وقت ہونا چاہیے۔ پھر ایسے شخص کے لئے جو اس تقریب کے لئے آمادہ ہی نہ ہو یہ امر خاصا پریشانی کا باعث بن سکتا ہے)

خان اعظم۔" آپ کی فوج کا جائزہ یہاں دیپال پور سے لوں گا۔ایسا نہ ہو کہ فتح خان بھاگ

جائے۔'' یہ کہا اور قبولہ کی طرف ہوا ہو گیا۔ خان اعظم ''آمدہ بود بلائے و لے بخیر گزشت'' کے مصداق ست گھرہ واپس پہنچے۔ شہر کا انتظام اپنے کسی معتمد (غیر بلوچ) کو سونپا اسے چند ہدایات دیں اور نوبت بجواتے ملتان کو روانہ ہو گئے۔

میر مندو کی گرفتاری

ان دنوں پاکپتن میر مندو خان کی تحویل میں تھا۔ اس نے بھی بلوچوں کو سردار کے حکم کی تعمیل میں روجھان روانہ کر دیا تھا۔ صرف چند اقربا اور بال بچے باقی رہ گئے تھے جنہیں روانہ کرنے کی سوچ رہا تھا کہ دفعتہ فتح خان کمبوہ پہنچ گیا اور پناہ کا طالب ہوا۔ اگرچہ مندو خان کے پاس تین چار سو سے زیادہ سپاہی نہیں تھے تاہم اس نے در پر آئے ہوئے پناہ گیر کو مایوس کرنا بلوچی حمیت کے خلاف جانا اور قلعے کا دروازہ کھلوا کر اسے اندر بلا لیا۔ ہیبت خان کی فوجیں پہنچ گئیں اور انہوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا اور طرفین کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔ عین اس وقت جبکہ بلوچ اپنی طاقت کے کم ہونے کے باوجود مردانہ وار لڑ رہے تھے۔ فتح خان کمبوہ نے اپنے محسنوں کو جنہوں نے محض اس کی خاطر جنگ مول لی تھی۔ دشمن سے تنہا نبرد آزما ہونے کے لئے چھوڑ دیا اور اس نے حضرت شیخ الاسلام فریدالدین مسعود گنج شکر علیہ الرحمتہ کے صاحب سجادہ شیخ ابراہیم کے ذریعے ہیبت خان سے صلح کی بات چیت شروع کر دی اور انجام کار اپنے آپ کو شیخ کی وساطت سے ہیبت خان کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ تاریخ افاغنہ کے مصنف نعمت اللہ سے سنیے۔

محاصرہ کے دوران رات کے وقت بلوچستان کا امیر جس کا نام مندو خان بلوچ تھا اپنے قلعے کی حفاظت کے لئے انتہائی پامردی سے لڑتا رہا لیکن جب اسے کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو اس نے وہی کچھ کیا جو غیور اور جسور لوگ ایسے اوقات میں کر گزرتے ہیں۔ یعنی بلوچوں نے بے عزتی کے خوف سے خود اپنی عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا اور مندو خان مع اپنے تین سو رفیقوں کے قلعہ سے باہر آ گیا اور محاصرین پر شدت سے ٹوٹ پڑا۔ اس نے نہایت شجاعت سے جنگ کی اور بزور شمشیر

اپنا راستہ بنا کر فرار ہو گیا۔ جب صبح ہوئی تو افغانوں نے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ معزز خواتین تو اپنے غیور وارثوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کر چکی تھیں لیکن بچے کھچے لوگوں کو ہیبت خان نے قید کر لیا۔ یہ واقعہ پاک پٹن کا نہیں بلکہ فتح پور کے قریب ایک کچا قلعہ تھا (اس قلعہ کے کھنڈرات پاک پٹن کے مضافات میں ملتے ہیں اور اس کے قریب بلوچوں کے چند گھرانے بھی آبا ہیں، جو نہیں جانتے کہ ان کے اسلاف اپنی عزت و آبرو بچانے کے لئے کیا کر گزرے تھے!) میر مندو خان مع اہل و عیال اس میں رہتا تھا اور فتح خان کمبوہ بھی اس قلعے میں پناہ گزین ہوا تھا۔

عباس خان سروانی لکھتا ہے کہ جب فتح خان شیخ ابراہیم کی وساطت سے ہیبت خان کی خدمت میں پیش ہوا تو اس نے شیخ ابراہیم سے کہا کہ میں شیر خان کا نوکر ہوں جو اس کا حکم ہوگا اس پر عمل کروں گا اور فتح خان کو قید کر لیا گیا۔

تاریخ افاغنہ کے مؤلف نعمت اللہ لکھتے ہیں کہ میر مندو خان لڑتا بھڑتا بخشو لنگاہ کے پاس پہنچا وہ کچھ دیر سستانا چاہتا تھا مگر بخشو نے دھوکہ اور فریب سے اسے گرفتار کر کے ہیبت خان کے پاس بھجوا دیا۔

ملتان پر حملہ

میر چاکر خان جب ملتان سے گزر رہے تھے تو انہوں نے میر بلوچ خان کو ہدایت کی تھی کہ شہر اور ملک کا انتظام کسی ہوشیار اور پختہ کار شخص کے سپرد کر کے روجھان چلے جاؤ۔ ایسے حالات میں ایسے غیر جانب دار شخص کو ملک اور شہر کا انتظام حوالے کیا جاتا ہے جو ملک چلانے کا تجربہ رکھتا ہوتا کہ نئے حاکم کے آنے تک شہر کا نظم و نسق قائم رکھ سکے۔ اس طرح جنگ کی نوبت نہیں آتی۔ شہر کے چارج کا لین دین سکون سے ہو جاتا ہے اور عوام کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ چنانچہ میر چاکر خان، میر بلوچ خان کے اہل و عیال اور اعزاء و اقارب کو لے کر روانہ ہو گئے اور چند یوم بعد ہیبت خان، فتح خان اور میر مندو خان کو گرفتار کرنے کے بعد ملتان آ دھمکا۔

امراء نے میراں شاہ بلوچ کو جسے مؤرخین نے میر بلوچ خان لکھا ہے۔ مشورہ دیا کہ مٹھی بھر رفیقوں سے شاہی لشکر سے ٹکر لینا خودکشی کے مترادف ہے بہتر ہے کہ جیسے خان اعظم کا حکم ہے آپ روجھان چلے جائیں اور پھر جس طرح وہ مناسب سمجھیں اس پر عمل کریں۔ مگر چونکہ ہیبت خان نے آتے ہی شہر کا محاصرہ کر لیا تھا اور ابھی چند بلوچ سردار شہر میں موجود تھے۔ اس لئے میر بلوچ خان نے بزدلوں کی طرح بھاگ کر جان بچانا پسند نہ کیا اور گنتی کے چند رفیقوں کے ہمراہ میدان میں ڈٹ گیا۔ اس غیر مساوی مقابلے میں ہیبت خان کامیاب ہوا اور بخشو لنگاہ نے میرو خان کو زخمی حالت میں گرفتار کر لیا۔ ہیبت خان نے شیر شاہ کو فتح نامہ تحریر کیا تو وہ بڑا خوش ہوا اور اس نے ہیبت خان کو مسند عالی کا منصب اور اعظم ہمایوں کا خطاب مرحمت کیا۔ (اعظم ہمایوں کے خطاب سے دراصل شہنشاہ ہمایوں کی خفت اور توہین مقصود تھی۔ گویا جسے یہ خطاب دیا جا رہا ہے وہ ہمایوں سے بڑھ کر ہے۔ یا یہ کہ ہمایوں سے بھی زیادہ شان وشوکت کے انسان شیر شاہ کے نوکر ہیں) نیز حکم دیا کہ فتح خان کمبوہ، مندو خان اور بلوچ خان کو قتل کر دو اور بخشو خان لنگاہ یا اس کے بیٹے کو اپنی خدمت میں رکھو۔

ہیبت خان نے حکم ملتے ہی میران خان کو شہید کر دیا اور فتح جنگ کو قائم مقام چھوڑ کر فوراً لاہور پہنچا اور وہاں اس نے فتح خان کمبوہ اور میر مندو خان کو دار فانی سے عالم باقی کو رخصت کیا۔

(تاریخ شیر شاہی از عباس خان شیروانی)

میراں شاہ بلوچ کو اس کے سرباز رفیقوں نے ملتان میں حضوری باغ کے قریب دفن کر دیا تھا۔ جب چاکر خان کو اطمینان نصیب ہوا تو اس نے اپنے بہادر بیٹے کی قبر پر شاندار مقبرہ تعمیر کرایا۔ سکھوں کے حملے میں مقبرہ تو منہدم ہو گیا۔ البتہ اس کے آثار اور میراں شاہ کی قبر اچھی حالت میں موجود ہے۔ قبرستان خاصہ بڑا تھا اور ملک سہراب دودائی سے لے کر بڑے بڑے بلوچ سردار یہاں دفن ہوتے چلے آئے تھے۔ مگر اب اس کا بیشتر حصہ سڑکوں، ملحقہ باغوں اور پیر خورشید احمد قریشی کی کوٹھی

نے لے لیا ہے۔قبریں آہستہ آہستہ معدوم ہوتی چلی جارہی ہیں۔ میراں شاہ بلوچ کے کتبے کو بھی چراغ کی سیاہی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اگر فوری خبر نہ لی گئی تو میراں شاہ بلوچ اور اس کی ملحقہ دس بارہ قبور کے سوا باقی تمام قبور نسیاً منسیاً ہو جائیں گی۔

میراں شاہ بلوچ کی شہادت پر مؤرخین کے متضاد بیانات

بلوچ خان کی شہادت کو مؤرخین نے مختلف صورتوں میں بیان کیا ہے میر عبدالرحمن کُرد لکھتے ہیں کہ ہیبت خان نے اس بیس سالہ نازنین شہزادے کو خنجر مار کر شہید کیا تھا۔

(ہمارا کاروان ص ۴۳)۔

تاریخ افاغنہ کا مؤلف نعمت اللہ رقمطراز ہے کہ میراں خان کو شیر شاہ کے حکم سے پھانسی پر لٹکایا گیا تھا۔

(تاریخ افاغنہ، مترجمہ ڈاکٹر ڈرون)

عبدالقادر خان لغاری کا بیان ان دونوں سے مختلف ہے وہ لکھتے ہیں کہ "ہیبت خان ایک نڈر اور دلیر دشمن کی قدر نہ کرسکا۔ پچھلی شکست کے انتقام نے اسے اندھا کردیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بلوچ خان نہایت عاجزی کے ساتھ جان بخشی کی درخواست کرے گا چنانچہ جس وقت بلوچ خان زنجیروں میں جکڑا ہوا ہیبت خان کے روبرو پیش کیا گیا تو اس نے قہقہہ لگا کر اس کی بے بسی کا مذاق اڑایا۔ پابہ زنجیر بلوچ سردار بھی اسے حقارت آمیز ہنسی کے ساتھ جواب دیتا رہا۔ جس کی فاتح کو توقع نہ تھی اسے یقین تھا کہ میر بلوچ خان نہایت عاجزی کے ساتھ جان بخشی کی درخواست کرے گا۔ مگر اس کمسن دشمن کی بے باکی اور شان استغنا دیکھ کر اس کے غصے کا جوالامکھی پھٹ پڑا۔ اس نے گورنر ملتان کے لئے جو سزا تجویز کی۔ انسانیت اس پر ہمیشہ غم کے آنسو بہاتی رہے گی۔ اس کے حکم سے بلوچ خان کی ٹانگیں گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھ دی گئیں۔ ایسے عالم میں جبکہ

بلوچ خان کا خوبصورت سرزمین پر گھسٹ رہا تھا اور معطر زلفیں گرد آلود ہو رہی تھیں۔ گھوڑے کو چابک مار کر دوڑایا گیا۔ گھوڑا اپنے پیچھے اس بوجھ کو دیکھ کر بھڑک اٹھا اور تھوڑی سی دیر میں بلوچ خان کی روح عالم قدسی کو پرواز کر گئی۔ وہ سر جو خدا کے سوا کسی کے آگے نہ جھکا تھا اب ریزہ ریزہ ہو کر ملتان کی گلیوں اور سڑکوں پر بکھر چکا تھا''۔

اس کے بعد عبدالقادر خان لغاری نے سیت پور کی جنگ کے عنوان سے میر چاکر خان اور ہیبت خان کی ہولناک لڑائی کی تفصیلات درج کی ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ میر چاکر خان نے بلاشبہ ہیبت خان سے اپنے بیٹے کا انتقام لیا تھا۔ مگر نہ تو وہ ہیبت خان ہے اور نہ وہ بیٹا یہ بیٹا ہے۔ اس جنگ کا تفصیلی ذکر پہلے آچکا ہے اور ناظرین کرام پڑھ چکے ہیں کہ ہیبت خان نامی ایک بلوچ سردار نے میر چاکر خان کے بیٹے میر شہک کو قتل کر کے اس کی پسلیوں کے کباب بنائے تھے اور پھر میر چاکر نے اس ہیبت خان کو قتل کر کے اس کی کھوپڑی میں پانی پی کر انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کیا تھا۔ اس واقعے کو میراں شاہ کے انتقام سے منسوب کرنا امر واقعہ کے خلاف ہے۔ میراں شاہ کا انتقام صرف چاکر خان نے نہیں بلکہ پوری بلوچ قوم نے لیا اور سور خاندان کو صفحہ دہر سے بالکل ناپید کر دیا۔

میر چاکر خان سوائے معدود سے چند نفوس کے پوری قوم کو بچا کر لے گیا لیکن نیازی پٹھانوں پر کیا گزری اور بلوچوں کے قتل و غارت کا انہیں کیا انعام ملا۔ عوام نے دونوں اقوام کو کس نظر سے دیکھا۔ اس دور کے علماء مشائخ کی ان کے بارے میں کیا رائے تھی۔ یہ بھی قابل مطالعہ ہے۔ گزشتہ صفحات میں مقامات داؤدی کی رائے بلوچوں کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ ست گھرہ کی شان و شوکت، امنیت، رفاہیت، میر چاکر خان اور اس کے عملے کے عمدہ نظم ونسق کی تعریف جن الفاظ میں مولانا عبدالباقی نے کی ہے۔ ایسی بہت کم حاکم قوم کے بارے میں پڑھنے میں آتی ہے۔ لنگاہوں کو چند سال حکومت کرنے کا موقعہ ملا مگر عنان اختیار سنبھالتے ہی

انہوں نے جو گل کھلائے اور جن الفاظ میں مؤرخین نے انہیں خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ آپ کے مطالعہ سے گزر چکے ہیں۔اسی طرح شیر شاہ کے زمانے میں نیازی پٹھان بساط سیاست پر چھا گئے۔ لاہور سے صوبہ سرحد تک ہر طرف یہ لوگ المن الملک الیوّم کے نعرے لگاتے پھرتے تھے۔عوام سے جن الفاظ میں انہوں نے خراج تحسین وصول کیا وہ ملاحظہ ہوں۔

نیازیوں کا انجام

مقامات داؤدی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ نیازی بے حد ظالم واقع ہوئے تھے۔ بلوچوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی ان کی زیادتیوں سے محفوظ نہ تھے۔حضرت مخدوم شاہ داؤد کرمانی علیہ الرحمتہ شیر گڑھ میں رہتے تھے۔آپ نے بیلوں کی سہولت کے پیش نظر چاہک کے لوٹے بجائے مٹی کے لکڑی کے بنوائے ہوئے تھے تاکہ بیلوں کو زیادہ زور نہ لگانا پڑے۔حضرت نے ایک ملازم کو چند آب نادیدہ آبخورے دے کر کنوئیں کی حفاظت پر مامور کر رکھا تھا۔اسے حکم تھا کہ کنوئیں سے کسی کو لوٹا نہ کھولنے دو بلکہ اسے نیا آبخورہ پیش کرو تا کہ وہ اس سے پانی پیئے۔جب اعظم ہمایوں کے لشکر کا اس کنوئیں سے گزر ہوا تو اس کے ایک امیر نے اپنے ملازم کو لوٹا کھولنے کا حکم دیا۔خادم خانقاہ نے ہر چند نئے آبخورے پیش کئے لیکن اس کی پیشکش اور منت سماجت رائیگاں گئی اور اعظم ہمایوں کے ملازم نے جبراً لوٹا کھول لیا۔جب خادم نے یہ معاملہ حضرت کی خدمت میں عرض کیا تو آپ نے فرمایا کہ آج سے نیازیوں کا سلطنت افاغنہ سے رشتہ ٹوٹ گیا!

شیخ کمال فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ اسلام خان نے اعظم ہمایوں کو اس کے بھائیوں سمیت قتل کر دیا۔کتاب کا متن درج ذیل ہے:۔

”وقتے کہ نیازیاں بدبخت بتقریب تاخت بلوچاں از اسلام خان رخصت شدند۔دراں ایام از فائرہ قحط تمام خلق در قلق و اضطراب ہلاک وخراب بود۔یکے از ہمراہیاں اعظم ہمایوں نیازی بکمال

بے نیازی و گردن افرازی آمدہ از چرخ چاہ خانقاہ فقرا پناہ کوزہ بریدن حکم فرمود۔ خادم ہر چند ظروف پاکیزہ و آب نارسیدہ حاضر آورد و ملائمت و مداہنت کرد ہر گز معقول نشد۔ خادم حقیقت و بے ادبی تعدی افغاناں بعرض رسانید، فرمودند کہ سر رشتہ دولت نیازیاں باسلطنت افغاناں از امروز بُرید شد"۔

(مقامات داؤدی)

توبہ، توبہ، کتنا تنفر اور کتنی بے زاری کا اظہار ہے اور پھر ایک دنیا دار کی زبان سے نہیں بلکہ یہ الفاظ ایک ولی اللہ کے ہیں۔ انجام کار خدا پرستوں کی دعائیں رنگ لائیں اور نیازیوں پر ادبارا چھا گیا۔

نظام الملک خانی خان ہیبت خان، اعظم ہمایوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

سلیم شاہ نے ماندو تک تعاقب کیا۔ وہاں شجاع خان، اعظم ہمایوں اور عیسیٰ خان سب نے مل کر بیس ہزار سوار فراہم کئے اور سلیم شاہ سے مقابلہ کیا لیکن ان کو میدان چھوڑ کر محصور ہونا پڑا۔ آخر سلیم شاہ نے انہیں شکست دے کر منتشر کر دیا۔ اس لڑائی میں اعظم ہمایوں (ہیبت خان) کی ماں اور اس کے اہل و عیال سلیم شاہ کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔

پھر لکھتا ہے کہ:۔

آخر کار نیازیوں کو پھر شکست اٹھانی پڑی اور وہ حاکم کشمیر کی پناہ میں چلے گئے۔ وہاں اعظم ہمایوں (ہیبت خان) سعید خان اور شہباز خان کو قتل کر دیا گیا اور حاکم کشمیر نے ان کے سر سلیم شاہ کے پاس بھیج دیئے۔

(منتخب اللباب حصہ اوّل ص ۱۳۴)

لیکن بلوچوں کا ذکر اسی مورخ نے بڑے پیارے انداز میں کیا ہے۔ اس وقت کا کیا ذکر ہے آج بھی ست گھرہ کے لوگ بڑے فخر سے اپنے آپ کو بلوچوں کی رعایا کہتے اور بلوچوں کو اپنا

سردار جان کر عزت کرتے ہیں۔ ہم جب پہلی مرتبہ ست گھرہ گئے تو وہاں کے ایک ممتاز شہری ڈاکٹر محمد خان نے ہماری آؤ بھگت کی اور فرمایا کہ یہ شہر آپ لوگوں کا ہے۔ ہم تو آپ کی رعایا ہیں۔ بعد میں بھی جب کبھی اس طرف جانے کا موقع ملا ڈاکٹر محمد خان اور سید خادم حسین شاہ جن کے خاندان میر چاکر خان کے زمانے سے ہی اس شہر میں آباد چلے آتے ہیں۔ بڑے اشتیاق سے ملے اور جب تک ہمیں کھانا نہ کھلایا وہاں سے رخصت نہ ہونے دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حاکم بلوچوں کے اخلاق جمیلہ کا ہی اثر ہے کہ صدیاں گزر گئیں مگر ست گھرہ کے لوگ بلوچ کے نام پر جان دیتے اور میر چاکر خان کے مقبرہ کی پیر کے مقبرہ جیسی عزت کرتے اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ اسی طرح پنڈی شیخ موسیٰ علیہ الرحمتہ میں جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں کے علم دوست اور ادب نواز پیر حیدر علی شاہ نے ہمیں انتہائی محبت سے اپنے ہاں ٹھہرایا۔ بڑے تکلف کی ضیافت کی اور پھر گھوڑیوں پر سوار کر کے اس مقام پر لے گئے جہاں بلوچوں کا بطل جلیل اور چاکر اعظم کا ولی عہد نواب میر شہداد ابدی نیند سو رہا تھا۔ یہی کیفیت حضرت مولانا اللہ داد خان گرمانی اور میر حسنؒ کے مقابر کی ہے۔ سچ ہے اچھے لوگ چلے جاتے ہیں مگر ان کی یاد ہمیشہ تازہ رہتی ہے۔

بزمینے کہ نشان کف پائے تو بود
سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود

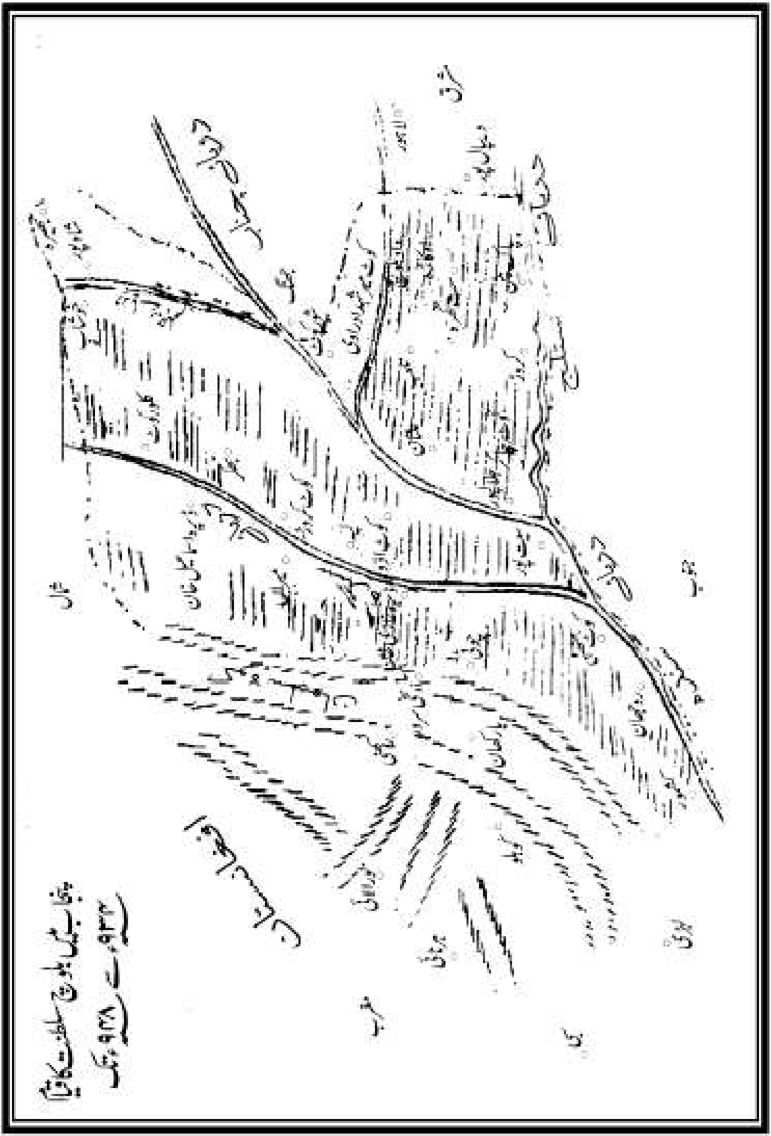

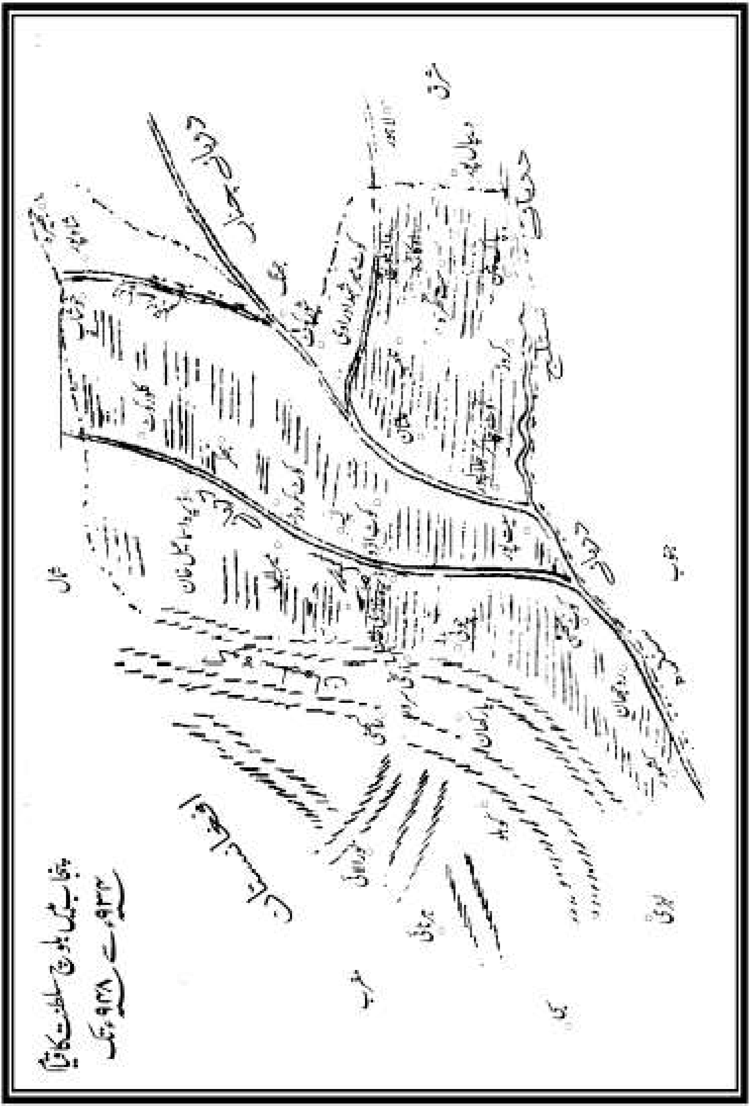

ہمایوں بلوچوں کی پناہ میں

ہمایوں جب ایران کو جارہا تھا۔ وہ بھول کر ایک ایسے علاقے میں جا پہنچا جہاں مرزا کامران کی طرف سے اسے گرفتار کرنے کے احکامات پہنچ چکے تھے۔اس شہر کے حاکم نے اس سخت حکم کے باوجود ہمایوں سے کیا سلوک کیا؟ وہ اس باب میں ملاحظہ فرمائیے!

ہمایوں کوہستان مری سے ایران کو اڑا جا تا تھا کہ ایک رات اس کا مختصر سا قافلہ راستہ بھول گیا۔ اس وقت اس کے ہمراہ چالیس سوار ہندوستانی اور دو عورتیں تھیں۔ ایک حضرت مریم مکانی بیگم صاحبہ اور دوسری ایک بلوچ خاتون تھی جو ترجمان کا کام دیتی تھی۔ یہ سب لوگ راتوں رات چلتے رہے۔ جب انہیں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آئیں تو بادشاہ نے کہا کہ یہاں آبادی ہوگی۔ اتنے میں بلوچوں نے آ کر راستہ روک لیا۔ بادشاہ نے کہا ہم ان سے بات چیت کریں گے۔

بلوچوں نے پوچھا۔ ''آپ کون ہیں؟''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''میں ہمایوں بادشاہ ہوں!''

اس پر بلوچ آپس میں گفتگو کرنے لگے کہ ملک خطی یہاں موجود نہیں۔ بادشاہ آ پہنچا۔ اب ہمارے لئے مناسب یہی ہے کہ ملک کے آنے تک بادشاہ کو یہیں روکے رکھیں۔ اس کے بعد انہوں نے عرض کیا۔ حضور نیچے تشریف لے آئیں۔ ہم کسی کو بھیج کر ملک خطی کو اطلاع دیتے ہیں۔

بادشاہ نے بلوچ خاتون سے پوچھا کہ ''یہ بلوچ آپس میں کیا کہہ رہے ہیں؟''

اس نے عرض کیا کہ ان کا سردار ملک خطی یہاں موجود نہیں ہے۔ جب تک وہ نہ آجائے یہ بادشاہ سلامت کو یہاں ٹھہرانا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضور اس مسند پر تشریف لے آئیں جو انہوں نے حضور کے لئے بچھائی ہے۔

یہ سن کر بادشاہ، حضرت بیگم اور ترجمان خواجہ عنبر مسند پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں قلعہ کے تمام لوگ جمع ہو گئے اور انہوں نے ادب سے مصیبت زدہ بادشاہ کو سلام کیا۔

صبح نمودار ہوئی۔ بادشاہ نماز فجر کے لئے کھڑا ہوا۔ ابھی فارغ ہی ہوا تھا کہ اتنے میں ملک

خطی بھی آتا ہوا دکھائی دیا۔ بادشاہ نے دل میں خیال کیا کہ اگر وہ اچھی نیت سے آیا ہے تو اسے سیدھی جانب سے آنا چاہیے۔ وہ ٹھیک سیدھی جانب سے آیا اور سلام کیا۔

بادشاہ نے اس کی خیریت دریافت کی۔ ملک خطی نے عرض کیا کہ "تین روز قبل مرزا کامران کا فرمان آیا تھا کہ اگر بادشاہ ہمایوں ادھر سے آئے تو اسے گزرنے نہ دیا جائے چونکہ بادشاہ سلامت اب ایک بلوچ کے گھر تشریف لا چکے ہیں اس لئے مناسب یہی ہے کہ حضور سوار ہو کر روانہ ہو جائیں۔ تاکہ میں قبلۂ عالم کو اپنی سرحد تک بحفاظت تمام پہنچا دوں!"

بادشاہ بلاتوقف اپنی جماعت سمیت روانہ ہوا اور بلوچ سردار ملک خطی نے سو میل تک ان کا ساتھ دیا۔ سرحد ختم ہونے پر بادشاہ نے اسے رخصت کیا۔ اس کے بعد وہ گرم سیر کے علاقے میں داخل ہوا۔

(تذکرۃ الواقعات عرف ہمایوں نامہ از جوہر آفتابچی ص ۱۱۱)

یہ تذکرۃ الواقعات کا متن ہے جسے جوہر آفتابچی کا روزنامہ کہنا چاہیے یہ بادشاہ کے ان وفادار ملازمین میں سے تھا جو اخیر تک صدق و صفا کی راہ پر گامزن رہے۔ اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک خطی اس علاقے کا حاکم تھا اور اس کے قلعہ سے سو میل مغرب تک اس کی ریاست پھیلی ہوئی تھی۔ کم و بیش اتنا علاقہ مشرق کو بھی ہونا چاہیے۔

مولائی شیدائی کی تصریحات

میر رحیم داد خان مولائی شیدائی لکھتے ہیں کہ ملک خطی کا اصل نام خطی خان ہے۔ یہ بلوچ چاغی کے ریگستان کا حاکم تھا جس کی حدیں گرم سیر اور سیستان سے ملتی تھیں۔ خطی خان ہمایوں سے مستونگ میں آ کر ملا۔ اور ۱۶ رجب ۹۵۰ھ مطابق اکتوبر ۱۵۴۳ء جب ہمایوں مستونگ سے روانہ ہوا اس وقت خطی خان ہی اس کا محافظ تھا۔ جس کی مدد سے ہمایوں گرم سیر کے قلعہ بابا حاجی

یں سلامتی سے پہنچ گیا۔ ہمایوں کے پاس خزانہ نہ تھا مگر خوش قسمتی سے مرزا عسکری کا خزانچی خواجہ جلال الدین محمود مع خزانہ ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ خطی خان کو مرزا عسکری کی طرف سے جو خطوط موصول ہوتے رہے اس نے وہ سب ہمایوں کے سپرد کر دیئے۔

(بلوچی دُنیا ستمبر ۱۹۵۸ء ص ۵۰)

میر خطی خان بلوچ تھا اور اس نے اتنی بلند اخلاقی کا ثبوت دیا کہ پوری بلوچ قوم اسے سلام کرتی ہے۔ جب تک یہ دنیا قائم ہے ملک خطی کی تاریخی مہمان نوازی اور اس کی عدیم النظیر جرات وجسارت بلوچوں کے لئے سرمایۂ صد فخر ومباہات بنی رہے گی۔ آج جب پٹھان قوم تاریخ میں یہ پڑھتی ہے کہ ان کے ایک سردار جیون خان (ملک جیون خان باروزئی سبی کا علاقائی حاکم تھا) نے اپنے محسن شہزادہ دارالشکوہ کو جبکہ وہ اس کے ہاں پناہ لینے آیا تھا گرفتار کر کے دہلی پہنچا تھا تو ندامت کے مارے پوری قوم کا سر جھک جاتا ہے لیکن ہمارے سر کو ملک خطی علیہ الرحمتہ نے ہمیشہ کیلئے بلند کر دیا ہے۔

شہنشاہ ہمایوں کی واپسی

شیر شاہ کے بعد اس کا لڑکا سلیم شاہ تخت نشین ہوا اور نو سال حکومت کر کے فوت ہو گیا۔ اس کے بعد امراء نے اس کے کمسن بچے فیروز شاہ کو تخت نشین کیا۔ مگر اس کے ماموں مبارز خان نے اسے قتل کر کے تخت پر خود قبضہ کر لیا لیکن احمد خان سور، جو شیر شاہ کا بھتیجا اور داماد تھا اس سے الگ ہو گیا اور اس نے ملتان، سندھ اور دوسرے ملحقات پر قبضہ کر کے سلطان سکندر کے لقب سے اپنے نام کا سکہ وخطبہ جاری کیا۔

قومی اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ چاکر اعظم نے جب دیکھا کہ شیر شاہ سے تن تنہا نبٹنا اس کے بس کی بات نہیں تو اس نے پھر ہمایوں سے نامہ و پیام شروع کیا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا

ہے کہ چاکر اعظم نے خود ایران جاکر شہنشاہ سے ملاقات کی اور اسے ہندوستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ دوسری بار وہ قندھار میں بادشاہ سے ملا اور ۹۶۲ھ ء میں جب ہمایوں ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو چاکر اعظم چالیس ہزار لشکر جرار جلو میں لئے اس کے ہمراہ تھا۔ لاہور تک کا علاقہ تو بغیر لڑے بھڑے ہاتھ آ گیا مگر سرہند میں خوب میدان کارزار گرم ہوا۔ خانی خان لکھتا ہے کہ سکندر شاہ اسی ہزار فوج اور بے شمار ہاتھی لے کر مقابلے پر نکلا تھا۔ پہلے ہمایوں نے بیرم خان کی اتالیقی میں شہزادہ محمد اکبر کو جس کی عمر اس وقت بارہ سال تھی سکندر شاہ کے مقابلے پر روانہ کیا زاں بعد خود بھی پہنچ گیا۔

میر شہداد بن چاکر اعظم نے اس لڑائی میں بلوچی شجاعت کے خوب جوہر دکھائے تھے۔ اس موقع پر اس نے بلوچی زبان میں ایک جنگ نامہ بھی موزوں کیا تھا۔ جسے مسٹر ایل ڈیمز (M.L.Dames) نے اپنی مشہور کتاب The populer poetry of Balochies کے صفحہ ۳۲ پر درج کیا ہے۔ میر شہداد نے اپنا آنکھوں دیکھا حال اس طرح سے بیان کیا ہے۔

میر شہداد بن چاکر اعظم کا جنگ نامہ

میر شہداد کہتا ہے کہ میر چاکر خان رند نے اپنا لشکر جمع کیا دو تلواروں والے لنگاہ، ناہڑ اور کنگ فاتحانہ جذبہ سے سرشار اس کے جھنڈے کے نیچے روانہ ہوئے۔ دو دائی بھی تلواروں سے مسلح ان کے ہمراہ تھے۔ ان کے خوبصورت کندھوں پر نرم اور خوشبودار ہراتی چمڑے لپٹے ہوئے تھے اور ان کی تلواریں سبز رنگ کی پیٹیوں سے آویزاں تھیں۔ میر چاکر کا لشکر چالیس ہزار افراد پر مشتمل تھا۔ تیس ہزار میر عالی بلیدی اور دس ہزار راوچی مزید برآں تھے۔ دشمن کی تعداد چار لاکھ نفوس سے کہیں زیادہ تھی۔ (معلوم ہوتا ہے کہ عام تاریخوں میں پیدل فوج نہیں دی گئی اور میر شہداد نے اپنے جنگ نامہ میں سوار اور پیادہ تمام فوج کی تعداد بیان کی ہے۔)

طلوع آفتاب کے وقت دہلی کی لاتعداد فوج نمودار ہوئی۔ نیزوں کی چھاؤں نے زمین کو ڈھانپ دیا تھا۔ انسانوں اور گھوڑوں سے کوئی جگہ خالی نہ تھی۔ جب جنگ کا طبل بجا تو چالیس ہزار رند بلوچ حملہ آور ہوئے جن کے دل خوف سے آشنا نہ تھے۔ وہ تیز ہتھیاروں کے ساتھ آگے بڑھے۔ جنگ چھوٹی توپوں کی باڑھ سے شروع ہوئی جن کو خاکستری رنگ کے گھوڑوں پر رکھا ہوا تھا۔ ذرا سی دیر میں خون کی ندیاں بہہ نکلیں۔ اچانک چاکر اعظم کے جھنڈ سے غبار اٹھتا دکھائی دیتا۔ خان اعظم کے بائیں جانب بلیدی پسپا ہو رہے تھے اور کئی اپنی جگہ سے بھاگ چکے تھے۔ میسرہ پیچھے ہٹ آیا دلی والے شدت سے آگے بڑھے۔

اس وقت چاکر اعظم کی شیر دل بہن مائی بانڑی ہاتھی کے ہودج میں جم کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے اپنے طلائی زیورات اتار کر جمع کر لئے اور ایک ایک رند پہلوان کا نام لے کر نچھاور کرنے شروع کئے۔ وہ کہہ رہی تھی:۔

"بلوچ بہادرو! تمہاری ماؤں، بیٹیوں، بیویوں، بہنوں اور تمہارے ملک و وطن کی عزت و عصمت خطرے میں ہے۔ میں تمہیں خدا کے سپرد کرتی ہوں۔ ایک بار پانسہ مٹھی میں لے کر پھینک دو، یا سب کچھ ہار جاؤ یا سب کچھ جیت لو!"

میر شہداد کہتا ہے کہ ہم لوگوں نے اپنے باعظمت سروں کی بازی لگادی۔ یہاں تک کہ ہم کابلیوں سے گتھم گتھا ہو گئے۔ گرم گرم سبز چمکدار تلواریں جو تازہ تازہ سان پر سے چڑھ کر نکلی تھیں جوانوں کے سروں اور شانوں پر کھبنے لگیں۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ جنگجو افغان (شیر شاہی) پیٹھ دے کر بھاگنے لگے اور دلی کے نمک حرام ترکوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ دشمن کے دس ہزار آدمیوں کو ہم نے شیر نر کی طرح پھاڑ کر رکھ دیا یا فنا کی چکی میں پیس ڈالا۔

کافر (افغانوں کی غیر مسلم فوج) قتل ہوئے۔ ان کے گھوڑے چھین لئے گئے۔ ان کی

نازک اندام بیویاں لونڈیاں بنالی گئیں اور دہلی کے خزانے لوٹ لئے گئے۔

ہم نے (دہلی پہنچ کر) چار راتیں دلی میں گزاریں تاکہ ہمارے بہادر آرام کریں۔گھوڑوں کی تھکان دور ہو اوران کے پیروں کی سوجن رفع ہو!

ہمارے لشکر سے سات ہزار آدمی کام آئے۔تین سو بلوچ بھی مارے گئے۔جن میں علن بھی شامل تھا۔جوڈینگیں مارنے والے دشمن پر ہمیشہ حملے میں پہل کرتا تھا۔اس کے علاوہ نوتج جو نوحک کے ہمراہ آیا تھا اور بالش جو خاندان شاہی میں سے میر کے ہمراہ آیا تھا مارے گئے اور میں اپنے گھرانے کے اٹھارہ نوجوانوں میں سے نو مروا کر نو کے ساتھ واپس لوٹ رہا ہوں۔خدا میر چاکر خان کو سلامت رکھے اور اس کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر قائم رہے!۔

بلوچوں کی قدر افزائی

جب سرہند سے دشمن سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گیا تو ہمایوں فتح ومسرت کے شادیانے بجواتا ہوا دہلی کو روانہ ہوا اور رمضان المبارک ۹۶۲ھ میں اس شہر میں داخل ہوا۔اپنے آبائی تخت پر جلوس کر کے رفیقوں اور دوستوں کو انعام واکرام سے مالا مال کیا۔بلوچی زبان کا ایک شعر ہے

ے

پرُ شتگ ات دلّی گوں دلی تخت ءَ

رند بُنا نشت انت گوں بلند بخت ءَ

بے سمجھ لوگ اس شعر کا مطلب اس طرح کرتے ہیں کہ جب رندوں نے دلی کو فتح کیا تو سب کے سب ایک ساتھ تخت پر چڑھ بیٹھے۔تخت ٹوٹ گیا اور وہ گر پڑے۔حالانکہ اس کا یہ مطلب نہیں بلکہ اس طرح ہے کہ ''پایہ تخت دلی کو فتح کرنے کے بعد رند بلوچوں کو آرام نصیب ہوا''۔پرشتگ اتی دِلّی کے معنی ہیں ''دِلّی کو شکست ہوئی'' گوں وتی تخت ءَ، ''اپنے تخت کے ساتھ''۔رند بُنا نشتنت ''رند زمین پر بیٹھ گئے۔گوں بلند بخت ءَ ''اپنی بلند قسمت کے ساتھ!'' بلند

بخت کا لقب فاتحین کو ہی ملتا ہے۔ ''بُنا نشت انت'' کی ترکیب سے عوام کو دھوکا ہوا ہے لیکن اس کے معنی بھی زمین پر گرنے کے نہیں، بیٹھنے کے ہیں۔

شہنشاہ نے چاکر اعظم کو دہلی سے آگرہ کا درمیانی علاقہ اور ست گھرہ کی ریاست مرحمت فرمائی۔ چاکر اعظم نے اپنے رفیقوں کو تو بلند شہر، میرٹھ، تھانہ بھون، غازی آباد وغیرہ سیر حاصل مقامات میں آباد کیا اور اپنے فرزندوں میں سے میر نوح کو دہلی سے آگرہ جانے والی سڑک پر ایک جاگیر مرحمت فرمائی۔ میر باگڑ خان (باقر خان) کو متھرا کے قریب شاہ پور میں میر اللہ داد کو بھی جمنا کے کنارے آباد کیا۔ میر شہداد ''پنڈی میر شہداد''، میر شہک نے ''میر شہک'' اور میر شاہو خان نے ''شاہو بلوچ'' کے نام سے شہر اور قلعے تعمیر کئے۔ میر چاکر کثیر الاولاد تھے۔ ان کے تمام صاحب زادوں کی تعداد معلوم نہیں۔ اتنا علم ضرور ہے کہ رند لاشار جنگ میں میر چاکر کے اٹھارہ صاحبزادوں نے حصہ لیا تھا۔ ایک بلوچی شاعر اس بارے میں کہتا ہے:۔

چاکر گو ہژدہ بنگویں بچھا
گو ہزار ڈاڈے پوترویں رندا

خدا بہتر جانتا ہے کہ اس جنگ میں کتنے کام آئے اور کتنے بچ گئے۔ بہرحال وادئ پنجاب میں انہی صاحب زادگان کا پتہ چلتا ہے۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ بلوچوں نے جہاں ڈیرے ڈالے اس خطہ اراضی کو بہشت بریں کا نمونہ بنا دیا۔ قطاع الطریق اور چور اُچکے ڈر کر بھاگ گئے۔ پہلے قافلوں کو بھی یہاں سے گزرنے کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا لیکن اب بڑھیا ہاتھ میں زر و جواہر کے تھال لئے بے خطر سفر کرتی تھی اور کسی کو اس جانب نظر اٹھا کر دیکھنے کی جرأت تک نہیں ہوتی تھی!

چاکر اعظم کے لمحات آخر

چاکر اعظم کی زندگی ایک طوفانی زندگی تھی اور وہ ایک بہادر جرنیل اور منتظم حکمران تھے۔ جب وہ والد کے ہمراہ بلوچستان کی سرزمین میں داخل ہوئے تھے اس وقت وہ اپنے بہادر بیٹے میر شہداد کی طرح ایک جنگجو سردار تھے۔ فتح ونصرت ان کے قدم چومتی تھی۔ بلوچ قبائل ان سے محبت کرتے اور انہیں اپنا ہیرو جانتے تھے۔ میر شہک کے انتقال پر وہ تمام بلوچ قبائل کے سربراہ تسلیم کئے گئے۔ اس وقت لاشار بھی ان کے مطیع ومنقاد تھے۔ آپس میں رشتے ناطے ہوئے اور شیر وشکر ہو کر گزر اوقات کرنے لگے۔

پھر ایک ایسا وقت آیا کہ پانی اور چراگاہوں پر رند اور لاشار کے درمیان اختلافات شروع ہوئے جو بڑھتے بڑھتے زبردست مناقشے کی صورت اختیار کر گئے۔ گوہر مائی کے واقعہ نے اسے ہوا دی اور دونوں محاذوں سے تلواریں تڑپ کر نکلیں اور تیس برس تک آپس میں ٹکراتی رہیں۔ اس وقت بھی چاکر ایک جرنیل تھا جو اصول کی خاطر جان لڑا دینے میں اپنی عزت جانتا تھا لیکن جب جنگ ختم ہوئی اور چاکر نے فاتح اعظم کا لقب پایا تو دفعتہ خانہ جنگی اور طویل خون ریزی نے میر چاکر رند کو افسردہ اور غم زدہ کر دیا کیونکہ یہ بے آب وگیاہ دشت بیدار بلوچوں کا مقتل بن چکا تھا۔ اس پر میر جلال خان کے ہزاروں فرزندوں کی لاشیں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہوئی تھیں۔ اس میں لاشار اور رند قبائل کا گرم خون جذب ہو چکا تھا۔ اس کے بیٹے بھتیجے، بھائی بزرگ اور رفیق اس سرزمین کی نذر ہوئے تھے۔ پھر اس میں رکھا کیا تھا! نہ پانی نہ گھاس، ہر طرف لنڈ منڈ پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں اور صحرائے بسیط! وہ پنجاب کی زرخیز اور ہری بھری وادی کے تمول کے افسانے سن چکا تھا۔ لنگاہوں کے انحطاط اور مغلوں کے زوال کے قصے وادی بولان سے گزرنے والے قافلے اسے سناتے اور ادھر بڑھنے کی ترغیب دیتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے لاؤ لشکر سمیت پنجاب کی طرف بڑھ گیا۔ میر محمد خان اور ابراہیم خان اس کے چچا زاد بھائی میدانی علاقوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اس حقیقت سے

پوری طرح باخبر تھے کہ بلوچ پہاڑوں کو پشت پر لے کر ہی لڑ سکتے ہیں۔ کھلے میدان میں شاہی لشکر سے مقابلہ ان کے بس کا روگ نہیں۔ وہ کوہ سلیمان میں رک گئے۔ جب چاکر کی تادیبی کارروائی میں ان کی شہادت واقع ہوئی تو میر بجار اور میر ہیبتان بدک گئے اور بجائے چاکر اعظم کا ساتھ دینے کے کوہ سلیمان کی تلہٹی میں منتقل ہو گئے۔ مگر چاکر آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ دیپالپور تک جا پہنچا۔ اس کے قبائل ایک ایک کر کے راستے میں آباد ہوتے چلے گئے اور پھر ان میں حصول اقتدار کی خاطر خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ جس میں میر چاکر کے صاحبزادے اور زندگی کے ساتھی کام آئے۔ ادھر شیر شاہی عساکر نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ وقت چاکر اعظم کے لئے بڑا نازک تھا۔ وہ جس سرعت سے آگے بڑھا تھا اتنی تیزی سے پیچھے ہٹا اور جہاں میر بجار اور ہیبتان نے اس کے عزیزوں کے خون سے ہولی کھیلی تھی وہیں اس نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے اور خون کی ندیاں بہا دیں چونکہ شیر شاہ ڈیرہ جات کے سرداروں کو ان سے جدا کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا اس لئے اسے ہمایوں کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ یہ ایران پہنچا قندھار گیا مایوس شہنشاہ کی شریانوں میں جرات وجلادت کی حرارت پیدا کی۔ کئی سال اس نے قبائل کو دوبارہ متحد کرنے میں صرف کئے۔ کچھ عرصے تک اسے ہمایوں کی انتظار میں خاموش بیٹھنا پڑا۔ ہمایوں آیا تو اس کی خوابیدہ صلاحیتوں نے انگڑائی لی وہ نہ صرف بلوچ قبائل کہ بلکہ لنگاہ، کنگ، ناہڑوں کو بھی ہمراہ لے کر سرہند پہنچ گیا۔ اس لڑائی میں رند لاشار کی جنگ کا نقشہ ایک دفعہ پھر سامنے آ گیا۔ بلوچ جرنیل نے افغانوں کو مار مار کر بھگا دیا اور دہلی کے تخت کو ہمایوں کے لئے خالی کر دیا۔

ہمایوں کی قدردانی نے چاکر اعظم کے لئے سکون واطمینان کے لمحات پیدا کئے۔ بوڑھا جرنیل اپنی خون آشام تلوار نیام میں ڈال کر ایک منتظم حکمران کی صورت میں منظر عام پر آیا۔ اس نے اپنی زندگی میں ہی بلوچ قوم کو ہرے بھرے میدانوں میں آباد کر لیا اور خلیج العرب کے ساحل سے رود بار گنگا تک بلوچ ہی بلوچ نظر آنے لگے۔ اگرچہ خان اعظم کا برصغیر پر حکومت کرنے کا خواب پورا نہ ہو سکا۔ تاہم وہ بلوچوں کو ایسی آسودگی اور فارغ البالی سے ہمکنار کر گیا کہ وہ آج جہاں کہیں ہیں سکون واطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ صرف مغربی پنجاب کے بلوچوں کو سکھوں سے

نقصان پہنچا تھا لیکن اب ان کے زخم بھی مندمل ہو چکے ہیں۔

شہنشاہ میر چاکر خان کو اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا لیکن اس نے ست گھرہ میں رہنا پسند کیا۔ جہاں سے وہ اپنی قدیم ریاست اور جمنا کی جدید کالونیوں پر کڑی نظر رکھ سکتا تھا۔ چنانچہ جب اسے حاجی خان نے مدد کے لئے پکارا تو یہ شاہین کی طرف جھپٹ کر پہنچا اور شیر کی طرح گرج کر حملہ آور ہوا۔ میر بجار کو شکست دی اور میر ہیبتان کی کھوپڑی میں پانی پی کر واپس لوٹا۔ اس طرح کئی دفعہ اس نے فتح کا یقین لے کر یلغار کی اور ہر بار فتح و نصرت نے اس کے قدم چومے۔ ایک عرصے تک بڑے طنطنے اور شوکت و اجلال کے ساتھ حکومت کرنے کے بعد بلوچ دنیا کے اس رجل عظیم نے تقریباً ۹۷۲ھ (۱۵۶۵ء) میں رفیق اعلیٰ کو لبیک کہی اور اسے قلعہ کے پاس ہی اپنے یاران بے ریا کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ط۔

چاکر اعظم کی زندگی کافی حد تک ہمایوں سے مماثلت رکھتی ہے۔ دونوں کا شباب پورے جاہ و جلال سے گزرا دونوں کی درمیانی عمر ابتلاء و آزمائش کی نذر ہوئی۔ آخیر میں فتح و نصرت نے دونوں کے قدم چومے دونوں نے اس حالت میں سفر آخرت اختیار کیا کہ ان کے دلوں میں کوئی ارمان باقی نہ تھا۔ بقول شاعر

آنچناں زی کہ وقت مرُدن تو
ہمہ گریاں بودند و تو خنداں
(ایک دنیا ان پر رو رہی تھی اور وہ دونوں مسکرا رہے تھے)

چاکر اعظم کی وفات پر پوری قوم نے سوگ منایا۔ صرف ست گھرہ اور کوٹ میر شہداد میں ہی نہیں، بلکہ میر پور، گشکور، گورگیج، فتح پور، ساہیوال، خوشاب، ڈیرہ اسماعیل خان، منکیرہ، ڈیرہ غازی خان، روجھان، چانڈکو، سبی اور کیچ مکران تک اور مشرق میں مظفر گڑھ، میرٹھ، بلند شہر، چندیرو، جھاجھر، بجنور، گیسو پور، شاہ پور متھرا اور نوح میں بھی عظیم بلوچ حکمران کی وفات حسرت آیات پر صف ماتم بچھ گئی۔

چاکر اعظم کا مرثیہ

شعراء نے خان اعظم کے انتقال پر بے شمار دُ پُر درد مرثیئے لکھے لیکن ہم بوجہ عدم گنجائش صرف ایک ''موتک'' پر اکتفا کرتے ہیں۔ سبی کے نواح کا ایک شاعر کہتا ہے:۔

''سردار کی موت کی ہوشربا خبرسن کر زمانے کے سینے میں ایک ہوک اٹھی ہے۔
زمین کانپ رہی ہے اور فلک دہکتا ہوا انگارہ بن گیا ہے۔
اس انگارے سے بارش کے آتشیں قطرے ٹپک رہے ہیں
پُر ہیبت پہاڑ کانپ اٹھے ہیں۔
یہ عالم رنگ و بو اپنی چاروں سمتیں بدل چکا ہے۔
سات دریاؤں کے پانی میں طغیانی ہے جس سے سمندر غضب ناک طوفان کی زد میں ہے!
درخت انتہائی مایوسی میں سر جھکائے گم سم کھڑے ہیں۔
چٹانوں پر دیوانگی کا عالم طاری ہے۔
شاہی محل کے کنگورے گر چکے ہیں۔
اور سبی کے قلعے کی چاروں دیواریں گر کر تباہ ہو چکی ہیں۔
نوحہ گرو! میر چاکر کی المناک موت کے بلند آہنگ نوحے پڑھو۔
ہمارا سردار فراخدلی اور فیاضی میں دریائے سندھ تھا۔
وہ اتنا دانشمند تھا کہ بپھرے ہوئے سمندروں کو سکون میں لا سکتا تھا۔
وہ اپنے مہمانوں کو بھنے ہوئے گوشت (سجی) کے سوا کچھ نہ کھلاتا۔

اوران کے ہاتھ پانی کی بجائے گھی سے دھلواتا تھا۔

جب وہ عید پر مینڈھے ذبح کرتا تو دودھاری خنجر کند ہو جاتے۔

اس کے خوبصورت ہاتھ گونجدار بندوق سے کبھی خالی نہ رہے۔

اوراس کے پاؤں ساری عمر برق رفتار گھوڑوں کی رکابوں میں رہے۔

حیف! صد حیف!! ہمارا سردار قبائلی لڑائی میں نہ مرا!''

(بلوچی دُنیا اپریل ۱۹۵۹ء ص ۵۵)

ست گھرہ اور چاکر اعظم کا مقبرہ

مقبرہ میر چاکر رند مرمت و تعمیر سے قبل (فوٹو عبدالقادر رند، بلوچستان)

مقبرہ تعمیر گنبد کے بعد

ست گھرہ میں چاکر اعظم کے مزار نور بار پر عالی شان مقبرہ تعمیر کیا گیا تھا جو مغل طرز تعمیر کا بہترین نمونہ تھا سکھوں کے دور تک ست گھرہ بلوچ سطوت کا مرکز بنا رہا۔ مگر جب قلات کے خان اعظم میر نصیر خان نوری نے احمد شاہ ابدالی کے ہمراہ سکھوں پر تابڑ توڑ حملے کئے تو ان کے واپس جانے پر سکھوں نے بلوچوں سے سخت انتقام لیا۔ ست گھرہ کے بلوچ تلوار کے دھنی تو تھے مگر توپوں کا جواب ان کے پاس نہ تھا۔ کئی لڑ کر شہید ہوئے اور کئی اہل و عیال کو لے کر جنگلوں میں جا چھپے۔ جو بلوچ مظفر گڑھ یا فیصل آباد کے جدید آباد کاروں کی صورت میں ملتے ہیں یہ انہی بلوچ سر بازوں کی اولاد ہیں۔ جنہوں نے کبھی دہلی کو اپنی خون آشام تلواروں سے فتح کیا تھا۔ ست گھرہ کا قلعہ کبھی دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتا تھا۔ زیر زمین تہ خانے اور سرداب تھے اور اوپر دو منزلہ سہ منزلہ عمارتیں تھیں۔ سکھوں نے خزائن اور دفائن کے لالچ میں تمام قلعہ کو تہ و بالا کر دیا جو لے جا سکتے تھے لے گئے۔ جو نہ اٹھا سکے انہیں اونے پونے بیچ ڈالا۔ خالصہ دربار نے یہ علاقہ قمر سنگھ نامی ایک سردار کو الاٹ کیا تھا۔ اس نے بلوچوں کے قبرستان پر ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی اور قدیم ست گھرہ کی اینٹوں سے اس کی تعمیر شروع کی۔ چنانچہ موجودہ شہر تمام و کمال پرانے ست گھرہ کے ملبے کا رہین منت ہے۔ صرف یہ شہر ہی نہیں بلکہ چھ چھ میل تک جو چاہات تعمیر ہوئے ہیں یا مکانات بنائے گئے ہیں سب میں اسی شہر کی اینٹیں لگی ہیں۔ اوکاڑہ سے ست گھرہ اور ست گھرہ سے رینالہ تک جو پختہ سڑکیں بنائی گئی ہیں ان پر بھی اسی شہر کی اینٹیں کام آئی ہیں!

ست گھرہ کا قبرستان نئی آبادی میں دب گیا اور بلوچ سردار کا مقبرہ ایک برج میں تبدیل

کر دیا گیا۔ گنبد کو شہید کر کے قمر سنگھ نے اس پر دو منزلہ عمارت تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن مقبرہ کافی کشادہ تھا اور سکھ سردار کو لمبا شہتیر میسر نہ آسکا تھا اس لئے چاکر اعظم کی مرقد پاک پر ہشت پہلو ستون کھڑا کر کے اس پر چھت قائم کی اور قبر ملبہ میں دھنس کر رہ گئی۔

نیاز مند نے ۱۹۵۷ء میں نوابزادہ سردار عطا محمد خان لغاری کمشنر ملتان کی توجہ اس طرح مبذول کرائی۔ انہوں نے ست گھرہ کا معائنہ فرمایا اور محکمہ آثار قدیمہ کو سفارش کی کہ اس مقبرے کو اپنی تحویل میں لے کر مرمت کرے۔ محکمہ آثار قدیمہ نے اس پر قابل قدر کام کیا ہے۔

مقبرہ نواب میر شہداد

اسی طرح چاکر اعظم کے ولی عہد اور بہادر فرزند نواب میر شہداد خان رند کا مقبرہ دریائے راوی کے کنارے سکھوں کے دور تک موجود تھا۔ بلوچ جاتے وقت اپنا خزانہ میر شہداد کے مقبرہ میں دفن کر گئے۔ بعد میں جو لوگ خزانے کی تلاش میں آئے انہوں نے تمام مقبرے کو کھود ڈالا۔ جب نیاز مند پیرزادہ حیدر علی شاہ کے ہمراہ اس مقبرے کی تلاش میں موضع کھائی پہنچا تو وہاں کے شاہ صاحب ہمیں ایک وسیع قبرستان میں لے گئے۔ ایک جگہ ہالہ کی شکل میں شکستہ اینٹوں کا کچھ ملبہ نظر آیا وہاں رُک گئے اور فرمایا یہ ہے بلوچوں کے بہادر جرنیل میر شہداد کی آخری آرام گاہ۔ جس کے حسن و جمال اور شجاعت بصالت کی داستانوں سے بلوچ دنیا کا نام قائم ہے۔ اس تودۂ خاک کو ہم تاسف کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ بے اختیار یہ شعر زبان پر آ گیا۔

ہمین است سردار شمشیر زن که در جنگ بودے چوں شیر کہن

شاہ صاحب نے بتایا کہ مقبرے میں دو مزار تھے۔ ایک میر شہداد کا (مقبرے کا آثار گول ہے اور کافی کشادہ ہے۔ بڑی بڑی اینٹیں لگی ہوئی ہیں جو پندرہ انچ لمبی اور پانچ پانچ انچ موٹی ہیں۔ (سلطان التارکین حمید الدین حاکم قدس سرہٗ کے تذکرہ میں میر شہداد کا ذکر آتا ہے۔ حضرت

شیخ غالباً بہلول لودھی کے معاصر تھے اس لئے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ پنڈی میر شہداد پہلے آباد تھی ہوسکتا ہے کہ ملک خیر الدین کھچی کا ہی یہی گاؤں ہو اور نواب میر شہداد نے بحصول مغفرت ملک صاحب کی قبر کے قُرب میں دفن ہونے کی وصیت کی ہو!) اور دوسرا ان کے فرزند کا لیکن اب دونوں مزار بلوچوں کی بے حسی کا شکار ہو چکے تھے۔ راوی پار میر شہداد کی اولاد کے محلات صاف نظر آ رہے تھے۔ ہم دریا عبور کر کے داد بلوچ پہنچے۔ یہاں کے زمیندار سردار منظور احمد خان لاہور گئے ہوئے تھے۔ ان کے والد صاحب نے بتایا کہ ہم نوح بن چاکر کی اولاد سے ہیں۔ اس لئے نوحانی کہلاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے خاندانی نساب کو بلایا۔ یہ شخص اپنے فن میں بڑا ہوشیار معلوم ہوتا تھا۔ اس سے کافی معلومات حاصل ہوئیں۔ اس نے بتایا کہ جہاں آپ نے میر شہداد کے مقبرے کے نشانات دیکھے ہیں اس کے قریب ہی نواب میر شہداد کا قلعہ تھا جو اب کھائی سے موسوم ہے۔ اس کے دو فرزندوں میر میراںؔ اور میر نصرتؔ خان نے بھی دو قلعے تعمیر کرائے تھے۔ ایک میر پورؔ کہلاتا تھا۔ جو رقبے میں ست گھرہ سے کم نہیں تھا۔ لوگ اس کی اینٹوں کو دور دور تک نکال کر لے گئے اور ان سے اپنے مکانات بنوائے۔ میر پور میں بلوچ کئی صدیوں تک شاہانہ تمکنت سے آباد رہے جب مہنی قبائل اس علاقے میں وارد ہوئے تو بلوچوں اور ان کے مابین چراگاہ پر تنازعہ ہو گیا اور جنگ تک نوبت آ پہنچی۔ کئی پشتوں تک ان کے درمیان کشت و خون ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ لنگاہ پسر بدھو قوم بھروانہ سیال کی عملداری میں ان اقوام کے درمیان ایک شدید جنگ ہوئی جس میں بلوچوں کو شکست ہوئی اور سیالوں نے میر پور کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بلوچ مختلف اطراف کو منتقل ہو گئے۔ مہنے سیالوں کا پورے ساندل بار پر قبضہ ہو گیا۔ اب تک بن مراؔلی اور روڑاں والی میں بلوچوں کی قبریں اور گنبد موجود ہیں۔ کسی بلوچ کو آج تک ان کی مرمت کا خیال نہیں آیا۔ حالانکہ علاقہ موچی والا میں نور محرمی بلوچ کی اولاد کئی چکوک کی مالک ہے۔ اس قبیلے کے افراد تعلیم یافتہ اور برسر روزگار ہیں اور ان کا علاقے میں کافی دبدبہ بھی ہے۔

کوٹ نصرت خان: میر شہداد کے دوسرے صاحبزادے نے کوٹ نصرت خان کے نام سے قلعہ بنوایا تھا جو کوٹ نصرت خان سے موسوم تھا۔ ان سب کی اولاد موجود ہے مگر علم کی کمی کے سبب اپنے مقام سے بے خبر ہے۔ کوٹ میر شہداد سے اڑھائی میل بجانب غرب ایک اور قلعہ میر بلوچ خان نے تعمیر کرایا تھا۔ اس میں میر صاحب کے محلات تھے۔ مگر اب یہ بھی کھنڈر بن کر رہ گیا ہے۔

کوٹ خان کمال: اسی طرح یہاں ہوت بلوچوں کے دو قلعے تھے۔ ایک خان کمال اور دوسرا کوٹ شہباز کے نام سے مشہور تھا۔ یہ دونوں قلعے پختہ تھے۔ ان سے اتنی اینٹیں برآمد ہوئیں کہ چھ چھ میلوں تک جو مکانات بنے ہوئے ہیں یا جن سے چاہات تیار کئے گئے ہیں۔ یہ سب انہی قلعوں کے شرمندہ احسان ہیں۔ اب قلعے تو نہیں رہے لیکن ان ناموں سے گاؤں موجود ہیں۔

فتح پور: فتح پور نام سے جو قلعہ راوی کے کنارے موجود ہے یہ سکندر خان کے باپ فتح خان ہوت کا تعمیر کردہ ہے۔ خان کمال ہوت کا شجرہ نسب درج ذیل ہے۔

خان کمال بن مہابت خان بن سکندر خان بن فتح خان بن زیبن خان بن راجو خان بن اسماعیل خان بن عالی خان بن ہوت خان۔

ہمیں بتایا گیا ہے کہ پاس ہی کرم بلوچ نامی ایک گاؤں ہے۔ اس میں میر شہداد کی اولاد آباد ہے اور میرانے بلوچ کہلاتی ہے۔ غالباً میر میراں بن میر شہداد کی نسبت سے میرانے مشہور ہیں۔ ہم وہاں پہنچ کر اس گاؤں کے معمر بزرگ جلال خان سے ملے۔ ان سے میں نے نواب میر شہداد خان کی قبر مرمت کرانے کی درخواست کی اور عرض کیا کہ اگر آپ پختہ نہیں بنوا سکتے تو کچی اینٹوں سے ہی بنوا دیں۔ جلال خان نے اپنے خاندان کی غفلت کا اعتراف کیا اور وعدہ کیا کہ میر شہداد کے مقبرے کی ان کے شایان شان مرمت کرائیں گے۔ ہم نے کنجوانی کے امیر کبیر میاں رجب علی خان بلوچ سے رجوع کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ ہماری تو اصل جائے رہائش بھی وہی ہے اور اب تک ہمارا کافی رقبہ اس طرف موجود ہے ہم لوگ بہت جلد اس طرف توجہ دیں گے۔

کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ میاں صاحب کا دفعتہ انتقال ہو گیا اور ہماری بات وہیں کی وہیں رہ گئی۔ اب ہماری توقعات مرحوم کے فرزند ارجمند میاں ناصر علی خان بلوچ اور مرحوم کے قوم پرور برادراں میاں احمد علی خان اور میاں بہادر علی خان سے وابستہ ہیں اور انہیں حکیم شیراز کے درج ذیل پند سودمند کے مصداق درخواست کرتے ہیں کہ وہ مرحوم بھائی کے وعدہ کو ایفا کریں:۔

نام نیکو رفتگاں ضائع مکن　　　تا بماند نام نیکت برقرار

خوشاب

شجاع الملک نے مہاراجہ سے کہا کہ میں نے آج تک ایسا مستعد سپہ سالار نہیں دیکھا جسکی للکار تمام رات قلعہ سے آتی رہی ہے۔ بلند آواز، زبردست اور منتظم سردار معلوم ہوتا ہے! مہاراجہ اور اس کے سرداروں نے بیک آواز کہا کہ آپ درست کہتے ہیں۔ ایک ہفتہ ہو چکا ہے صبح سے شام اور شام سے صبح تک جعفر خان کی گرجدار آواز برابر سنائی دیتی رہتی ہے۔

O

چاکر اعظم کے حالات میں ناظرین کرام پڑھ چکے ہیں کہ جب شیر شاہی افواج کا دباؤ بڑھ گیا اور ڈیرہ جات کے بلوچ سردار میر چاکر کا ساتھ چھوڑ کر شیر شاہ سے جا ملے تو میر چاکر خان نے اپنے قبائل کو جو لاہور سے کوہ سلیمان تک جگہ جگہ منتشر حالت میں پڑے تھے۔ محفوظ مقامات کی طرف منتقل ہو جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ جسے جو جگہ زیادہ قریب اور محفوظ نظر آئی وہ اس طرف بڑھ گیا۔

میر چاکر خان کثیر الاولاد سردار تھے اور ان کے صاحبزادے اس وقت بھرپور جوان تھے۔ کئی میر چاکر خان کے ہمراہ گئے اور کئی گھنے جنگلات اور صحراؤں میں دبک کر بیٹھ گئے اور حالات کا انتظار کرنے لگے۔ انہی ایام میں میر چاکر خان کے دو بہادر بیٹے میر دادن اور میر بجار راوی کو عبور کر کے چنیوٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ چونکہ بھیرہ میں شیر شاہی لشکر کے پہنچنے کا امکان نہ تھا۔ میر بجار نے دریائے جہلم کے کنارے اپنے قبیلے کے لئے چند گلی مکانات تعمیر کرائے اور فکر فردا سے بے نیاز ہو کر ڈیرے ڈال دیئے۔ میر دادن کو جب مخبروں سے پتہ چلا کہ شیر شاہ ملتان روانہ ہو گیا ہے تو وہ خوشاب میں منتقل ہو گیا۔ یہاں میر پہلوان خان کورائی کا خاندان آباد تھا۔ مگر خوشاب کی حکومت ان کے قبضے میں نہیں رہی تھی۔ شیر شاہ نے پہلوان خان کے پوتے سمندر خان کو معزول کر کے ایک نیازی پٹھان کو خوشاب کا حاکم بنا دیا تھا۔ میر دادن کی آمد کو کورائی بلوچوں نے آئیہ رحمت سمجھ کر بڑی خوشیاں منائیں اور میر دادن کے اہل و عیال کے لئے اپنی حویلیاں خالی کر دیں۔ میر دادن اگرچہ بظاہر پرامن شہری کی طرح خاموش زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن اندر ہی اندر خان اعظم سے ان کے نام و پیام کا سلسلہ جاری تھا۔ اس نہج پر زندگی بسر کرتے چند سال ہی گزرے تھے کہ چاکر اعظم کا پیغام آ پہنچا کہ شہنشاہ سلامت محمد ہمایوں پنجاب

میں داخل ہو چکے ہیں۔ انہیں ملو۔ تمہاری بابت شہنشاہ کو سب کچھ عرض کر دیا گیا ہے۔

چنانچہ جب شہنشاہ کی آمد آمد ہوئی تو میر دادن، میر بجار اور کورائی سردار سب سلام کو حاضر ہوئے اور دہلی کی مہم کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ شہنشاہ نے میر دادن کے بیٹے میر بہادر خان کو خوشاب کی حکومت عنایت کی۔ میر بجار کو تھل عطا ہوا۔ کورائی بلوچوں کو ان کی خواہش کے مطابق سیر حاصل اراضیات سے خوش کیا اور میر دادن، میر بجار، میر داد، کرم خان، رشید خان، اللہ یار خان اور قائم خان کورائی بلوچوں کے رزم آزماء نوجوانوں اور اس علاقے کی دوسری اقوام کے بہادروں سے فوج کا ایک نیا لشکر مرتب کر کے نئے ولولوں کے ساتھ آگے بڑھا۔

سرہند کی جنگ میں میر دادن، میر بجار اور کورائی بہادروں نے اپنے نامور سردار میر چاکر کے زیر علم مردانگی اور شجاعت کے خوب جوہر دکھائے اور جب دہلی فتح ہوگئی تو میر بجار اور میر کورائی انعام واکرام سے نہال ہو کر خوشاب کو واپس لوٹے۔ کئی قرائی وہیں رہ پڑے۔ انہیں یوپی میں جاگیریں مرحمت ہوئیں۔ میر دادن (میر دادن کی اولاد میں سے سردار دلیل خان المعروف بہ نواب فوجدار خان نے دہلی اور ریواڑی کے درمیان فرخ سیر کے زمانے میں بلوچ ریاست کی بنیاد ڈالی) کو آگرہ کے مضافات میں اعلیٰ اراضیات عنایت کی گئیں۔ وہ خود آگرہ میں آباد ہوئے اور شہر کے جس گوشے کو انہوں نے شرف اقامت بخشا وہ "بلوچ پورہ" سے موسوم ہو کر رہ گیا۔

خوشاب کا تاریخی پس منظر

خوشاب ایک تاریخی شہر ہے۔ دریائے جہلم کے کنارے واقع ہے اور واقعی اسم بامُسّمیٰ ہے۔ اس شہر کا بانی میر پہلوان خان کورائی سردار تھا۔ جو نواب بہلول خان کا منظور نظر ملازم تھا۔ ۱۴۵۰ء میں قسمت کی یاوری سے جب بہلولودھی نے دہلی کے تخت پر جلوس کیا تو میر پہلوان خان کو فوج کا بڑا عہدہ تفویض ہوا۔ وہ کافی عرصہ تک حسین شاہ والی جون پور کی لڑائیوں میں حق نمک ادا کرتے رہے

اور جب وہ بوڑھے ہو گئے تو اپنے بدلے دو جوان بیٹوں کی خدمات پیش کر کے پنڈ دادن خان چلے آئے۔ ان کے مذکورہ صاحبزادے گوڑ گانوہ میں آباد ہوئے۔ جہاں انہیں حکومت کی طرف سے معقول جاگیریں عنایت کی گئیں۔

خوشاب کی تعمیر

ان دنوں سید یار شاہ بخاری نام کے ایک درویش دریائے جہلم کے کنارے رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے لئے ایک معمولی سی بیٹھک اور مسافروں کے ستانے کے لئے چند سادہ مکانات بنوا رکھے تھے۔ پانی کی ایک سبیل بھی تھی۔ جس میں ہر وقت گھڑے پانی سے بھرے رہتے تھے۔ شہنشاہ بہلول ان کا معتقد تھا۔ جب ان کا نیاز حاصل کرنے آتا تو میر پہلوان خان کو بھی اپنے ہمراہ لاتا تھا۔ چند بار شہنشاہ کے ہمراہ حاضری دینے سے میر پہلوان خان کے دل میں شاہ صاحب کی عقیدت گھر کر گئی اور روز بروز یہ جذبہ بڑھتا چلا گیا۔ ضعیفی کا عالم، فاصلے کی زیادتی۔ حضرت نے میر صاحب کی والہانہ عقیدت دیکھی تو فرمایا:

''پہلوان خان! مناسب ہے کہ مع قبائل یہاں آجاؤ اور ہمارے پاس مستقل رہائش اختیار کر لو!''

عرض کی۔ شاید اس جگہ کی آب و ہوا میرے اہل و عیال کے موافق نہ آئے۔ فرمایا:

''آب و ہوائے ایں جا انشاء اللہ خوش آب و ہوا خواہد گردید!''

(اس جگہ کی آب و ہوا انشاء اللہ خوش آب و ہوا ثابت ہو گی!)

میر صاحب نے ایک ساعت سعید میں شاہ صاحب کے بتائے ہوئے نقشے کے مطابق شہر کی تعمیر شروع کی۔ نام کے لئے عرض کیا۔ تو فرمایا ''خوش آب'' سے اچھا نام اور کیا ہو سکتا ہے۔ جب شہر کی عمارتیں بن کر تیار ہو گئیں تو میر پہلوان خان مع اہل و عیال اس میں منتقل ہو آئے۔ شاہ صاحب کا انتقال ہو گیا اور وہ دریا کے کنارے ہمیشہ کی نیند سو گئے۔ دریا میں طغیانی آئی خوشاب

بہہ گیا۔ میر پہلوان کی اولاد امجاد نے اس شہر کو دوبارہ تعمیر کیا اور لوگ خوش و خرم آباد ہونے لگے۔

خوشاب کے بلوچ بابر کے دربار میں

انہی ایام میں بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ جب وہ بھیرہ کے قریب خیمہ زن ہوا اور اس کے دربار میں بھیرہ اور خوشاب کے بلوچوں کی شجاعت اور ان کے اثر و نفوذ کا ذکر ہوا تو اس نے اپنے ایک مصاحب حیدر علمدار کوان کے ہاں بھیجا۔ جس پر ان دونوں شہروں کے بلوچ سرداروں نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر نذریں پیش کیں۔ بابر نے ان کی جاگیریں ان کے نام پر بحال رکھیں اور آگے روانہ ہو گیا!

شیر شاہ سوری خوشاب میں

جب شیر شاہ نے ہمایوں کو شکست دی تو وہ اس کے تعاقب میں یلغار کرتا خوشاب پہنچا۔ گرمی کا موسم تھا۔ شہنشاہ پسینے میں شرابور اس شہر میں داخل ہوا تو درختوں کا خنک سایہ اسے بھلا معلوم ہوا۔ پانی پیش ہوا تو اس سے اور تسکین ہوئی۔ خوش آب (لفظ ''خوش آب'' سے اس شہر کی تاریخ تعمیر بھی برآمد ہوتی ہے) کا نام پسند آیا۔ گورنر پنجاب کو حکم دیا کہ اس شہر کو جدید بنیادوں پر تعمیر کرنے کے لئے بلوچ سرداروں کا ہاتھ بٹاؤ۔ چنانچہ اس شہر نے از سر نو زندگی پائی اور ملتان و لاہور کی طرح دنیا بھر میں مشہور ہو گیا۔

شیر شاہ کے بعد ہمایوں نے یہ نگری میر بہادر خان کو نوازش کی۔ میر دادن اور دوسرے بلوچ سورماء تو بادشاہ کے ہمراہ دلی روانہ ہوئے مگر سردار بہادر خان اس قطعہ اراضی کو سنوارنے میں مصروف ہوا۔ میر بہادر خان کے بعد سردار رحمت خان، سردار حشمت خان اور سردار مسوخان نے مغلوں کے زیر سایہ اس شہر کو بڑی ترقی دی اور یہ کابل اور لاہور کے درمیان ایک تجارتی منڈی بن گیا۔

اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور اورنگزیب کا زمانہ امن و سکون کا زمانہ تھا۔ پنجاب کی سرزمین کسی

حادثے سے دوچار نہیں ہوئی۔ البتہ ۱۷۴۸ء کے قریب جب سلطنت مغلیہ کمزور ہو چکی تھی اور سکھ و مرہٹے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے۔ ان دنوں خوشاب کی زمام اقتدار سردار مہر خان کے ہاتھوں میں تھی۔ احمد شاہ ابدالی ہندوستانی مسلمانوں کی امداد کے لئے اس ملک میں داخل ہوئے اور لشکر شاہی دریائے جہلم کے کنارے پہنچا تو سردار مہر خان نے ہی قشنون قاہرہ کے لئے کشتیاں فراہم کیں اور راشن کا بندوبست کیا۔ شہر کے آدمیوں کو جمع کر کے دریا پر لے گئے۔ لشکر شاہی کے سامان کو عبور کرانے میں مدد دی اور جب لشکر نے آگے بڑھنے کے لئے حرکت کی تو بار برداری کے لئے پانچ سو اونٹ مہیا کئے اور اپنے بیٹے لعل خان کو اس جہاد میں حصہ لینے کے لئے ہمراہ کر دیا۔ احمد شاہ ابدالی جب فتح و نصرت سے ہمکنار ہو کر واپس لوٹا تو اس نے خوشاب کے خراج سے ایک چوتھائی حصہ سردار مہر خان کو علاوہ نقد انعام کے مرحمت کیا اور خلاع فاخرہ سے بھی نوازا۔

سردار لعل خان

۱۷۵۶ء میں سردار مہر خان کا انتقال ہو گیا۔ ۱۷۵۷ء میں احمد شاہ نے پھر حملہ کیا لیکن والد ماجد کی وفات کے سبب سردار لعل خان بار برداری کے انتظام میں حصہ نہ لے سکے۔ مگر دو سال بعد جب مرہٹوں نے دوبارہ یورش کی تو سردار لعل خان نے نہ صرف لشکر شاہی کو دریا رعبور کرنے میں مدد دی بلکہ بار برداری کے لئے ایک ہزار اونٹ بھی پیش کئے اور لشکر کے ہمراہ رہے۔ پانی پت کے مقام پر جنگ ہوئی۔ سردار لعل خان رسد رسانی پر مقرر تھے۔ چنانچہ آپ نے رسد کا اتنا اچھا انتظام کیا کہ لشکر میں کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ نے فتح کی خوشی میں دوبار منعقد کیا اور سردار لعل خان کو حسن خدمات کے صلے میں ایک چوتھائی کی بجائے خوشاب کا سالم خراج معاف اور نقد انعام مرحمت کیا۔ شہر کی فصیل خام تھی سردار صاحب نے اسے

پختہ بنوایا اور پچیس سال تک اس شہر پر بڑے دبدبہ اور شان وشوکت سے حکومت کی۔

ملک خان محمد خان ٹوانہ اس خاندان سے خدا واسطے کا بیر رکھتا تھا۔ ایک بار دھوکے سے وہ قلعے میں داخل ہو گیا۔ اس نے اپنی فوج کو ہدایت کر رکھی تھی کہ جونہی قلعہ کی فصیل پر روشنی ہو فوراً حملہ کر دیا جائے مگر سردار لعل خان کے بیدار بخت فرزند جگر بند جعفر خان کو بروقت پتہ چل گیا۔ اس نے آدھی رات سے پیشتر ہی دھکے دے کر خان محمد ٹوانہ کو قلعے سے باہر نکال دیا۔ جعفر خان اگر چاہتا تو اسے قتل کر دیتا یا قید خانے میں ڈال دیتا۔ مگر اس نے شرمندہ کرنے پر اکتفا کیا۔ بجائے اس کے خان محمد نادم ہوتا اس نے ۱۷۷۲ء میں جبکہ سردار لعل خان اپنے چھوٹے بیٹے حاکم خان اور اپنی اہلیہ محترمہ کے ہمراہ اس کے ہاں بطور مہمان کے مقیم تھا۔ ان تینوں بے گناہوں کو قسم قسم کی اذیتیں دینے کے بعد شہید کر دیا۔

سردار جعفر خان اوّل

سردار جعفر خان نے آبائی تخت پر مسند نشین ہوتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ خاندان کے مکار دشمن خان محمد خان ٹوانہ کو انتقام لینے کی غرض سے پیہم ایسے چرکے لگائے کہ اسے دن کے تارے نظر آنے لگے۔ سردار جعفر خان نے ریاست کا بہت اچھا انتظام کیا۔ نور پور ٹوانہ خوشاب سے پندرہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس طرف کو چھوڑ کر باقی اطراف میں بیس بیس کوس تک ان کی عملداری تھی۔ رعایا خوشحال زندگی بسر کرتی تھی اور سردار کے اخلاق کے گن گاتی تھی۔ سردار جعفر خان اگرچہ ایک جابر حکمران تھے۔ مگر ان کی دانائی اور پاکدامنی مسلمہ تھی۔ لوگوں کو ان پر اتنا اعتقاد تھا کہ اگر کسی بی بی کے ہاں اولاد نہ ہوتی تو وہ سردار جعفر خان کے قدموں کی خاک کو بطور تبرک استعمال کرتی تھی اور اللہ اس کی گود ہری کر دیتا تھا۔

سردار جعفر خان کے انتقال پر ان کا صاحبزادہ سردار خان مسند نشین ہوا مگر بہت جلد ملک عدم کو رخصت ہو گیا۔

سردار جعفر خان ثانی

۱۷۸۵ء میں اپنے والد ماجد سردار خان کے انتقال پر سردار جعفر خان آبائی مسند کے وارث بنے۔ انہوں نے پچیس سال نہایت شان وشوکت سے حکومت کی۔ ان کی معاصرین میں بڑی عزت تھی۔ جس رئیس کی حمایت پر سردار صاحب ہوتے وہ فخر کرتا تھا لیکن "ہر کمالِ رازوال" ۱۸۱۰ء میں ابھی موسم بہار کا آغاز ہی تھا کہ اس مینوسواد خطۂ ارضی پر خزاں چھا گئی۔

رنجیت سنگھ کا حملہ

مہاراجہ رنجیت سنگھ جو ہر سال کسی نہ کسی مسلمان ریاست کو ٹھکانے لگاتا تھا اس دفعہ بذات خاص لشکر جرار لے کر خوشاب پر چڑھ آیا۔ اس وقت قلعہ میں ۳۰۰ پیدل سپاہی، ۲۰۰ سوار اور چار توپیں تھیں۔ سردار جعفر خان قلعہ بند ہو گیا اور اس نے ۵۰۰ سپاہیوں میں سے دو سو سپاہی قلعہ کی غربی دیوار پر جس طرف مہاراجہ کا کیمپ تھا تعینات کئے اور سو سپاہی پچیس پچیس کے حساب سے قلعہ کے ہر برج پر جہاں توپیں نصب تھیں متعین کئے۔ دو سو سپاہی محفوظ کر لئے جو ڈیوٹی والوں کی جگہ تعینات کئے جاتے تھے۔ جنرل گورکھ سنگھ نے بڑی کوشش کی مگر قلعہ کی دیوار تک پہنچ کر پسپا ہو جاتا۔ بیرونی گولہ باری سے قلعہ کی دیواروں میں جو رخنے پڑتے رات کو سردار جعفر خان انکی مرمت کرا دیتا تھا۔ جس پر مہاراجہ اور اس کے سردار انگشت بدنداں رہ جاتے تھے۔ شاہ شجاع افغانستان کا معزول بادشاہ ان دنوں مہاراجہ کے ہاں آیا ہوا تھا گفتگو کے دوران شجاع الملک نے مہاراجہ سے کہا کہ میں نے آج تک ایسا مستعد سپہ سالار نہیں دیکھا جس کی للکار تمام رات قلعہ سے آتی رہی ہے۔ بلند آواز، زبردست اور منتظم سردار معلوم ہوتا ہے۔ مہاراجہ اور اس کے سرداروں نے بیک آواز کہا کہ آپ درست کہتے ہیں۔ ایک ہفتہ ہو چکا ہے۔ صبح سے شام اور شام سے صبح تک جعفر خان کی گرجدار آواز سنائی دیتی رہتی ہے۔ جس سے اس کی مصروفیت

اور انتظام میں سرگرمی کا پتہ چلتا ہے۔

جب دربار برخواست ہوا اور شجاع الملک اپنے خیمہ شاہی میں گیا تو محبت اور اخوت اسلامی کے پیش نظر اس نے رات کو شرفاء شہر کا اجلاس طلب کیا۔ ان سے کہا کہ راجہ کی طاقت کا تم سب لوگوں کو اندازہ ہو چکا ہے۔ کوئی ایسی تجویز سوچو جس سے جعفر خان اور ہزاروں مسلمان ہلاکت سے بچ جائیں۔ سب نے عرض کیا کہ بادشاہ کا مشورہ صائب ہے۔ جعفر خان کو صلح پر آمادہ کیا جائے۔ چنانچہ شجاع الملک نے قابل اعتماد افراد پر ایک وفد مرتب کیا اور اسکی معرفت سردار جعفر خان کو ہمدردانہ نصیحتیں اور خیر خواہانہ پیغام ارسال کیا۔ ساتھ ہی راجہ کو کہہ کر قلعہ پر گولہ باری بند کرادی۔ اس وقت راجہ نے قلعہ کی دو تین اطراف میں سرنگیں کھود کر انہیں بارود سے بھر دیا تھا۔ بادشاہ نے پیغام میں اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ اس وقت تم جوالامکھی کے دہانے پر کھڑے ہو۔ فیتے کو آگ دکھانے کی دیر ہے سارا قلعہ بھک سے اڑ جائے گا۔

اس پیغام کا سردار جعفر خان پر خاصا اثر ہوا۔ اس نے دو تین مقامات کو کھدوا کر دیکھا۔ واقعی سرنگیں بارود سے اٹی پڑی تھیں۔ اس پر وہ تن بتقدیر صلح پر آمادہ ہو گیا۔ قلعہ پر سفید نشان چڑھا دیا گیا اور بعد دوپہر جعفر خان قلعے سے نکلا۔ دو اسپ خاصہ اور ایک تھال جواہرات سے بھرا ہوا اپنے ہاتھ میں رکھ کر راجہ کے دربار میں پیش ہوا۔ مہاراجہ صلح کا نشان دیکھ کر پہلے ہی خوشی سے جھوم رہا تھا۔ سردار کو دیکھا تو فرط مسرت سے بے اختیار پکار اٹھا "شاباش بلوچ شاباش"! اور عزت کے ساتھ دربار میں جگہ دی۔

جس وقت سردار جعفر خان اپنے امراء کے ہمراہ مہاراجہ کے دربار میں آیا تھا تو اس کے خاندان کا پرانا حریف ملک خان محمد خان ٹوانہ اور سردار فتح خان بلوچ رئیس ساہیوال بھی موجود تھے۔ جو حسب رواج ہاتھ ملانے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ سردار جعفر خان نے ملک خان محمد خان کو معمولی اشارہ ابرو سے سلام کا جواب دیا۔ مگر سردار فتح خان رئیس ساہیوال کو جوش محبت سے گلے

لگا کر ملا چونکہ راجہ کو ان دونوں سرداروں کی کدورت کا علم تھا۔ اس لئے اسے سردار جعفر خان کا یہ انداز بڑا پسند آیا اور کہا کہ یہ سردار غیور اور جوانمرد معلوم ہوتا ہے۔

بعد قبولیت تحائف و برخاست دربار مہاراجہ نے کہا جعفر خان! ہمارے ساتھ رہنا! دوسرے روز مہاراجہ نے خوشاب پر قبضہ کر کے اس پر اپنا قلعہ دار مقرر کیا اور خود جھنگ کی جانب روانہ ہوا۔ سردار جعفر خان نے بھی جھنگ تک راجہ کی مشائعت کی اور پھر خوشاب واپس آ کر اپنا مال و اسباب اور اہل و عیال ہمراہ لے کر پہاڑ کی جانب چلا گیا۔ جہاں اس نے ایک مضبوط قلعہ اور شاہی محلات تعمیر کر رکھے تھے۔ بایں ہمہ سردار جعفر خان اس صدمے کی تاب نہ لا سکا اور چند ماہ بعد عالم فانی سے عالم باقی کو انتقال کر گیا۔ سردار جعفر خان نے صلح کے وقت جو تلوار پیش کی تھی۔ راجہ نے اسے اپنے اسلحہ خانہ میں آویزاں کرا دیا تھا۔ اب یہ تاریخی تلوار لاہور کے عجائب گھر میں موجود ہے اور اس پر ''جعفر بلوچ'' کندہ ہے۔

سردار جعفر خان کے انتقال پر خاندان کے مسّن بزرگوں نے سردار کی دستار سردار سہراب خان کے سر پر رکھی کیونکہ مرحوم کی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ سہراب خان کو خالصہ ربار سے موضع قادر پور (داخلی علاقہ احمد پور) بطور جاگیر عطا ہوا۔ سردار صاحب کا ۱۸۱۸ء میں انتقال ہو گیا۔

سردار اللہ جوایا خان

سردار اللہ جوایا خان والد مرحوم کی وفات کے چھ ماہ بعد تولد ہوئے۔ خالصہ دربار کو چونکہ خاص خوشاب اور خیر پور سے مالیہ وصول کرنے میں دقت ہوتی تھی۔ اس لئے جاگیر قادر پور واپس کر لی اور اس کی جگہ خوشاب اور موضع خیر پور سے معقول اراضی تبادلے میں دی گئی۔ خوشاب کے مالیہ کا ایک چوتھائی حصہ ۶۰۰ مالیہ خاص چھ سو روپے نقد اور یکصد من نمک سالانہ دینے کی منظوری اس کے علاوہ تھی سردار تا سنِ بلوغ انہی عطیات پر گزر اوقات کرتے رہے۔ انگریزی

دور میں حسن خدمات کے عوض ۳۳ مواضعات کی مزید اراضی مرحمت ہوئی۔ جس سے آپ کی آمدنی بڑھ گئی۔ اسی زمانے میں دریائے جہلم نے انگڑائی لی اور خوشاب کو بہا کر لے گیا۔ مسٹر ڈیوس نے ۱۸۶۵ء میں اسے از سر نو تعمیر کیا۔ سڑکیں اور دروازہ ہائے کلاں پختہ بنوائے اور قلعہ نما تحصیل بھی تعمیر کرائی۔ سردار اللہ جوایا خان کا ۱۸۸۷ء میں انتقال ہو گیا۔

سردار بہادر خان

گورنمنٹ برطانیہ نے سردار کے بڑے صاحبزادے بہادر خان کو بروئے درجہ بندی اوّل درجہ کا انعام اور دیگر اعزازات نمبرداری، حلقہ داری، درباری کرسی اور خطاب سرداری سے سرفراز کیا۔ ان کے چھوٹے بھائی فتح خان فوج میں لیئے گئے۔ جہاں انہوں نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ جون ۱۹۰۹ء میں سردار بہادر خان کو آنریری مجسٹریٹی عطا ہوئی۔ آپ ہمیشہ میونسپلٹی کے صدر منتخب ہوتے رہے۔ اہل خوشاب سے اولاد کی طرح پیار کرتے تھے۔ جنگ عظیم کے دوران جب بھرتی کا حکم آیا تو آپ نے اپنی جیب سے اٹھارہ ہزار روپے نقد ادا کر دیئے۔ مگر شہر سے بھرتی کرنے کی اجازت نہ دی۔ سردار بہادر خان اور سردار فتح خان دونوں کا آپس میں بڑا پیار تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے اور لوگ ان کے پیار و محبت کو دیکھ کر رشک کرتے تھے۔ دونوں بھائیوں کو نہر جہلم پر بصیغہ سفید پوشاں ۱۲ مربعہ جات اراضی ملے ہوئے تھے جن کو انہوں نے شبانہ روز کی محنت سے آباد کر لیا تھا۔ سردار بہادر خان ایک فرزند محمد امیر خان یادگار چھوڑ کر راہگرائے عالم جاودانی ہوئے۔

سردار محمد امیر خان: سردار محمد امیر خان بھی اپنے دور کے ایک زبردست اور بارعب انسان تھے۔ والد ماجد کی جگہ میونسپلٹی کے صدر اور آنریری مجسٹریٹ رہے۔ عوام انہیں دل سے چاہتے تھے اور یہ بھی ان کے لئے آئیہ رحمت بنے ہوئے تھے۔

سردار محمد الطاف علی خان: سردار محمد امیر خان کے بعد سردار محمد الطاف خان اپنی قوم اور خاندان کے سربراہ مقرر ہوئے والد ماجد کے تمام اعزازات انہیں عطا ہوئے اور انہوں نے زندگی بھر اپنے طرزِ عمل سے کسی کو شکایات کا موقع نہ دیا۔ امن پسند اور مرنجان مرنج طبیعت پائی تھی جو بھی کوئی مقصد لے کر آتا باغ و بہار ہو کر لوٹتا!۔

سردار محمد جھانگیر خان:اس وقت خوانین خوشاب کے سربراہ سردار محمد جہانگیر خان ہیں نوجوان اور خوبرو انسان ہیں۔ بے حد خلیق،ملنسار اور ہمدرد واقع ہوئے ہیں۔ روزانہ اپنے بزرگوں کو مسند پر اجلاس کرتے اور عوام کی مشکلات حل کرتے ہیں۔ خداوند پاک نے بڑی آرزوؤں اور دعاؤں کے بعد آپ کو فرزند عطا کیا جس کا نام آپ نے اپنے بزرگوں کی نسبت سے جعفر خان رکھا۔

اعزاء واقارب: سردار محمد جہانگیر خان کا مختصر خاندان ہے۔ سردار فتح خان بن سردار اللہ جوایا خان کی اولاد میں سردار تاج محمد خان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ ادبی شخصیت کے مالک ہیں۔ روحانی طور پر ویسے تو یہ سارا خاندان گولڑہ دربار عالیہ غوثیہ سے وابستہ ہے۔ مگر سردار تاج محمد خان اپنے مرشد اور مرشدزادوں کے عاشق زار ہیں۔ دوسرے نوجوان امراء کی طرح آپ کا وقت لہو ولعب میں بسر نہیں ہوتا بلکہ آپ اپنے خاندان کے واجب الاحترام سردار محمد جہانگیر خان کے دست راست بن کر ہر کام میں ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اپنی قوم سے آپ کو بے پناہ محبت ہے۔ کتب بینی آپ کا محبوب مشغلہ ہے۔ ان کے علاوہ سردار محمد نواز خان اور سردار محمد ممتاز خان بھی اپنے خاندان میں خاصے مقبول ہیں۔

خوشاب کے خوانین میں سردار محمد حنیف خان بھی خاصا مقام رکھتے ہیں آپ کو سردار محمد جہانگیر خان سے بڑی محبت ہے۔ وہ بھی ہر معاملے میں ان سے مشورہ لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ خدا نے آپ کو چار صاحبزادے مرحمت کئے ہیں۔ جن میں سے محمد سرور حیات خان نائب تحصیلدار

ہیں۔ دوسرے سکندر حیات خان زمینداری میں والد بزرگوار کا ہاتھ بٹاتے ہیں جبکہ خضر حیات خان وظفر حیات خان تعلیم پا رہے ہیں۔

شجرہ نسب سردار محمد حنیف خان

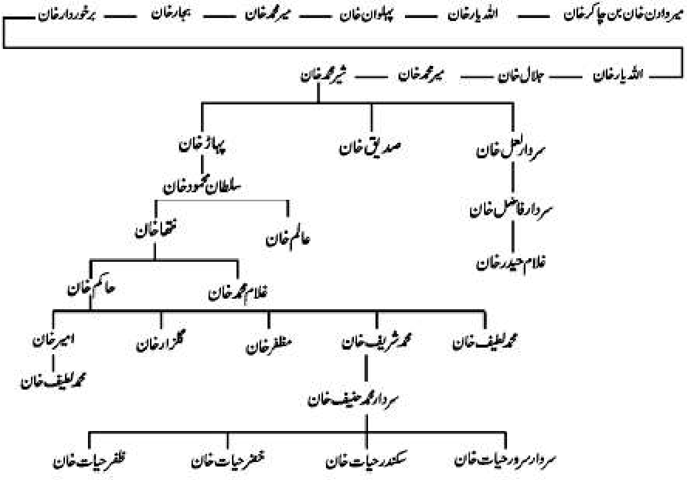

شجرہ نسب سرداران خوشاب

۲۸ جنوری ۱۸۸۴ء کو غلام محمد نساب ولد حسن ولد نور سکنہ ست گھرہ میر پور رندان خوشاب آیا اور غلام محمد خان بلوچ نے اس سے یہ شجرہ سن کر قلم بند کیا!

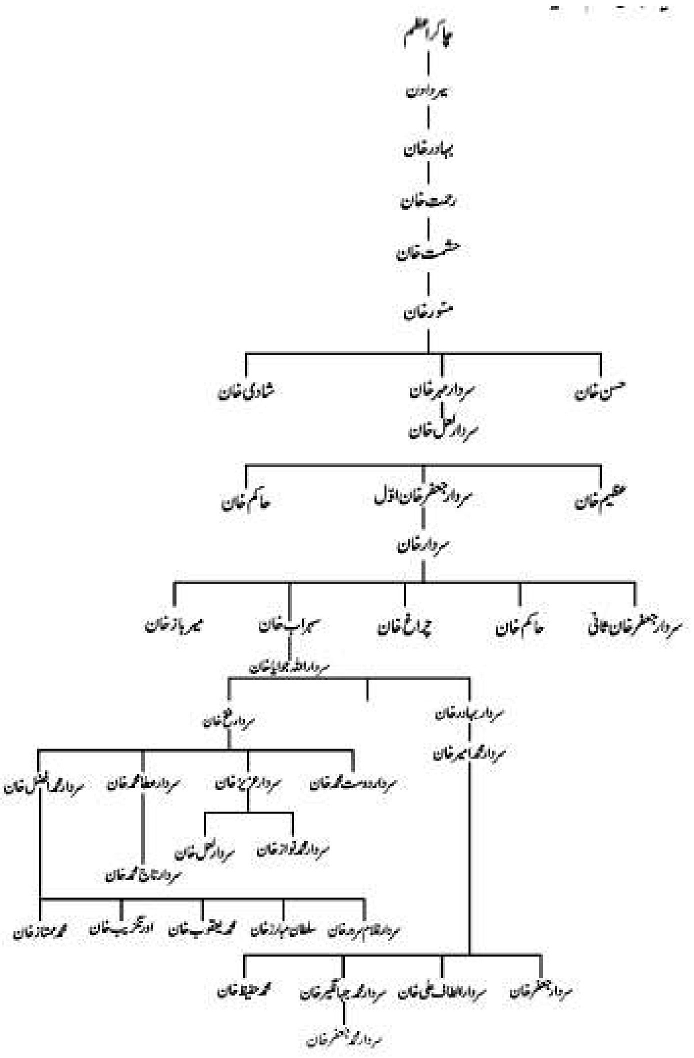

فرخ نگر

جب شہر کا سنگ بنیاد رکھنے کا وقت آیا تو نواب فوجدار خان نے فرمایا کہ اس شہر کا سنگ بنیاد وہ شخص رکھے گا جس نے عمر بھر غیر عورت کو نظر بد سے نہ دیکھا ہو اور نہ ہی تہجد کی نماز قضا کی ہو۔اس بھرے مجمع میں ہزاروں علماء اور مشائخ موجود تھے۔مگر سب چپ بیٹھے رہے جب کوئی آدمی آگے نہ بڑھا تو انجام کار خود نواب فوجدار خان یہ کہتے ہوئے کھڑے ہو گئے کہ خداوند عالم کے فضل و کرم سے یہ عاجز ان شرائط کو پورا کرتا ہے اور پتھر اٹھا کر نیو میں رکھ دیا!

نقشہ بلدیہ فرخ نگر

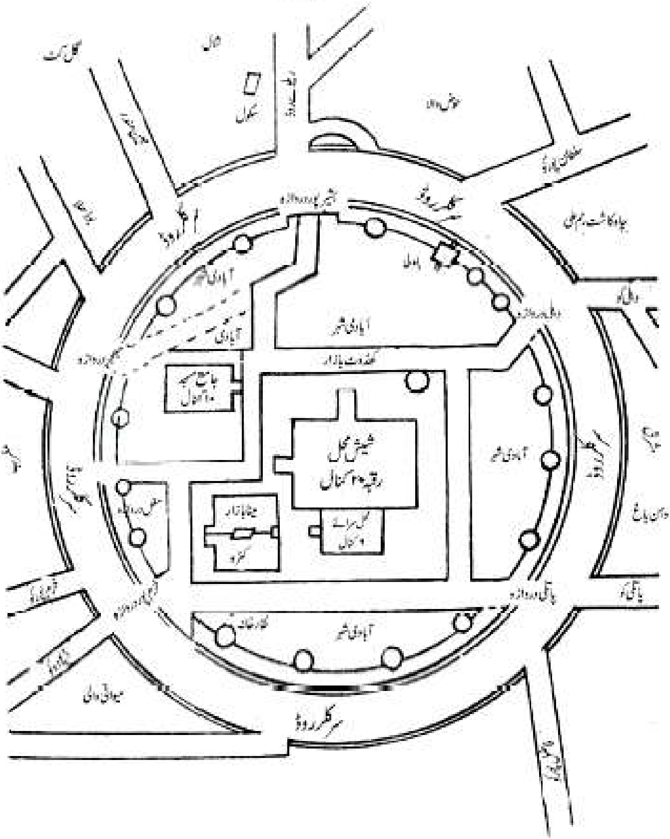

میر دادن خان کے بعد ملک رنگا، ملک سہو، ملک میرن تین بلوچ سرداروں نے اپنے لیل و نہار مغلوں کے سایہ میں بسر کئے۔ چونکہ انکا ہمہ وقت لڑائیوں میں گزرا۔اس لئے مغل دور کی تاریخوں میں ان کا ذکر بہت کم آتا ہے۔البتہ ان کے قلعے،ان کی گڑھیاں، محلے،حویلیاں اور مقبرے زبان حال سے ان کی شوکت رفتہ کا پتہ دینے کو اب بھی موجود ہیں۔میر دادن کی اولاد میں چوتھے نمبر پر سردار دولت خان کا نام آتا ہے یہ اورنگزیبی دور کے بہادر جرنیل تھے اور جو خاندان آگرہ میں آباد تھا اس کے سربراہ تھے۔ انہوں نے اپنے دو صاحبزادوں محمود خان اور علی خان کی شادیاں دہلی کے نواحی قصبے خورم پور میں کیں۔ یہ مقام ان خانزادوں کو اتنا پسند آیا کہ مستقل طور پر یہیں آباد ہو گئے سردار محمود خان کے پوتے نواب دلیل خان بڑے بہادر اور مدبر انسان تھے۔ انہوں نے ابتداءً عامل پرگنہ دادرمی کے ہاں ملازمت کی اور اپنے فرائض اتنی عمدگی اور جانفشانی سے انجام دیئے کہ وہ خوش ہو گیا اور ایک موقع پر اس نے شہنشاہ فرخ سیر سے ان کی سفارش کی جس پر بارگاہ سلطانی سے انہیں امتحانا خرم پور اور اس کے ملحقات کی حکومت اور نواب فوجدار خان کا خطاب عنایت ہوا۔

جھیل گل کٹ

خرم پور سے ڈیڑھ میل مشرق کی جانب ایک جھیل واقع تھی۔اس کے گردوپیش میں اس قدر گھنا جنگل تھا کہ قزاق اور راہزن دن دہاڑے مسافروں کو لوٹ مار کر اس میں چھپ جاتے تھے اور پھر ان کا سراغ تک نہ ملتا تھا۔اس لئے یہ مقام گل گٹ کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔نواب دلیل خان نے راہزنوں اور قزاقوں کا صفایا کرنے کے لئے جھیل گل کٹ کے کنارے خانہ گلی تعمیر کرایا

اور اس میں مستقل طور پر رہائش رکھ لی اور شب و روز اپنے رفیقوں اور جانبازوں کو ہمراہ لے کر جنگل میں گشت کرنا شروع کیا۔ ایک روز اتفاق سے شاہ دہلی کے خزانچی سیتا رام کی زنانہ سواریاں دہلی جا رہی تھیں۔ جب ان کا گزر اس جنگل سے ہوا تو غارت گروں نے انہیں گھیر لیا۔ نواب دلیل خان کو بروقت پتہ چل گیا۔ وہ اپنے بہادر رفیقوں کو ہمراہ لے کر موقع پر پہنچے معمولی جھڑپ کے بعد ڈاکو بھاگ نکلے اور سیتا رام کے اہل و عیال کو بحفاظت تمام دہلی پہنچا دیا گیا۔

سیتا رام کے بیٹوں دیوی دت اور گنگا سہائے نے فرخ سیر کی خدمت میں نواب دلیل خان کی کوشش اور جانفشانی کا ذکر کیا جس پر بادشاہ نے انہیں ۱۱۲۷ھ میں خرم پور اور اس کے مضافات کی فوجداری پر مستقل کر دیا اور انہیں اجازت ملی کہ جھیل گل کٹ کے مقام پر شہر آباد کر کے غارت گروں اور قزاقوں کا قلع قمع کرے۔

فرخ نگر کی تعمیر

نواب فوجدار خان نے ۱۱۴۵ء میں دہلی سے بتیس میل جنوب میں جھیل گل کٹ کے کنارے ایک شہر کا سنگ بنیاد رکھا۔ جس کا نام فرخ سیر شہنشاہ کے نام پر ''فرخ نگر'' تجویز ہوا۔

کہتے ہیں کہ جب شہر کا سنگ بنیاد رکھنے کا وقت آیا تو نواب فوجدار خان نے فرمایا کہ اس شہر کا سنگ بنیاد وہ شخص رکھے گا جس نے عمر بھر غیر عورت کو نظر بد سے نہ دیکھا ہو اور نہ ہی تہجد کی نماز قضا کی ہو۔ اس بھرے مجمع میں ہزاروں علماء اور مشائخ موجود تھے۔ مگر سب چپ بیٹھے رہے جب کوئی آدمی آگے نہ بڑھا تو انجام کار خود نواب صاحب یہ کہتے ہوئے کھڑے ہو گئے کہ خداوند عالم کے فضل و کرم سے یہ عاجز ان شرائط کو پورا کرتا ہے اور پتھر اٹھا کر نیو میں رکھ دیا!

نواب نے شہر میں حرم سرا۔ دیوان عام۔ دیوان خاص کے بعد ایک نہایت عظیم الشان مسجد تعمیر کی کتبہ تاریخ جو اس کی پیشانی پر مرقوم ہے، درج ذیل ہے:

خوش بعہد شہ محمد شاہ که جہاں زدست شاد دآباداں

ساختہ فوجدار خان مسجد ہست ہمچو کعبہ نور فشاں

حوض پاکش کہ روشن و صاف است مے دہد از کوثر بہشت نشاں

ہاتفے گفت ساں تاریخش

مسجدے نور حق درو تاباں

۱۱۴۵ھ

شہر کے گردا گرد پتھر اور چونے سے فصیل تعمیر ہوئی ۔ درمیان میں زبردست ریت بھری گئی تا کہ گولہ بارود سے شہر کو کوئی گزند نہ پہنچے ۔شہر پناہ کا عرض اتنا تھا کہ دو تین سوار بیک وقت شانہ بشانہ اس پر سے گزر سکتے تھے ۔ بڑی توپ کو آسانی کے ساتھ ایک طرف سے دوسری طرف لے جایا جاسکتا تھا۔ شہر سے باہر جانے کے لئے فصیل کے پانچ دروازے تھے ۔جھجر دروازہ، پاتلی دروازہ، خرم پور دروازہ، دلی دروازہ اور بشیر پور دروازہ ۔ دروازے کافی بلند و بالا اور کشادہ تھے ۔ کواڑ جو دروازوں پر لگے ہوئے تھے ۔ نہایت مضبوط تھے ۔ ان کی بیرونی سطح آہنی تھی ۔جس پر چھ سات انچ چوڑی اور ایک انچ دبنیر سلاخیں لگی ہوئی تھیں ۔ نیز دروازوں پر چھ انچ لمبی اور ایک انچ نصف قطر کی میخیں پیوست تھیں تا کہ دشمن ان دروازوں کو ہاتھیوں کی مدد سے بھی نہ توڑ سکیں ۔ چونکہ زیادہ خطرہ ریاست جھجر کی طرف سے ہوسکتا تھا اس لئے جھجر دروازہ میں متعدد تہہ خانے اور سرداب بنائے گئے ۔ جہاں ہر وقت بہادر سپاہیوں کے دستے موجود رہتے تھے ۔قلعہ کے اوپر باقاعدہ چوکیاں تھیں جہاں چوبیس گھنٹے پہرہ رہتا تھا۔ ہر دروازے پر توپ نصب تھی ۔ الغرض بلوچ دنیا کا یہ عظیم تاریخی شہر ۱۱۵۰ھ میں مکمل ہوا۔ قلعے کا تاریخی مادہ کسی نے خوب برمحل نکالا ہے ۔ ’’قلعہ فوجدار خان‘‘ چنانچہ شرقی دروازے پر یہ کتبہ مرقوم ہے ۔ اگر چہ شہر کا نام محض شہنشاہ فرخ سیر کی نسبت سے ’’فرخ نگر‘‘ رکھا گیا تھا لیکن خوبی یہ ہے کہ اس نام سے

بھی ''۱۱۵۰'' کے اعداد برآمد ہوتے ہیں جو کہ اس شہر کی تاریخ تعمیر ہے۔ جب شہر اور محلات بن کر تیار ہو گئے تو نواب صاحب نے اپنے عیال واطفال کو خرم پور سے لا کر ان میں آباد کیا اور انتظام ریاست میں مصروف ہوئے۔ نواب نے مواضعات سیواڑی، کوتانی، خالق پور، جھانجھڑولہ، کھٹاولی، فاضل پور، کالیاں داس، ڈومان، کرولہ، پاتلی، جڑاؤں اور کاہڑی وغیرہ کو جو ویران اور بے چراغ پڑے تھے اپنی کوشش سے آباد کیا اور حقیت زمینداری ان کی خود حاصل کی۔ بھابڑودہ، پھراور، ہمایوں پور، کھرہٹی، کارولہ، سانپلا اور اسماعیل پور کی زمینداری نواب کے بیٹوں اور پوتوں نے خرید کی۔

نواب فوجدار خان کے چھ صاحبزادے تھے اور وہ بڑے خوبرو اور بہادر تھے۔ نوابزادہ کامدار خان ان سب میں بڑے اور اٹک کے حاکم تھے۔ جب نادر شاہ نے دہلی کا رخ کیا تو نوابزادہ نے دہلی دربار کو اطلاع کی۔ مگر یہاں سے کوئی جواب نہ ملا۔ پھر انہوں نے والد بزرگوار نواب فوجدار خان کو لکھا کہ نادر شاہ آرہا ہے۔ آپ محتاط رہیں۔ الغرض نادر شاہ گرجتا برستا دہلی میں داخل ہوا اور لال قلعہ میں دربار منعقد کیا۔ دونوں بادشاہوں نے بیک وقت جلوس کیا۔ نادر شاہ کے چہرے پر نقاب تھا۔ امراء باری باری سلام کو حاضر ہوئے۔ جب نواب فوجدار خان کا نمبر آیا۔ یہ آگے بڑھے اور محمد شاہ کو سلام کیا لیکن نادر شاہ کو سلام نہ کیا۔ اس پر پُرسش ہوئی۔ نواب صاحب نے عرض کی کہ مجھے کیا معلوم کہ نقاب کے اندر مرد ہے یا عورت! سپاہی کا کام مرد کو سلام کرنا ہے! نادر شاہ نے کہا کہ ہمارے چہرے کا جلال اتنا ہے کہ کوئی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے اس لئے نقاب ڈال رکھا ہے۔ نواب صاحب نے کہا کہ سپاہی کسی کے جلال سے اثر قبول نہیں کرتا۔ نادر شاہ نے نقاب الٹ دیا۔ جس پر نواب صاحب نے سلام کیا۔ اس کے بعد نادر شاہ نے امراء سے قرآن پاک پر اطاعت کے دستخط لئے مگر نواب فوجدار خان نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور عرض کیا کہ:

''میرے پاس صرف ایک سر تھا جو محمد شاہ کو دے چکا۔ دوسرا نہیں جو آپ کی نذر کروں۔ اگر ضرورت پڑی تو میدان میں یہ سر محمد شاہ کے لئے ہی قربان کر دوں گا!''

نادر شااس جواب سے بڑا خوش ہوااوراس نے کہا کہ تمام دربار میں مجھے صرف ایک سپاہی ملا ہےاور دستخطوں کے لئے اصرار نہ کیا۔

نواب فوجدار خان کا ۱۱۶۱ھ بموجب ۱۷۴۷ء انتقال ہوا۔ انہیں بڑے اعزاز کے ساتھ دہلی دروازے کے باہر دفن کیا گیا۔ ان کی سادہ قبر اب تک جوں کی توں موجود ہے۔ اوران کی بے پناہ مقبولیت اس پر پہرہ دے رہی ہے۔ نواب صاحب بڑے دیندار حکمران تھے۔ فرخ نگر کی تعمیر کے سلسلے میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اتنے بڑے شہ زور، خوبرواور صاحب اقتدار ہونے کے باوجود عمر بھر نہ انہوں نے زنا کیااور نہ ان سے تہجد کی نماز قضا ہوئی۔

نواب کامگار خان

نواب فوجدار خان کے (نواب فوجدار خان علیہ الرحمتہ کی یادگاروں میں سے کمر بند اور نیم آستین ان کے خاندان میں انتقال آبادی تک محفوظ تھے اور کمر بند کی یہ خاصیت تھی کہ اگر اس کا کونہ بھگو کر پانی زچہ کو پلا دیتے تو زچگی کی تکلیف رفع ہو جاتی۔ نیم آستین جو بوقت جنگ زرّہ کی بجائے پہنتے تھے اس پر مکمل قرآن شریف مرقوم تھا۔ نواب محمد سردار علی خان چاکرانی اسے اپنے ہمراہ پاکستان لے آئے تھے۔ مگر شجاع آباد میں جب ان کے ہاں چوری ہوئی تو وہ بھی مال مسروقہ میں چلی گئی۔) انتقال پر ان کے بڑے صاحبزادے نواب کامگار خان مسند نشین ہوئے۔ تقریباً گیارہ برس انہوں نے بڑے جاہ وجلال سے حکمرانی کی۔ میر مرتضی خان کے زمانے میں پرگنہ جھجر کے کچھ حصے فرخ نگر میں شامل تھے۔ لیکن ۱۱۶۷ھ میں نواب صاحب نے سالم پرگنہ پر قبضہ کر لیا۔

نواب کامگار خان کے زمانے میں ریاست فرخ نگر کو بڑا فروغ ملا۔ جو علاقے اب تک

باغی چلے آرہے تھے وہ نواب کے دبدبہ، سطوت اور صولت کو دیکھ کر مطیع و منقاد ہو گئے اور جن امراء نے سرکشی اختیار کی انہیں تلوار کے زور سے مطیع کیا۔ عالمگیر ثانی کے عہد میں قطب الدین روہیلے نے قصبہ گوہانہ پر قبضہ کر کے جنید، ہانسی اور حصار تک اپنی ریاست قائم کرلی تھی۔ نواب کامگار خان نے نہر بھسوان خورد کے کنارے شدید جنگ کے بعد قطب شاہ کو بھگا دیا۔ ادھر سے فارغ ہو کر نواب صاحب نے دلجمعی کے ساتھ ریاست کے اندرونی انتظام کی طرف توجہ کی۔ اپنے ذاتی خزانے سے اکثر گڑھیاں اور چاہات بنوائے اور زمینداروں کو تقاوی کی رقم عنایت ہوئی۔ لوگوں کو معافیات اور وظائف عطا کئے۔

نواب کامگار خان کے متعلقین میں سے بہادر خان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ دوسرے معتمد ان کے بھتیجے سردار حسن علی خان ولد دلدار علی خان تھے۔ انہیں نواب صاحب نے جھجر کی حکومت تفویض کر رکھی تھی۔ جس کا انہوں نے خاطر خواہ انتظام کیا۔ نواب کامگار خان کے ایک عزیز مرزا خان ولد لشکری خان تھے۔ یہ بھی سات آٹھ سال تک جھجر کی گورنری پر مامور رہے۔ رعایا ان کے انتظام اور سلوک سے بڑی خوش تھی۔

نواب موسیٰ خان

۱۱۷۱ھ مطابق ۱۷۶۰ء نواب کامگار خان کا انتقال ہو گیا اور نواب موسیٰ خان مسند نشین ہوئے۔ ان دنوں دہلی کی سلطنت کمزور ہو چکی تھی۔ چونکہ فرخ نگر کی ریاست دارالخلافہ کی بغل میں واقع تھی۔ اس لئے دارالسلطنت کے وقائع اور حوادثات کا اس پر براہ راست اثر پڑتا تھا۔ جب بھی مرہٹے اور روہیلے دہلی پر حملہ کرتے۔ فرخ نگر کی ریاست میدان جنگ بن جاتی اور فرخ نگر کے نواب کو ہر حالت میں دہلی کے تاج کا ساتھ دینا پڑتا تھا لیکن جب امرائے سلطنت اور شاہ دہلی کے مابین نزاع برپا ہوتا تو ان کی پوزیشن بے حد نازک ہو جاتی تھی۔ ایسے حالات میں بلوچ حکمران کو دونوں کی نیاز

مندی کرنا پڑتی تھی۔ چنانچہ جب شہزادہ علی گوہر دہلی سے بھاگ کر فرخ نگر پہنچا تو نواب موسیٰ خان نے تین لاکھ روپے بطور پیشکش نذر کئے۔

سورج مل کا خروج

ان حالات میں جبکہ ہر امیر تخت شاہی کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ سورج مل جاٹ کے دل میں بھی ہوس کا ناگ جھوم اٹھا۔ چنانچہ اوّل اس نے بسازش قلعہ دارا اکبر آباد آگرہ کے قلعے پر قبضہ کیا اور تمام سامان یہاں تک کہ سنگ مرمر کی بہترین چیزیں بھی بھرت پور اٹھا لے گئے اور پھر کھڑک سنگھ کے مشورہ سے اس نے اپنے بڑے بیٹے جواہر سنگھ کو فرخ نگر کی مہم پر روانہ کیا جواہر سنگھ نے پہلے موضع گھاسڑہ کو فتح کیا اور اس کے بعد فرخ نگر کی مہم پر روانہ کیا۔ نواب موسیٰ خان نے انتہائی بہادری سے اس سیل بلا کا مقابلہ کیا اور جاٹوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ جب جواہر سنگھ کو کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو اس نے نواب کے وکیل دیوان جادون رائے کے ساتھ ساز باز کی دونوں لشکروں میں صلح کی طرح ڈالی گئی اور نواب موسیٰ خان کی ملاقات جواہر سنگھ کے خیمہ میں مقرر ہوئی۔ اگرچہ نواب کے اعزاء واقارب مانع ہوئے لیکن دیوان کی مکاری اور عیاری نے ان کی کچھ نہ چلنے دی اور سادہ لوح بلوچ چند رفیقوں کے ہمراہ بے تکلف جاٹوں کے لشکر میں چلا گیا۔ جواہر سنگھ کے آدمی پہلے سے اس موقع کی تاک میں تھے۔ نواب کا خیمہ میں داخل ہونا تھا کہ جاٹ سپاہیوں نے لپک کر گرفتار کر لیا۔

تاریخ جھجر کا بیان ہے کہ نواب کے ساتھ مفصلہ ذیل اشخاص گرفتار کئے گئے تھے۔ الٰہی بخش خان، انور علی خان، مرزا خان (اقارب) بولے خان (چنوری بردار) لاہیا (داروغہ توشک خانہ) عاقل خان افغان (جھجر) غریب داس (پیادہ) مان سنگھ (چودھری باولی) نواب صاحب کو رفیقوں کے ہمراہ قلعہ ڈیک میں قید کر دیا گیا اور اس کے بعد آگے بڑھ کر جواہر سنگھ نے

فرخ نگر اور تمام ریاست پر قبضہ کرلیا۔جن امراء نے اطاعت سے انحراف کیا۔ انہیں سخت سزائیں دیں اور ان کے محلات اور کارخانہ جات کو لوٹ لیا۔موضع چھارا اور جھجر کو سخت نقصان پہنچایا اور جہاں جہاں بلوچوں کی گڑھیاں بنی ہوئی تھیں جیسے کھر، ہٹی، چھپارا اور بابرہ، فصیلیں گرا کر انہیں غیر محفوظ بنا دیا۔

نواب موسیٰ خان کی رہائی

تقریباً گیارہ سال بعد ۱۱۶۸ھ میں نواب صاحب جاٹوں کی قید سے رہا ہوئے۔مگر فرخ نگر اب وہ نہیں رہا تھا۔ جہاں چند سال پہلے اُن کا طوطی بولتا تھا۔ وہاں اب جاٹوں کا عمل دخل تھا۔ نواب صاحب غریبانہ وضع قطع میں اپنی ریاست سے گزر کر بہادر گڑھ پہنچے اور یہاں سے موضع اسماعیلیہ پرگنہ سانپلہ میں جہاں بلوچ آباد تھے۔تشریف لے گئے اور ان سے ریاست کی بازیابی کے لئے امداد طلب کی۔ چونکہ نواب موسیٰ خان کا دینی مرتبہ بہت بلند تھا۔اس لئے جہاں مسلمان امراء کو انکی پریشانیوں پر قلق ہوا وہاں شمس الاولیاء عمدۃ الاتقیار، اس العلماء حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمتہ جیسی عظیم روحانی شخصیت نے بھی شدت سے محسوس کیا۔ چونکہ نواب صاحب کو یہ دن دیوان جادون رائے وکیل کی وجہ سے دیکھنا پڑا تھا۔اس لئے حضرت نے جہاں مسلمان امراء کو تنبیہ فرمائی کہ وہ ہنود کو اپنے کاروبار میں دخیل نہ ہونے دیں۔ وہاں انہوں نے نواب موسیٰ خان کی امداد کے لئے پرزور سفارش بھی فرمائی۔آپ نے ایک خط نواب تاج محمد خان کو اس مضمون کا لکھا تھا جو ریاست بہادر گڑھ کے ضمن میں بجنسہ درج ہے۔

شاہ ولی اللہ جیسے بزرگوں کی دعاؤں اور ان کے بروقت مخلصانہ مشوروں کی برکت سے نواب موسیٰ خان کے پاس ڈیڑھ ہزار جنگ آزما مجاہد جمع ہو گئے لیکن اتنی قلیل جمعیت سے (جو توپ و تفنگ سے بھی محروم تھی) صف آراء، ہو کر دشمن سے ٹکرانا مناسب نہ تھا۔اس لئے نواب نے

نہایت دلیری اور دانشمندی سے ایک رات موضع جانڈری عرف باقر گڑھ پر جو فرخ نگر سے آٹھ کوس کے فاصلے پر تھا۔ شب خون مارا۔ جاٹوں کی فوج کا اکثر حصہ قتل ہو گیا اور باقی سپاہی فرخ نگر کو بھاگ گئے۔ نواب کو یہاں کافی سامان جنگ ہاتھ آیا۔ جس سے انہوں نے اپنی فوج کو مضبوط بنا کر فرخ نگر کا رخ کیا اور شباشب پہنچ کر توپیں قلعہ پر چڑھا دیں اور لڑنا شروع کر دیا۔ دیوان خوشحال رائے نائب رئیس بھرت پور جوان دنوں فرخ نگر کا حاکم تھا۔ اس پر نواب کا کچھ ایسا رعب چھایا کہ وہ قلعہ خالی کر کے بھاگ گیا۔ نواب موسیٰ خان فتح کا نقارہ بجاتا ہوا قلعے میں داخل ہوا۔ سبحان اللہ! قادر مطلق کی قدرت کاملہ بھی عجیب ہے۔ نہ اسے بناتے دیر لگتی ہے اور نہ بگاڑتے۔ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِ شَیٍ قَدِیر۔

نواب موسیٰ خان نے فرخ نگر اور اس کے مضافات پر تسلط جمانے کے بعد مرزا نجف خان وزیر و مدار المہام سلطنت کو تمام صورت حال تحریر کی۔ جس سے ریاست فرخ نگر اور اس کے گرد و پیش کے دیہات میں ان کی سرداری کی تجدید ہوئی لیکن عملداری میں کچھ زیادہ توسیع نہ ہو سکی۔

نواب موسیٰ خان نواب بن نواب ہونے کے باوجود بڑے حلیم الطبع انسان تھے۔ ایک دفعہ ان کا کوئی لڑکا ان سے بگڑ کر کسی طرف چلا گیا۔ آپ نے اسے منانے اور دربار میں لے آنے کے لئے ایک مصاحب قطب خان کو مامور کیا۔ اس نے جواب دیا کہ حضور! وہ بد دماغ لڑکا ہے مجھے گالیاں دے گا۔

فرمایا۔ ”تم بھی اسے گالیاں دینا!“

کہا۔ ”وہ مجھے مارے گا!“

فرمایا۔ ”تم بھی مارنا!“

یہ سن کر قطب خان شہزادے کے پاس گیا اور اسے دربار میں چلنے کے لئے کہا۔ اس نے قطب خان کو گالیاں دیں۔ جواب میں قطب خان نے بھی گالیاں دیں۔ اس کے بعد شہزادہ قطب

خان کو مارنے کے لئے دوڑا،مگراس سے پیشتر کہ وہ اس پر وار کرتا قطب خان نے تلوار کا ایسا بھر پور ہاتھ مارا کااس کا سرتن سے کٹ کر دور جا پڑا اور لاش خاک وخون میں تڑپنے لگی۔

قطب خان اس کا سر لے کر دربار میں حاضر ہوا اور سارا واقعہ حضور میں عرض کیا۔نواب صاحب آخر باپ تھے۔قاتل بیٹے کا سر لئے سامنے کھڑا تھا۔دربار میں کتنے اعزاء واقارب موجود ہوں گے۔ان سب کے دلوں پر کیا گزری ہوگی۔مگر کسی نے اُف تک نہ کی۔نواب صاحب نے اتنا کہا کہ قطب خان!اب تم اس شہر سے چلے جاؤ۔ایسا نہ ہو کہ کسی وقت محبت پدری سے مغلوب ہو کر تجھے کوئی نقصان پہنچاؤں العظمتہ للہ!کیا لوگ تھے۔ایسے انسان اب کہاں ملتے ہیں!

نواب موسیٰ خان کے بعد نواب عیسیٰ خان اور ان کے بعد نواب مظفر خان بالترتیب ریاست فرخ نگر کی نوابی پر فائز رہے۔نواب مظفر خان کے انتقال پر مرحوم کے بیٹے یعقوب علی خان اور ان کے بھائی غلام محمد خان میں موافقت نہ ہوسکی۔نوبت یہاں تک پہنچی کہ غلام محمد خان کو دہلی ایجنسی سے دہلی میں قیام کرنے کا حکم ملا اور تیرہ سو روپے ریاست سے ان کا وظیفہ مقرر ہوا۔چند سال بعد عارضہ دنبل نواب یعقوب علی خان کا انتقال ہو گیا۔

نواب احمد علی خان

اپنے بڑے بھائی کے انتقال پر نواب احمد علی خان موروثی مسند کے مالک بنے۔یہ فرخ نگر کے آخری نواب تھے۔اگرچہ دہلی کی سلطنت سمٹ سمٹا کر بارہ بارہ کوس تک محدود رہ گئی تھی لیکن اس کے باوجود نواب صاحب کے اخلاص میں کوئی فرق نہ آیا۔وہ اپنے آباء کرام کی طرح شاہ دہلی کے وفادار چلے آتے تھے۔

ابوالمظفر سراج الدین بہادر شاہ ثانی کے زمانے میں جب ہندوستانیوں نے انگریزی سیاست سے آزاد ہونے کی کوشش کی تو اس میں نواب صاحب نے بھی پورا حصہ لیا تھا۔شاہی

دستے، جو ان کی ریاست سے گزرتے ان کی ہر طرح سے مدد کرتے تھے اور لال قلعہ کی رسدی ضروریات کے بھی کافی حد تک کفیل تھے۔

جنگ آزادی

ریواڑی کے راجہ راؤ تلارام نے ان ایام میں تمام سرداروں سے اپیل کی کہ بدیشی حکمرانوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کے لئے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح متحد ہو جائیں۔ نواب احمد علی خان، نواب جھجر اور راجہ بلب گڑھ نے آزادی کی جنگ میں اس کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا۔ مگر چند راجے انگریزوں کی طاقت سے خائف ہو کر اس جدوجہد میں شریک نہ ہوئے۔ ریواڑی کے قریب گھمسان کی جنگ ہوئی۔ جس میں انگریزوں کو شکست ہوئی اور نواب احمد علی خان اور اس کے بلوچ سرداروں نے اس جنگ میں بڑی بہادری کا ثبوت دیا۔ عین اس وقت جبکہ دہلی میں محبان وطن اور انگریزوں کے مابین شدت کی جنگ ہو رہی تھی۔ نواب احمد علی خان آخری مغل تاجدار کے ہمراہ تھے۔ جب امراء دہلی اور شہنشاہ کے نسبتی بھائی مرزا الٰہی بخش کی غداری سے مسلمانوں کو شکست ہوئی اور بہادر شاہ ظفر گرفتار کر لئے گئے تو نواب احمد علی خان بھاگ کر فرخ نگر پہنچے اور انہوں نے اپنی فوج کو ہمراہ لے کر ریواڑی کا رخ کیا اور راؤ تلارام پہلے سے تیار تھا۔ نواب جھجر اور راجہ بلب گڑھ بھی اپنی اپنی فوجیں لے کر آ گئے۔

ریواڑی اور فرخ نگر کے درمیان انگریزوں کے لشکر سے جنگ ہوئی مگر چند ہندوستانی رئیسوں کی غداری سے اتحادیوں کو شکست ہوئی۔ بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ نواب احمد علی خان اور نواب جھجر آخر دم تک لڑتے رہے۔ یہاں تک کہ گرفتار کر لئے گئے۔ انگریزی فوجیں ریواڑی کے علاقے کو روندتی ہوئی فرخ نگر میں داخل ہوئیں اور شہر میں قتل عام کا حکم دے

دیا۔نواب کے ۷۲افراد گرفتار کر لئے گئے (نواب کی ہر دلعزیزی کا اندازہ اس سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ جب انگریزوں نے نواب کے متعلقین کو گرفتار کیا تو ان میں شہر کے کوتوال غضنفر علی خان بھی تھے۔کسی وجہ سے انگریزوں نے انہیں آزاد ہو کر جانے کی اجازت دے دی تھی۔مگر آپ نے انکار کر دیا اور فرمایا میں نواب کا نمک خوار ہوں۔ ہمارا یہ شیوہ نہیں کہ اپنے آقا کا ساتھ چھوڑ دیں۔جو نواب کا حال وہ ہمارا حال۔جس پر انگریزوں نے انہیں قتل کر دیا!) اور انہیں فرخ نگر کے مشرق میں تین چار فرلانگ کے فاصلے پر ایک رو میں کھڑا کر کے باڑھ لگا دی گئی۔ان بہتر (۷۲) لاشوں پر تین دن پہرہ رہا۔اس کے بعد انہیں دفن کرنے کی اجازت ملی۔نواب احمد علی خان اور نواب جھجر کو دہلی لے گئے۔ چند دن لال قلعہ میں قید رہے اور بالآخر پھانسی کا حکم ہوا اور یہ شیر بیشہ شجاعت ہنستا مسکراتا قوم و ملک پر سے تصدق ہو گیا۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقاں پاک طینت را

نواب احمد علی خان مبصرین کی نظر میں!

نواب احمد علی خان، بہادر کی طرح جئے، مجاہد کی طرح لڑتے ہوئے گرفتار ہوئے اور مردانہ وار پھانسی کے تختے پر چڑھ کر قوم اور ملک پر سے تصدق ہو گئے اپنے اس بہادرانہ عمل سے انہوں نے حیات سرمدی حاصل کی اور اپنی قوم کو سرخرو کر گئے۔مگر جنہوں نے اپنی زندگی کو بچانے کے لئے غلامی کا کلک ماتھے پر لگا یا۔انجام کار وہ بھی کیڑوں مکوڑوں کی موت مر گئے۔آج انہیں کوئی جانتا تک نہیں لیکن نواب احمد علی خان کا نام ان کی عدیم النظیر شجاعت کے سبب ہمیشہ زندہ رہے گا۔

کمال الدین حیدر حسنین نے قیصر التواریخ جلد دوم کے صفحہ ۴۵۷ میں نواب کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

''احمد علی خان بہت جری، بہادر اور غیور نواب تھا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں اس نے بہادر شاہ ظفر کی حکومت کا ساتھ دیا اور اس جرم میں پھانسی پائی!''

مرزا غالب کہتے ہیں کہ:۔

''۳۰ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو جمعہ کے روز نواب احمد علی خان والی فرخ نگر کو گرفتار کر کے دہلی لائے اور قلعہ میں ایک جگہ رکھا گیا۔ ۲ نومبر کو بہادر جنگ خان والی بہادر گڑھ کو دہلی لایا گیا اور ان کے لئے بھی قلعہ میں جائے قیام مقرر ہوئی اور مختلف اوقات میں پھانسی دے دی گئی''۔

مولوی عبدالقادر خان جو کہ نواب کا معاصر ہے، اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے کہ:۔

''اس ملک کے پرانے رئیسوں میں فرخ نگر کا نواب ہے جو قوم کا بلوچ ہے۔ پہلے اس کے بزرگوں نے تلوار کے زور سے بہت سے ممالک پر قبضہ کرلیا تھا۔ نواب اسی آبادی اور چند چھوٹے چھوٹے گاؤں کا مالک ہے۔ فرخ نگر کی شہر پناہ خوبصورت ہے اور شہر بھی اچھے قرینے سے آباد ہے''۔ (وقائع عبدالقادر خانی ص ۳۱۹)

نواب غلام محمد خان کا فرار

افراتفری کے اسی عالم میں جبکہ فرخ نگر کے خورد و کلاں گاجر مولی کی طرح کٹ رہے تھے۔ نواب شہید کے چچا غلام محمد خان نے بڑی جراَت کا کام کیا کہ نہ صرف وہ خود بچ نکلے بلکہ اپنے ساتھ خاندان کے چند افراد کو بھی بچا لے گئے۔ ریاست الور میں مینڈ پور کے پہاڑ پر مہاجرین کا یہ مختصر سا قافلہ پناہ گزین ہوا۔ جہاں کچھ دنوں بعد فرخ نگر کے دوسرے لوگ بھی پہنچ گئے اور کافی عرصہ تک

انگریزی دستوں کو پریشان کرتے رہے۔ یہاں سے غلام محمد خان ٹونک پہنچے۔ انگریزی مخبران کے تعاقب میں تھے۔ ان کی رپورٹ پر نواب غلام محمد خان کو گرفتار کر لے گئے۔ دہلی میں ان پر مقدمہ چلا اور انہیں قید کی سزا ہوئی۔ چنانچہ انہیں لاہور جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ لیکن اس پر بھی انگریز کی آتش انتقام فرو نہ ہوئی۔ چنانچہ جب قید و بند کی ساعتیں ختم ہونے کو آئیں تو انہیں زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔

نواب فرخ نگر کے پسماندگان میں چند بیوہ خواتین اور نواب غلام محمد خان کے تین لڑکے نوابزادہ عبدالرحیم خان، نوابزادہ محمد اسماعیل خان اور نوابزادہ غلام احمد خان بچ رہے تھے۔ انگریزی جودوسخا نے ان کی گزر اوقات کے لئے پندرہ بیس روپے کی پنشن کو کافی سمجھا اور ۱۸۶۳ء میں معافی کا اعلان ہونے پر نواب فرخ نگر کے دیگر لواحقین کو بھی رہائش کے لئے چند مکان واگزار ہوئے۔ نوابزادہ غلام احمد خان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے نوابزادہ محمد سردار علی خان نے کلیم کیا مگر بغاوت کی پاداش میں یہ حق منتقل نہ کیا گیا۔

نواب محمد سردار علی خان چاکرانی

نواب محمد سردار علی خان چاکرانی اور ان کے خاندان کے بیشتر افراد تقسیم ہند کے بعد پاکستان ہجرت کر آئے جو اس وقت شجاع آباد ضلع ملتان میں آباد ہیں۔ نواب محمد اسماعیل خان کی اولاد میں سے نوابزادہ محمد سلطان الدین خان، محمد اقبال الدین، محمد ممتاز الدین اور محمد معین الدین حسن خان کراچی میں مقیم ہیں اور محمد سراج الدین خان، عبدالباسط خان و غوث محمد خان کی اولاد امجاد حیدر آباد دکن میں رہ گئی ہے۔

نوابزادہ محمد سردار علی خان ۱۳۱۸ھ میں بمقام فرخ نگر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی۔ دینی تعلیم کی خاطر گنگوہ تشریف لے گئے اور مدرسہ عالیہ قدوسیہ میں داخل ہوئے۔ ۱۹۱۷ء تک وہاں تعلیم پائی۔ پھر سیاسی تحریکوں سے وابستہ ہو گئے۔ شردھانند کی تحریک

شدھی و سنگھٹن سے متاثر ہو کر بہت کام کیا۔ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کی حیات ثانیہ ہوئی تو آپ نے ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے قائداعظم کی قیادت میں اپنی ذمہ داریوں کو کامل تندہی سے انجام دیا۔ فرخ نگر میں آباء کرام کے شاہی محلات میں رہتے تھے۔ مگر شجاع آباد میں معمولی سا مکان بھی نہ مل سکا۔ البتہ کچھ رقبہ مل گیا جس سے گزر اوقات کی معمولی سی سبیل پیدا ہو گئی ہے۔

شجرۂ نسب نوابانِ فرخ نگر

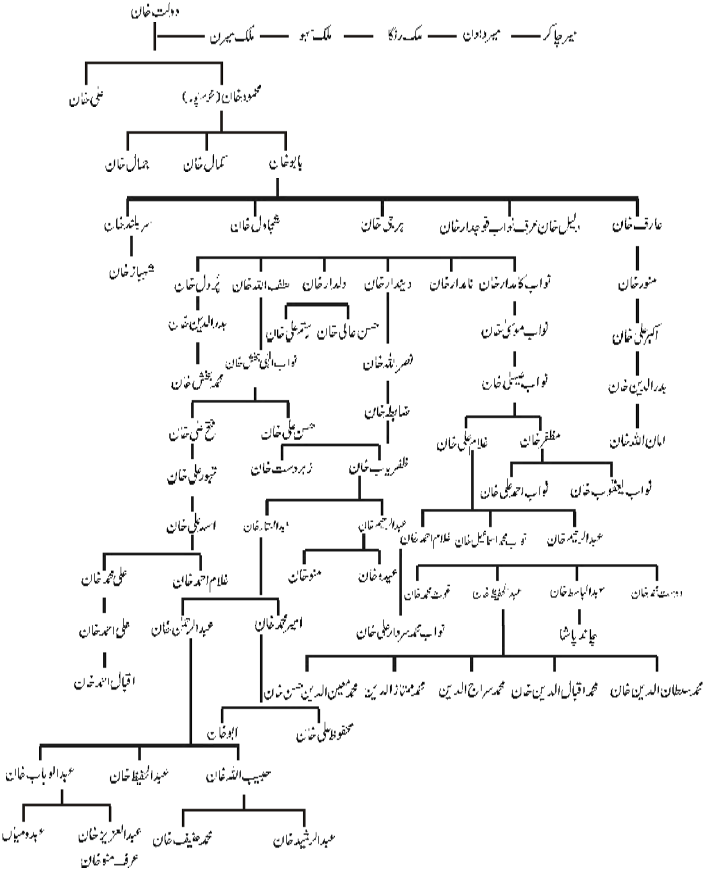

بہادر گڑھ

نوابان فرخ نگر کی طرح بہادر گڑھ کے رئیس بھی
دیکھتے ہی دیکھتے آسمان سیاست پر مہر و ماہ بن کر
چمکنے لگے تھے۔انہوں نے میدان جنگ اور ایوان حکومت میں
ہر جگہ اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے تھے اور آخیر میں
شمع آزادی پر پروانہ وار تصدق ہو کر انہوں نے انسانیت کی
لاج رکھ لی۔آج اگرچہ بہادر جنگ دنیا میں موجود نہیں مگر
بہادر گڑھ زبان حال سے ان کے عدل و داد کی داستانیں سنانے
کو زندہ موجود ہے!

○

نواب کامگار خان والی فرخ نگر کے ملازمین میں سے بہادر خان بلوچ نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے سبب بڑا فروغ حاصل کیا۔ عالمگیر ثانی کے زمانہ میں ترقی کر کے سہارن پور کا فوجدار مقرر ہوا اور جب صفدر جنگ اور احمد شاہ کے درمیان جنگ ہوئی تو عماد الملک نے اسے اپنی مدد پر بلایا۔ اس نے اس جنگ میں اتنے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ ہفت ہزاری کا منصب اور ماہی مراتب کا نشان حاصل کیا۔ عماد الملک کے بعد نجیب الدولہ سے رابطہ پیدا کیا اور ہندوستان کی بساط پر چھا گیا۔

بہادر گڑھ کی تعمیر

دربار دہلی کی طرف سے نواب کامگار کو چند پرگنے عطا ہوئے۔ جس پر آپ نے دہلی سے بارہ کوس بجانب غرب ایک شہر اور قلعہ بنوایا۔ جس میں اپنے اور عزیزوں کے لئے محلات تعمیر کرائے۔ یہ شہر اب تک موجود ہے اور بہادر گڑھ کہلاتا ہے۔

غلام حسین خان طباطبائی لکھتا ہے:۔

"بہادر خان کہ یکے از ملازمان او (نواب کامگار خان) بود۔ درزمان حیاتش عروج نمودہ۔ بمنصب فوجداری سہارنپور فائز گشت درجنگ صفدر جنگ با احمد شاہ عماد الملک اُورا بمدد خود طلبیدہ صحبتش با عماد الملک درگرفت و بمرتبہ امارت ترقی گشتہ ہفتہ ہزاری وصاحب ماہی مراتب گردید۔ بعد عماد الملک با نجیب الدولہ ہم ساخت اوقات مے گزرانید وبدوازدہ کردہے شاہجہان آباد قلعہ وآبادی بنام خود طرح انداختہ محل اقامت خود واتباع گردانید۔ آں مکان بہ بہادر گڑھ مشہور ومعروف گشت"۔

(سیر المتاخرین جلد دوم ص ۹۰۶)

نواب بہادر جنگ نے اپنی ریاست کو اچھی طرح سے آباد کیا اور گردوپیش کے بلوچوں سے تعلقات بے حد خوشگوار رکھے۔ بالخصوص فرخ نگر کے بلوچ سردار کو تو ولی نعمت جانتا تھا۔ دوسرے امراء بھی اس حقیقت سے لاعلم نہیں تھے۔ وہ فرخ نگر اور بہادر گڑھ کو ایک تصویر کے دو رخ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ جب سورج مل جاٹ نے فرخ نگر پر قبضہ کرلیا تو پھر اس نے بہادر گڑھ کا رخ کیا۔ نجیب الدولہ کا زمانہ تھا۔ نواب بہادر جنگ نے اسے غیرت افزا خطوط لکھے اور اپنی مدد آپ کے لئے پکارا لیکن ادھر سے کوئی حوصلہ افزائی نہ ہوئی۔ سورج مل کے پرچہ نویس اسے پل پل کی خبریں پہنچا رہے تھے نجیب الدولہ کے سکوت سے اس نے یہی مطلب اخذ کیا کہ وہ اس کی فوجی طاقت سے متاثر ہے اور اسے چھیڑنا نہیں چاہتا۔ جس پر اس نے بہادر گڑھ کی فوجداری کے لئے درخواست بھجوادی۔ دراصل مسلمان رئیسوں کو یہ پریشانیاں محض اس لئے لاحق ہو رہی تھیں کہ انہوں نے ہندوؤں کو امور مملکت میں شریک کرلیا تھا۔ وہ کھاتے تو مسلم سرکار سے تھے مگر خیر اپنے بھائیوں کی مناتے تھے اور درپردہ وہ مسلم رؤسا کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے۔ بنابریں اس دور کے مفکر اعظم حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے مسلمان رؤسا کو متنبہ کیا کہ وہ ہندوؤں پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیں اور آپس میں اتفاق سے رہیں۔ چونکہ نواب موسیٰ خان ان دنوں ریاست فرخ نگر پر قبضہ کرنے کی فکر میں تھے۔ اس لئے مسلمان رئیسوں کو مشورہ دیا کہ نواب موسیٰ خان کی امداد کریں۔ حضرت نے جو مکتوب بہادر گڑھ کے بلوچ رئیس تاج محمد خان کو لکھا اس کے متن کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے۔ آپ نے تحریر فرمایا:

"عزیز القدر نواب تاج محمد خان محفوظ! محفوظ!! اور بہ نظر عنایت خداوندی ملحوظ!! فقیر ولی اللہ کی جانب سے بعد سلام محبت التزام کے واضح ہو کہ آپ کا مکتوب گرامی جاٹوں کی سرکشی سے متعلق پہنچا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ امید ہے کہ وہ مخالفین کو پامال کردے گا۔ خاطر جمع رکھیں۔ اندریں حالات ضروری ہے کہ ان عزیز القدر موسیٰ خان اور دیگر جماعت مسلمین کیساتھ

اتفاق کریں اور آپس میں دوستی اور یکجہتی کو کام میں لائیں اور اپنی طاقت کو دشمن کے مقابلہ میں صرف کریں۔غالب امید ہے کہ اجتماع المسلمین اور ان کی حُسن عزیمت سے تازہ فتح نصیب ہوگی۔اللہ تعالیٰ قرآن عظیم میں فرماتا ہے کہ "اگر تم اللہ کے دین کی مدد کروگے تو وہ تمہاری مدد کرے گا"۔اس زمانے میں دشمنان دین کے غالب ہونے اور مسلمانوں کے مغلوب ہونے کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مسلمان اپنے اغراض نفسانی درمیان میں لے آتے ہیں اور ہنود کو اپنے کاروبار میں دخیل بناتے ہیں۔ظاہر ہے کہ ہنود غیر مسلموں کا استیصال گوارا نہ کریں گے۔دوراندیشی اور تحمل اچھی شے ہے لیکن اتنی نہیں کہ غیر مسلم مسلمانوں کے شہر پر قبضہ کرتے جائیں۔ یہ وقت تحمل اور دوراندیشی کا نہیں ہے۔یہ وقت خدا پر بھروسہ کرنے اور استعداد حرب ظاہر کرنے اور غیرت مسلمانی کو جوش میں لانے کا ہے"۔

اس خط سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ نواب تاج محمد خان رئیس بہادر پور نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے یا تو مشورہ طلب کیا ہوگا۔ یا اپنے حق میں دعائے خیر کے لئے درخواست کی ہوگی۔ بہرحال مسلمان امراء کی آنکھیں کھل گئیں۔

سورج مل کا قتل

نجیب الدولہ جو پہلے تذبذب کے عالم میں تھا۔اب اس نے سورج مل سے ٹکرانے کا فیصلہ کرلیا اور ایک ساعت سعید میں لشکر جرار لے کر اس کی طرف روانہ ہوا۔متھرا کے بلوچوں نے بھی اس کی مدد کی۔عین معرکہ کارزار میں جبکہ کشتوں کے پشتے لگ رہے تھے۔سید محمد خان بلوچ المعروف بہ سیدو خان چالیس پچاس سوار ہمراہ لے کر ہراول دستے سے نجیب الدولہ کی طرف روانہ ہوا۔اس کے رفیقوں میں سے ایک نے سورج مل کو راستے میں دیکھ کر پہچان لیا اور چلا کر کہا۔ "خان صاحب! آپ کہاں جارہے ہیں۔ٹھاکر سورج مل تو یہاں کھڑا ہے۔ایسا وقت پھر کب میسر آسکتا ہے!" سید محمد خان نے

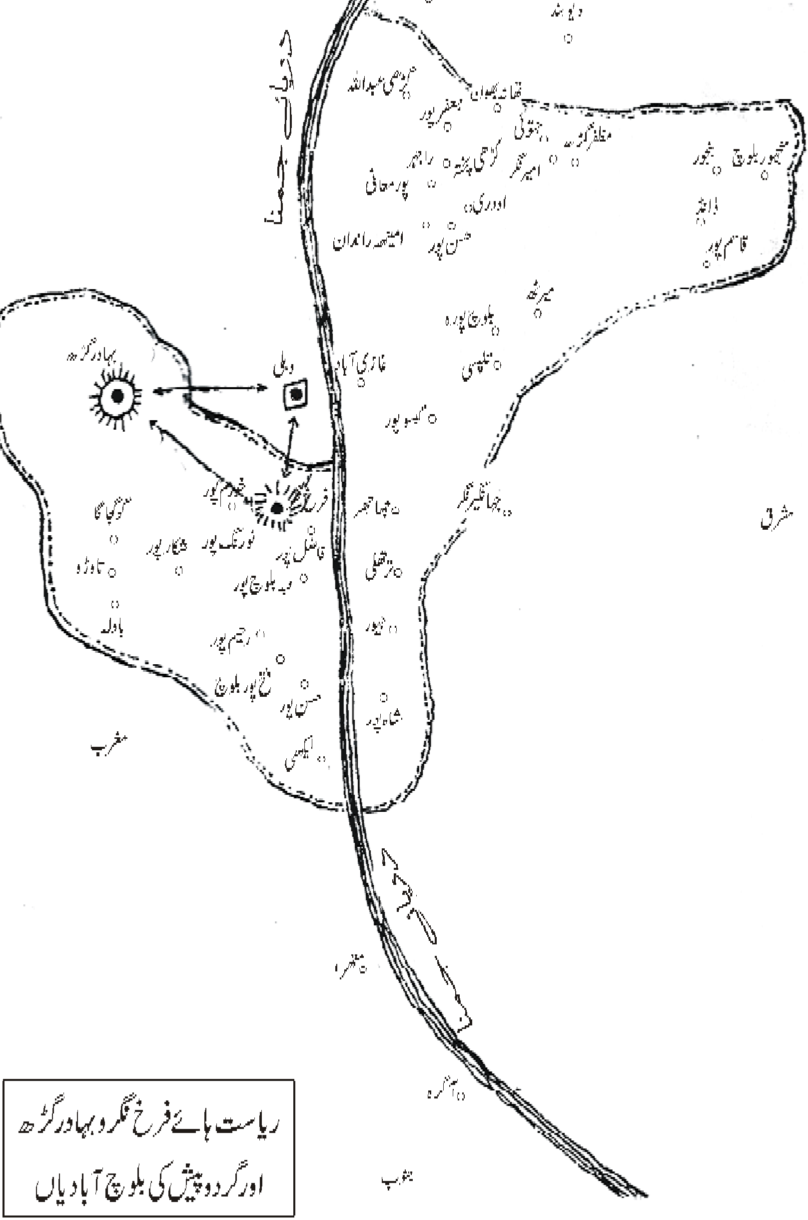

ریاست ہائے فرخ نگر و بہادر گڑھ
اور گرد و پیش کی بلوچ آبادیاں

رفیقوں سمیت پلٹ کر سورج مل پر حملہ کیا۔ اس کے ایک ساتھی نے سورج مل کو تلوار کا ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ اس کا دایاں ہاتھ کٹ کر زمین پر گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے ساتھی پل پڑے۔ اسے مرزا سیف اللہ اور راجہ امر سنگھ سمیت قتل کر دیا اور اس کے ناسور زدہ ہاتھ کو بطور نشانی لے کر نجیب الدولہ کی خدمت میں حاضر ہوئے (سید محمد خان بلوچ معروف بہ سید وخان با چہل پنجاہ سوار از فوج ہراول نجیب الدولہ گریزاں شدہ بطرف نجیب الدولہ مے رفت، شخصے از ہمراہیان اُو سورج مل راشناختہ گفت، خان صاحب! کجا مے روید۔ ٹھا کر سورج مل تنہا در میدان استادہ است۔ چنیں وقت باز بدست نخواہد آمد۔ سید و مع رفقا بر سورج مل تاخت، یکے از ہمراہیان اُو شمشیرے بر سورج مل زَد و دستِ راست او کہ دراں زخم ناسور ہم بود۔ مقطوع گشتہ در میدان افتادہ دیگراں ہجوم آوردہ اُو را مع مرزا سیف اللہ و راجہ امر سنگھ از تیغ گذرانیدند، دست مقطوع اُو را بنشان برداشتہ نزد نجیب الدولہ آوردند۔

(سیر المتاخرین جلد دوم ص ۹۲۹)

سورج مل کے کچھ عرصہ بعد ایک لڑائی میں جواہر سنگھ بھی مارا گیا جس پر اس کا چھوٹا بھائی رتن سنگھ گدی نشین ہوا۔ اس کے زمانے میں نواب موسیٰ خان رہا ہوئے اور انہوں نے مردانہ وار لڑ کر اپنی ریاست کو آزاد کرا لیا۔

نواب بہادر جنگ کے تعلقات خان اعظم میر نصیر خان احمد زئی کے ساتھ بے حد مخلصانہ تھے۔ جب وہ احمد شاہ ابدالی کے ہمراہ سپہ سالار اعظم کی حیثیت میں دہلی تشریف لائے تھے تو وہ اکثر اوقات بہادر گڑھ آیا کرتے تھے اور جب وہ قلات کو واپس ہوئے تو اپنی فوج کا ایک دستہ بہادر گڑھ میں چھوڑ گئے۔ جنگ آزادی میں نواب بہادر خان نے پوری طرح ابوالمظفر سراج الدین بہادر شاہ کا ساتھ دیا۔

مرزا غالب لکھتے ہیں کہ

''۲۰ نومبر ۱۸۵۷ء کو بہادر جنگ خان والی بہادر گڑھ کو دہلی لایا گیا اور ان کے لئے بھی قلعہ میں جائے قیام مقرر ہوئی اور بعد میں پھانسی دے دی گئی۔ نوابان فرخ نگر کی طرح بہادر گڑھ کے رئیس بھی دیکھتے ہی دیکھتے آسمان سیاست پر مہر و ماہ بن کر چمکنے لگے تھے۔ انہوں نے میدان جنگ اور ایوان حکومت میں ہر جگہ اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے تھے اور آخیر میں شمع آزادی پر پروانہ وار تصدق ہو کر انہوں نے انسانیت کی لاج رکھ لی۔ آج اگرچہ بہادر جنگ دنیا میں موجود نہیں لیکن بہادر گڑھ زبان حال سے ان کے عدل و داد کی داستانیں سنانے کو زندہ موجود ہے''۔ ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما

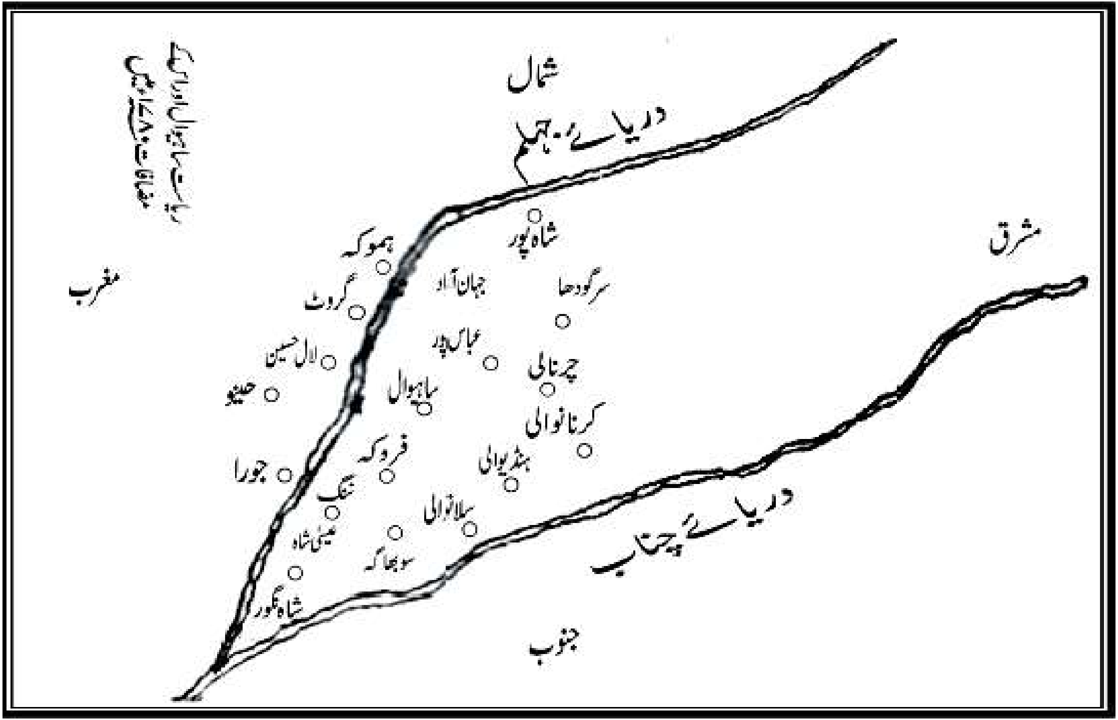
ریاست ساہیوال اور اس کے
مضافات ۱۷۸۰ء میں
شمال
دریائے جہلم
مشرق
مغرب
جنوب
دریائے چناب
شاہ پور
سرگودھا
جہان آباد
ہموکہ
گروٹ
عباس پور
چھنالی
لال حسین
ساہیوال
کرنانوالی
جھنگ
فروکہ
ہنڈیوالی
جورا
جھنگ
سلانوالی
عیسیٰ شاہ
سوبھاکہ
شاہ نکور

ساہیوال

"میں ماں باپ دونوں جانب سے نجیب الطرفین ہوں۔یہی وجہ ہے کہ آج بھی میری شریانوں میں میر جلال خان اور چاکر اعظم کا خون کھول رہا ہے۔کیا میں دنیاوی طمع کی بنا پر ایک ایسی لڑکی کو شریک حیات بنالوں جو سکھ اور طوائف کے نطفوں سے پیدا ہوئی ہے۔اس کے بطن سے جو اولاد پیدا ہوگی اس کی نسبی حیثیت کیا ہوگی!"

(فتح خان)

میر بجار خان چاکر اعظم کے صاحبزادے تھے۔ تذکرہ رؤسائے پنجاب اور دوسری کتابوں میں میر چاکر خان کے ساتھ سیستان کی جنگوں کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ محض مغالطہ ہے۔ یہ لڑائی سیستان کے بادشاہ اور میر بجار خان کے جدامجد امیر جلال خان کے درمیان ہوئی تھی۔ جس کا ذکر میر چاکر خان کے ضمن میں بڑی تفصیل سے ہو چکا ہے۔ جب شیر شاہی افواج نے بلوچوں کو نرغے میں لے لینے کی کوشش کی تو میر بجار خان اپنے بھائی میر دادن خان کے ہمراہ خوشاب کے علاقہ تھل میں منتقل ہو گئے کیونکہ اس وقت یہی جگہ محفوظ تھی اور شہنشاہ ہمایوں کی متوقع آمد بھی اسی راستے سے ہونی تھی۔ چنانچہ جب بابر کا بیٹا کابل سے تازہ دم ہو کر اپنے باپ کے تخت وتاج پر قبضہ کرنے کی غرض سے وادئ پنجاب میں داخل ہوا تو اس نے میر دادن کو خوشاب اور میر بجار خان کو تھل کی ریاستیں عطا کیں۔ میر بجار نے دریائے جہلم کے کنارے اپنے دارالحکومت کی طرح ڈالی جو ان کے نام کی رعایت سے ''کوٹ بجار'' سے موسوم ہوا۔ میر صاحب نے نہریں احداث کر کے تھل کو خوب آباد کیا اور اپنی حیات مستعار کو ختم کر کے بمقام جلا زیرین (نیاز مند نے ساہیوال سے ضلع سرگودھا سے میر بجار خان کی قبر کے بارے میں مشتاق احمد خان سے تفصیلات طلب کی تھیں۔ انہوں نے از راہ عنایت جو جواب تحریر فرمایا اس کا پورا متن درج ذیل ہے۔

آپ نے لکھا:۔

''میر بجار خانؒ کا مزار جلا زیرین المعروف جلا بلوچاں میں تھا۔ مگر آج سے چالیس سال قبل اسی موضع کے نمبردار سردار امیر خان کو خواب میں حکم ہوا کہ مجھے یہاں سے نکال کر کسی اور جگہ دفن کرو

کیونکہ دریا نزدیک آرہا ہے اور مزار کے بہہ جانے کا خطرہ ہے۔ چنانچہ سردار امیر خان نے اس کی اطلاع ساہیوال کے رئیس کپتان محمد حیات خان کو دی جس پر کپتان صاحب نے میر صاحب کا جسد خاکی یہاں سے نکال کر اپنے گاؤں گروٹ تحصیل خوشاب میں دفن کرایا۔ قبر پر مقبرہ کی تعمیر شروع تھی کہ کپتان صاحب کا انتقال ہو گیا اور یہ کام تکمیل نہ پا سکا۔ صاحب مزار سے لوگوں کی بے پناہ عقیدت ہے۔ جب کبھی وبائی امراض پھوٹتی ہیں تو لوگ آپ کی قبر پر فاتحہ پڑھتے اور دعائیں مانگتے ہیں۔ جس سے وہ بلائیں دور ہو جاتی ہیں!'')۔

میر بجار کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے گل بالک خان اس ریاست کے رئیس قرار پائے۔ انہوں نے ضلع شاہ پور میں کئی نئے گاؤں آباد کئے اور اقوام کھٹیکاں کو شکست دے کر ان کے بہت سے آدمی اس مقام پر قتل کئے جو لڑائی کے بعد بے شمار مقتولین کی ہڈیوں کے سبب ہڈانوالی سے موسوم ہو گیا۔

ملک گل بالک خان نے اپنی زندگی کے آخری دور میں ہی اپنے بیٹے ہوت خان کو اپنا جانشیں مقرر کر دیا تھا۔ رئیس ہوت خان اور ان کے دو جانشینوں کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ ساہیوال کے چھٹے رئیس صاحب خان اپنی سخت گیری کے سبب رعایا میں مقبول نہ ہو سکے۔ انہیں معزول کر دیا گیا اور ان کے بھتیجے لنگر خان ساہیوال کے رئیس قرار پائے۔ یہ بڑے حلیم الطبع انسان تھے۔ انہوں نے ریاست کو آباد کرنے اور عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنے کی بڑی کوشش کی۔ جس سے ملک کی خوشحالی اور رونق میں چار چاند لگ گئے۔

لنگر خان کی احتیاطی تدبیریں

لنگر خان کے مختلف عورتوں کے بطن سے چار لڑکے تھے۔ اس نے اس خیال کے پیش نظر کہ اس کے بعد لڑکوں میں جھگڑے پیدا نہ ہوں۔ ساہیوال کے گرد و پیش ہر ایک کے لئے ایک

ایک قلعہ تعمیر کرادیا۔جن میں سے ایک اس وقت بھی موجود ہےلیکن لنگر خان کی یہ کوششیں کارگر نہ ہوئیں اور ۱۷۳۵ء میں اس کی وفات کے بعد حصول اقتدار کے لئے لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ سب سے بڑا لڑکا لعل خان غالب آیا اور اس نے اپنے بھائیوں بہرام خان، لشکر خان اور اپنے بھتیجے کالو خان کو قتل کر کے یہ سمجھ لیا کہ اس نے اپنے راستے سے کانٹے ہٹا دیئے ہیں۔ اتفاق سے انہی دنوں احمد شاہ امیر افغانستان نے ہندوستان پر پہلا حملہ کیا۔لعل خان نے سامان رسد اور بار برداری کی بہم رسانی میں کافی امداد کی۔جس کے صلے میں بادشاہ نےلعل خان پر بڑی مہربانی فرمائی۔ یہ عزت افزائی لعل خان کے چھوٹے بھائی مبارک خان سے گوارا نہ ہوسکی اور وہ بوچر یانوالہ کے رئیس فتح خان سے سازش کر کے دفعتہ بڑی فوج لعل خان پر چڑھالایا۔ دونوں بھائیوں کے درمیان شدید جنگ ہوئی۔جس میں لعل خان مارا گیا۔

سردار فتح خان

لعل خان کے بعد اس کا کمسن لڑکا فتح خان مسند نشین ہوا۔اس نے مبارک خان اور اس کے خاندان کو بزور شمشیر ریاست سے نکال دیا۔مبارک خان ریاست بہاولپور چلا گیا اور اس کے رشتہ دار جھنگ میں منتقل ہو گئےلیکن سردار فتح خان کا عہد حکومت بھی مختصر ثابت ہوا۔ افغان سردار فتح خان کو قید کر کے ڈیرہ اسماعیل خان لے گئے۔ جہاں اسے قتل کر دیا گیا۔اس نے اپنے پیچھے کوئی لڑکا نہیں چھوڑا تھا۔اس کے دو بھائی تھے مگر وہ اتنے چھوٹے تھے کہ کاروبار ریاست کو چلا نہیں سکتے تھے۔ اس لئے ان کی ماں بی بی باندی نے تمام کاروبار حکومت اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ مائی باندی ایک بہادر اور قابل خاتون تھی۔قوم اس کے انتظام سے خوش تھی۔ اگر اس کی کوئی کمزوری تھی تو یہی کہ وہ عورت تھی۔ ۱۷۵۰ء میں احمد شاہ کا نائب راجہ کوڑامل ساہیوال آیا اور اس نے ان کمسن بچوں کو اپنی کچہری میں طلب کیا۔مائی باندی کو اس کی نیت درست معلوم نہ

ہوئی۔اس نے راجہ کے حکم کی تعمیل نہ کی بلکہ فوج کو مسلح کر کے ان پر حملہ کر دیا جنگ میں اسے شکست ہوئی۔اس کے دونوں بچے قید کر لئے گئے۔جن کی نسبت یقین کیا جاتا ہے کہ وہ معصوم کلیاں بے دردی سے کچل دی گئیں مبارک خان ریاست بہاولپور میں بیٹھا ساہیوال کے حالات کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔جونہی اسے سردار فتح خان کے بھائیوں کی شہادت کی اطلاع ملی وہ بگولے کی طرح اڑ کر پہنچا اور معمولی سی مزاحمت کے بعد ساہیوال پر قابض ہو گیا۔وہ اپنی وفات یعنی ۱۷۷۰ء تک برابر اس پر متصرف رہا۔

سکھوں کے حملے

سردار مبارک خان کے بعد اس کا بیٹا مسند نشین ہوا۔ابھی یہ خوشی نہ کر پایا تھا کہ سردار جھنڈا سنگھ بھنگی لشکر جرار سے چڑھ آیا۔مگر محمد خان بروقت سنبھل گیا اور اس نے اتنی قوت سے مدافعت کی کہ سردار جھنڈا سنگھ کی ہوا اکھڑ گئی اور اسے بے نیل ومرام واپس لوٹنا پڑا۔اس واقعہ کے تھوڑے عرصہ بعد چند سکھوں اور بلوچوں نے سردار محمد خان کو قتل کر ڈالا۔

محمد خان کے انتقال پر اس کا لڑکا ملک اللہ یار آباء کرام کی مسند کا مالک بنا۔اس نے باپ کے دشمنوں سے انتقام لے کر دوبارہ سلطنت پر قبضہ کیا۔علاقے کو ترقی دینے کی غرض سے دریائے جہلم سے ایک نہر نکالی اور اسی جدوجہد میں ایک روز گھوڑے سے گر کر فوت ہو گیا۔

سردار فتح خان ثانی

سردار فتح خان ثانی ساہیوال کے چودھویں رئیس تھے۔اپنے بھائی اللہ یار کی وفات کے وقت نابالغ تھے کچھ عرصہ ان کی والدہ ماجدہ بی بی اللہ جوائی اپنے دیوان دیا رام کی مدد سے کاروبار سلطنت چلاتی رہی۔فتح خان نے بالغ ہو کر ان سے اختیارات سنبھال لئے۔اس کے بعد انہوں نے سنکھوں کے خلاف ہتھیار اٹھائے اور ان سے تھنگ اور شیخ جلال کے قلعے واپس لے لئے

مت سنگھ بھنگی سے مقام ڈیرہ جارا چھین لیا اور تھوڑے سے عرصہ میں ہی اپنی قابلیت اور شجاعت کی دھاک بٹھا دی۔ وہ لگاتار اپنی ریاست کو وسعت دینے میں مصروف رہا۔ اس نے نہ صرف گردو پیش کے آبائی مقبوضات واپس لیئے بلکہ نئے علاقے بھی فتح کر لئے۔ یہاں تک کہ اس کے زیر نگیں اتنے علاقے ہو گئے کہ اس کی ریاست کا مالیہ تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے تک پہنچ گیا۔ جب مہان سنگھ کو اقتدار حاصل ہوا تو فتح خان نے سیاسی وجوہات کے پیش نظر اس کو تھوڑا سا خراج دے دینا مناسب سمجھا۔ پھر ۱۸۰۴ء میں اس نے رنجیت سنگھ کو پچیس گھوڑے اور پچیس اونٹ سالانہ بطور نذر کے دینا منظور کئے مگر بعد میں یہ نذر یا خراج بارہ ہزار روپے نقد سالانہ کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔

فتح خان کا رشتہ لینے سے انکار

انہی ایام میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ جس سے فتح خان پر مصائب اور آلام کے دروازے کھل گئے۔ رنجیت سنگھ کی موراں طوائف کے بطن سے ایک لڑکی تھی جو حسن و جمال میں چندے ماہتاب و چندے آفتاب تھی۔ راجہ اس کا رشتہ کسی سکھ سردار سے کرنا چاہتا تھا۔ مگر موراں بضد تھی کہ میں اس کی شادی کسی مسلمان رئیس سے کروں گی۔ انجام کار راجہ نے ہار مان لی اور اپنے ایک بوڑھے صلاح کار حاکم دین کو بلا کر اس بارے میں مشورہ لیا۔ اس نے کہا کہ ساہیوال کا نواب بڑا خوبصورت اور بہادر نوجوان ہے۔ اس لڑکی کے لئے اس سے بہتر رشتے کا ملنا ناممکن ہے۔ موراں نے حاکم دین کو ساہیوال روانہ کیا کہ فتح خان کو اس رشتے پر رضامند کرے۔ ساتھ ہی اسے یہ لالچ بھی دیا کہ شاہی محلہ کے تمام مکانات جو قیمتی سامان سے بھرے پڑے ہیں نیز وہ تمام ہیرے، جواہرات اور مُرصّع طلائی زیورات، جو لاکھوں کی مالیت کے ہیں لڑکی کے جہیز میں دیئے جائیں گے۔ راجہ نے کہا کہ اگر رشتہ ہو گیا تو پشاور تک کا علاقہ اس کی سرداری میں دے

دوں گا۔حاکم دین خوش تھا کہ جب لڑکی حسین ہے۔ایک طاقتور حکمران کی بیٹی ہے اور ساتھ ہی پشاور تک کا علاقہ اور لاکھوں کروڑوں کا جہیز مل رہا ہے۔ فتح خان اس عظیم پیشکش کو کیسے ٹھکرا سکتا ہے۔مگر جب حاکم دین نے یہ صورت حال فتح خان کے آگے رکھی تو اس پر اوس پڑ گئی۔ وہ کافی دیر سوچتا رہا پھر کہا:۔

"حاکم دین! تم میرے لئے ایک منحوس خبر لائے ہو میرا خاندان صدیوں سے یہاں آباد ہے۔ میرے آباء کرام میں سے کسی نے غیر قوم میں رشتہ نہیں کیا۔ میں ماں باپ دونوں جانب سے نجیب الطرفین ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی میری شریانوں میں میر جلال خان اور میر چاکر کا مقدس خون کھول رہا ہے۔ میں روپے پیسے یا دنیاوی اعزاز کے لالچ میں اپنے خاندان سے دھوکہ نہیں کرسکتا اور نہ ہی میں اپنے باپ دادا کی مقدس امانت میں خیانت کرسکتا ہوں۔ کیا میں دنیاوی طمع کی بناء پر ایک ایسی لڑکی کو شریک حیات بنا لوں جو سکھ اور طوائف کے نطفوں سے پیدا ہوئی ہے؟ اس کے بطن سے جو اولاد ہوگی اس کی نسبی حیثیت کیا ہوگی!"۔

حاکم دین نے نواب کے اس فیصلے کے نتائج وعواقب سے ڈرایا مگر فتح خان اپنی ہٹ پر قائم رہا اور حاکم دین مایوس ہو کر چلا گیا۔

نواب فتح خان نے بلا تاخیر اپنے خاندان کی ایک بانوئے عفت مآب سے شادی کرلی۔ جس کے بطن سے اللہ جل جلالہٗ نے اسے چاند جیسا فرزند جگر عنایت کیا۔ فتح خان مہاراجہ کو خراج باقاعدہ طور سے ادا کرتا رہا یا نہیں لیکن ساہیوال پر حملہ کرنے کے لئے رشتہ قبول نہ کرنے کا واقعہ ہی کچھ کم نہ تھا۔ چنانچہ وہ ۱۸۱۰ء کے موسم بہار میں فوجیں جمع کر کے ساہیوال پر چڑھ آیا اور فتح خان کو اپنے حضور میں طلب کیا۔ فتح خان دیکھ چکا تھا کہ جو بھی راجہ کے دربار میں جاتا ہے۔ اسے واپس آنا نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے اس نے اس حکم کی تعمیل میں تامل سے کام لیا۔ مگر رنجیت سنگھ نے اس کے ساتھ ایسی گہری محبت کا اظہار کیا کہ وہ اپنے معصوم بیٹے لنگر خان کو بے بہا تحائف

کے ہمراہ راجہ کی خدمت میں بھیجنے پر مجبور ہو گیا۔ مہاراجہ بچے کے ساتھ بڑے اخلاص سے پیش آیا اور فتح خان سے دوستی کی تجدید کر کے خوشاب کو بڑھ گیا۔

نواب فتح خان نے یہ سمجھا کہ اب خطرہ ٹل گیا ہے۔ راجے کی توپیں خوشاب پر گولے پھینکتی رہیں۔ مگر یہ بسم اللہ کے گنبد میں امن وسکون سے بیٹھا رہا اور اس نے یہ نہ سمجھا کہ آج خوشاب کی باری ہے تو کل ساہیوال اس زد میں ضرور آئے گا۔ آخر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا کہ اگرچہ فتح خان خوشاب کی مہم سر ہونے پر راجہ کو مبارکباد دینے کے لئے گیا اور جھنگ تک راجہ کے جلو میں بھی پھرتا رہا۔ مگر جوں ہی یہ ساہیوال کو واپس لوٹا۔ دفعتہ رات کو راجہ کی فوجیں بھی قضائے مبرم کی طرح آدھمکیں۔ نواب کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ راجہ موثق عہد و پیمان کے باوجود ایسی حرکت کرے گا۔ اس لئے اس کے پاس شہر کے بچاؤ کا کوئی سامان نہ تھا۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ اپنے چند رفیقوں کے ہمراہ مردانہ وار مقابلہ کیلئے نکل آیا اور خوب بہادری دکھائی مگر تابہ کے؟ آخر گرفتار ہو گیا۔ راجہ اسے لاہور لے آیا۔ کہتے ہیں کہ نواب پر ان نرم و نازک باتوں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ سال بعد راجہ نے پچاس سوار خدمات کے لئے مہیا کرنے کے عوض چودہ ہزار چار سو کی جاگیر جھنگ میں عنایت کر کے آزادی بخشی مگر ۱۸۱۲ء میں اسے پھر دربار میں طلب کر لیا گیا اور یہ تین سال تک دربار میں حاضر باش رہا۔ مگر یہ درباری زندگی اس کے مزاج کے مطابق نہ تھی۔ اس تین سال کے عرصے میں سلطان خان راجہ بھمبر کے ساتھ رنجیت سنگھ کو ویسا ہی فریب کرتے دیکھا جیسا کہ خود اس کے ساتھ ہوا تھا۔ اس نے مصیبت زدہ شاہ شجاع کو باوجودیکہ مہاراجہ نے اسے حفاظت میں رکھنے کی قسم کھائی تھی۔ خود مہاراجہ کے ہی ہاتھوں دھوکے سے لٹتے دیکھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نواب کا دل اس قابل نفرین دربار سے حددرجہ متنفر ہو گیا اور منکیرہ کی طرف بھاگ گیا۔

فتح خان کی وفات: یہاں کا رئیس سردار محمد خان بلوچ اگرچہ دانا اور بڑا قابل حکمران تھا۔ مگر وہ فتح خان کی کچھ مدد نہ کر سکا۔ اس لئے نو ماہ گزار کر فتح خان نے ملتان کا رخ کیا۔ نواب

مظفر خان نے دوسال تک اپنے ہاں مہمان رکھا لیکن ۱۸۱۸ء میں جب اس کے پرانے دشمن رنجیت سنگھ نے ملتان پر حملہ کیا تو بے خانماں فتح خان کو یہاں سے بھی بہاولپور منتقل ہونا پڑا اور ۱۸۲۰ء میں بمقام احمد پور شرقیہ فوت ہو گیا۔

سردار لنگر خان: سردار لنگر خان باپ کے انتقال کے وقت صرف چودہ برس کا تھا۔ نواب صادق محمد خان والی بہاول پور نے لنگر خان اور اس کے سواروں کو اپنی ملازمت میں رکھ لیا۔ تین سال بعد جب راجہ کو نواب فتح خان کے فوت ہو جانے کی اطلاع ملی تو اس نے لنگر خان کو لاہور طلب کیا اور اسے جھنگ اور ساہیوال میں بارہ سو روپے کی جاگیر اور پچاس سواروں کی تنخواہ دے کر ملتان میں دیوان ساون مل کے ماتحت تعینات کر دیا۔ اس نے دس سال تک ملتان میں باتعریف کام کیا جس پر مہاراجہ نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے سے اسے مغلاں والہ، نون اور جھوک سنجر کی ایک نئی جاگیر عنایت کی۔ جس پر بشمول جاگیر ساہیوال اس کے پاس تین ہزار روپے کی جاگیر ہو گئی جو اب تک اس کے خاندان کے قبضے میں چلی آتی ہے۔

سردار کپتان محمد حیات خان: باپ کے انتقال پر سردار محمد حیات خان اپنے خاندان کا سربراہ مقرر ہوا۔ اس نے کابل بنوں اور ملتان کے محاصرے میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ یہ بڑا بہادر اور صاحب اخلاق رئیس تھا۔ ۱۸۶۲ء میں ۳۵ سال کی عمر پا کر عالم فانی سے عالم باقی کو رخصت ہوا۔

سردار چراغ خان: چونکہ سردار محمد حیات خان کی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ اس لئے برادری کے مسنّ بزرگوں نے ان کے چھوٹے بھائی مبارک خان کے لڑکے چراغ خان کی دستار بندی کرائی۔ سردار صاحب ڈویژنل درباری کرسی نشین تھے اور بڑے اثر ورسوخ کے مالک تھے۔

سردار عبدالرحمن خان: سردار چراغ خان کے انتقال پر چونکہ ان کا بیٹا عبدالرحمن خان صغیر سن تھا۔ اس لئے مرحوم کے چھوٹے بھائی سردار فتح خان نے خاندان کو سنبھالا۔ اپنے

یتیم بھتیجے کو اچھی تعلیم دلائی اور اپنے خاندان کی روایات کو زندہ رکھنے میں کوشاں رہا۔ سردار صاحب موصوف پرانی طرز کے ملنسار اور وضعدار بزرگ تھے۔ شہر کے لوگ ان کے اخلاق حمیدہ کے گرویدہ تھے۔ سردار عبدالرحمن خان تعلیم سے فارغ ہو کر فوج میں بھرتی ہوئے۔ مگر جب ان کی پلٹن کو بیت المقدس پر حملہ کرنے کا حکم ملا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ کچھ عرصہ انگریز کے زیر عتاب رہے۔ اپنے خاندان کے آخری چشم و چراغ کی حیثیت سے ساہیوال میں زندگی کے بقیہ ایام بسر کئے۔ آپ کے متعدد صاحبزادے ہیں۔ سردار مبارک خان سب سے بڑے اور اچھی سوجھ بوجھ کے انسان ہیں۔

○

شجرہ نسب سردارانِ ساہیوال

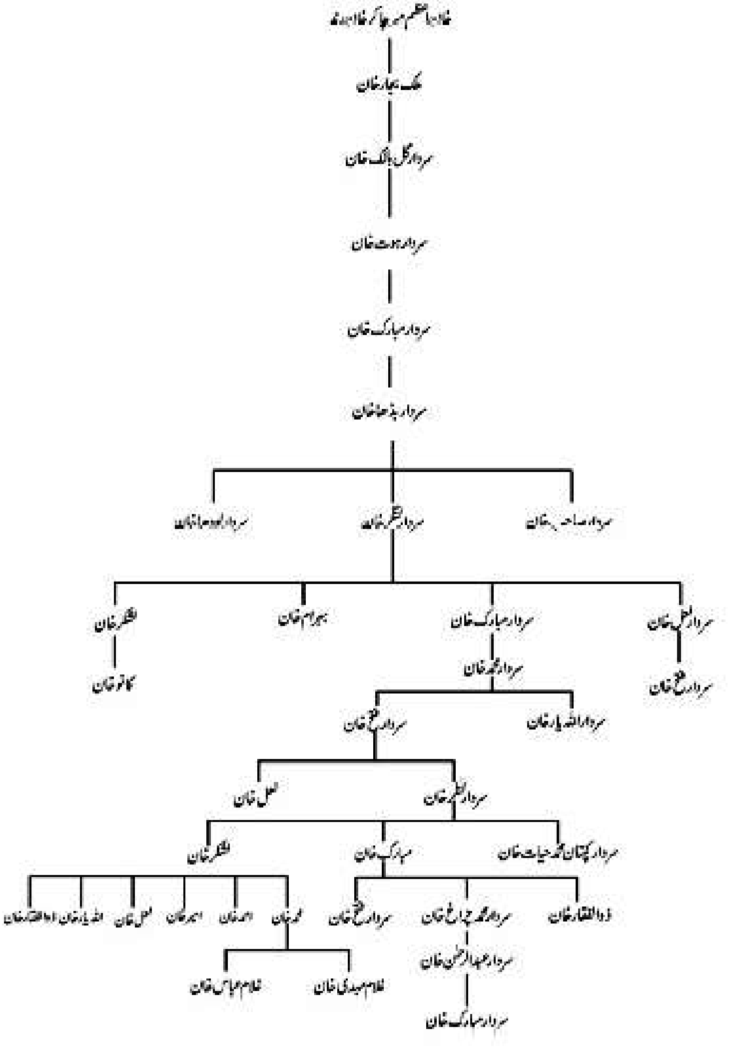

ڈیرہ اسمٰعیل خان

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر اُممؐ کیا ہے
شمشیر وسناں اوّل طاؤس ورُباب آخر

(اقبالؔ)

شجرہ نسب ہوت فرمانروایانِ ڈیرہ اسماعیل خان

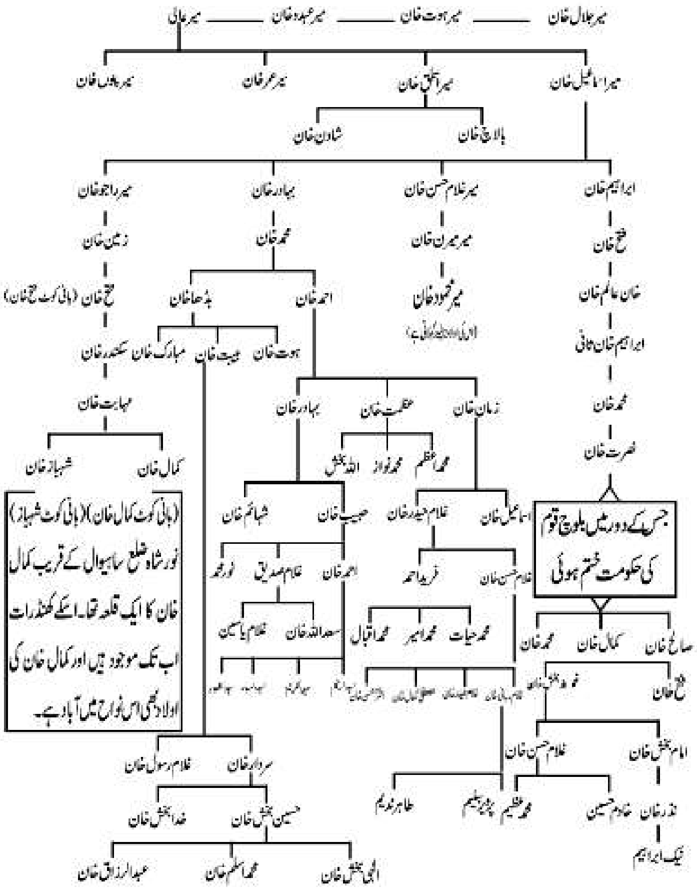

ڈیرہ اسماعیل خان کی بنیاد جام اسماعیل خان ہوت نے ۱۴۸۸ء میں رکھی تھی۔

(The town of Dera Ismail Khan was founded by hout Baloch earlier about 1488."who is who")

یہ شہر دریائے سندھ کے غربی کنارے پر بقدر ڈیڑھ میل دور تعمیر کیا گیا تھا۔ ہوت فرمانروا نے خوبصورت عمارتیں بنوا کر اسے خوب رونق دی اور چاروں طرف مصارف کثیر سے بڑے عمدہ باغات لگوائے۔ بابر کے زمانے میں یہ شہر خاصا مشہور ہو چکا تھا۔ ۹۴۶ھ (۱۵۳۹ء) میں جب شیر شاہ ملک کا دورہ کرتے ہوئے خوشاب پہنچا تو جام اسماعیل خان ہوت، فتح خان کلاچی اور میر حاجی خان میرانی نے حاضر ہو کر وفاداری کا حلف اٹھایا اور اپنی اپنی ریاستوں پر بحال رہے۔ عباس خان سروانی نے جام اسماعیل خان کی عقلمندی کا ایک عجیب واقعہ بیان کیا ہے۔ لکھتا ہے کہ شیر شاہ نے بلوچوں کو حکم دیا کہ گھوڑوں کو داغ کراؤ۔ اسماعیل خان کو گھوڑے بڑے پیارے تھے اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ بے زبان مخلوق کو عذاب پہنچے۔ اگر انکار کرتا تو حکم عدولی کا مرتکب ہوتا۔ اس لئے بڑی سادگی سے عرض کیا جہاں پناہ! دوسرے لوگ گھوڑوں کو داغ کریں گے۔ میں اپنے تئیں داغ کروں گا'' بادشاہ اس جواب سے بڑا خوش ہوا اور اسماعیل خان کو داغ معاف کیا۔

(تاریخ شیر شاہ از عباس خان سروانی ص ۲۸۴)

جام اسماعیل خان کے شیر شاہ سے خوشگوار تعلقات تھے۔ ان کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہوتا ہے کہ جب شیخ بایزید سجادہ نشین شیخ احمد لکھو سروانی نے شیر شاہ سے درخواست کی کہ ہمارے بزرگوں کے ملک پر لنگاہوں کے زمانے سے بلوچوں نے قبضہ کر رکھا ہے وہ ہمیں واپس دلایا جائے تو شیر شاہ نے پرگنہ ندہ اور گاؤں گھر گھراں تبادلے میں دے کر وہ ملک بایزید کو واپس

دلایا۔ پھر یہ بزرگوار! اسپین اور سارنگ پور کی مہم میں شیر شاہ سے ملے اور دوبارہ بلوچوں کے ملک پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی۔ مگر شیر شاہ ٹال گیا۔ اسماعیل خان اور اس کی پانچ پشتوں نے بڑے جاہ وجلال سے ڈیرہ پر حکومت کی۔ مگر جب نصرت خان تخت نشین ہوا تو اس سے ایسی بے جا حرکتیں ظہور میں آئیں کہ نہ صرف حکومت سے ہاتھ دھو بیٹھا بلکہ مستقلاً یہ ملک بلوچوں کے تصرف سے نکل گیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس نے عیسب خان میاں خیل سے اس کی ہمشیرہ کا رشتہ طلب کیا۔ عیسب خان نے پاوندگان، گنڈہ پور اور بابر ملحقہ تمنات کا لشکر جمع کر کے نصرت خان پر حملہ کر دیا۔ چاکر کوٹ کے مقام پر بلوچوں اور پٹھانوں میں خونریز جنگ ہوئی جس میں نصرت خان کو شکست ہوئی اور وہ ڈیرہ کی طرف بھاگ آیا۔ اس سے پہلے گنڈہ پور صرف موضع روڑی پر قابض تھے۔ اب انہوں نے بلوچی مواضعات کلاچی وغیرہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ اسی طرح کئی مواضعات میاں خیلوں نے اپنے تمن میں شامل کر لئے اور نصرت خان کی حکومت صرف ڈیرہ کے گرد و پیش تک ہی محدود ہو کر رہ گئی۔

نصرت خان کا جب پٹھانوں پر بس نہ چلا تو بقول ''نزلہ بر عضو ضعیف مے ریزد'' اس نے رقبے کی کمی کو پورا کرنے کے لئے قلعہ بھکر پر حملہ کر دیا اور نواب نصرت خان کو گرفتار کر کے لے آیا۔ اس کی والدہ بیٹے کو رہا کرانے آئی تو اسے بھی گرفتار کرنے کے درپے ہوا۔ مگر وہ بے چاری زہر کھا کر مر گئی۔ نواب نے صبح کو اس مائی کے لعل کو رہا کر دیا لیکن اس نے بھی ندامت کے مارے زہر کھا لی۔ منکیرہ میں نواب فتح خان کو اس حادثے کی اطلاع ملی تو اس نے بھی خودکشی کر لی۔ منکیرہ ریاست کے وزیر حسن خان نے دربار کابل میں درخواست بھیجی وہاں سے نواب کی گرفتاری کا حکم آیا اور قمر الدین خان اسے بڑی ذلت کے ساتھ محبوس کر کے کابل لے گیا۔ بیس برس تک افغانستان کے بادشاہ کی طرف سے براہ راست گورنروں کا تقرر ہوتا رہا۔ ۱۷۹۱ء نصرت خان کو رہائی اور ڈیرہ اسماعیل خان کی حکومت کی تازہ سند ملی۔ مگر یہ وقفہ نہایت مختصر تھا۔ ۱۷۹۴ء

ییں ڈیرہ کی نظامت نواب محمد خان سدوزئی کو مرحمت ہوئی۔ جس پر نصرت خان کو مجبوراً ڈیرہ چھوڑنا پڑا۔ اس عالم میں بھی اس نے پرانی روش کو نہ چھوڑا۔ یعنی ایک امیر سوداگر کو اپنے ہمراہ پکڑ کر لے گیا۔ یہ اس کا آخری عوامی کارنامہ تھا۔ اس کے بعد ہوت خاندان کتم عدم میں پوشیدہ ہو گیا۔

مسٹر ایف کننگھم لکھتے ہیں کہ نصرت خان نے بلوٹ کے قریب اپنی زندگی کے آخری ایام بسر کئے۔ وہ کسی قسم کی جائیداد کا مالک نہیں رہا تھا۔ وہ اس معمولی سی پنشن پر گزارا کرتا تھا۔ جو اسے سدوزئی نواب کی طرف سے ملتی تھی اور وہ بھی ۱۸۵۵ء میں نواب شیر محمد خان کے انتقال پر بند ہو گئی۔ ۱۸۷۰ء میں ہوت خاندان کا سربراہ پندرہ سالہ نوجوان امام بخش خان تھا۔ جسے حکومت کی طرف سے ۲۴۰ روپے سالانہ امداد ملتی تھی۔

ہوت آبادیاں

اس وقت صرف تین مواضعات خان پور شمالی، موضع ہوت اور موضع بستی مائی روشن (تحصیل بھکر) میں ہوت زمیندار آباد ہیں۔ یہ آپس میں ملتے جلتے اور ایک دوسرے سے رشتے ناطے بھی کرتے ہیں۔ خان پور کے ہوت خاندان میں سردار غلام حسن خان ای اے سی ہو کر ریٹائر ہوئے۔ ان کے بڑے صاحبزادے غلام ربانی خان گریجویٹ ہونے کے باوجود کہیں ملازم نہیں ہوئے۔ متدین انسان ہیں اور زمیندار ہیں۔ دوسرا صاحبزادہ مصطفی کمال خان ہے۔ غلام ربانی خان کے صاحبزادے پرویز سلیم بلوچستان کے چیف سیکرٹری رہے ہیں۔ ان میں سے بعض میں دینداری اور خداترسی کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔ سردار بڈھا خان کی اولادیں سے الٰہی بخش خان اور محمد اسلم خان خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ دونوں ہوشمند اور سمجھدار انسان ہیں۔

ڈیرہ اسماعیل خان کی بلوچ شخصیات

ڈیرہ اسماعیل خان خاص میں معدودے چند گھرانے بلوچوں کے ہیں۔ ان میں خان بہادر میجر سردار خان کا گھرانہ خاص طور پر مشہور رہے۔ اس بیدار بخت انسان نے محض اپنی ذاتی قابلیت اور محنت سے نام پیدا کیا۔ لیوی میں بھرتی ہوا اور ترقی کی منزلیں طے کرتا رسالدار میجر بن گیا۔ خاص ڈیرہ میں اس نے اپنے نام سے ایک محلہ آباد کیا۔ اس کے صاحبزادوں میں خان محمد حیات خان نہایت قابل انسان تھے۔ مرحوم کے ایک اور فرزند سردار احمد خان تھے۔ انہیں اپنی قوم کی پستی کا شدت سے احساس تھا۔ بلوچوں کی اصطلاح کے لئے ایک ہفت روزہ اخبار ترجمان بلوچ نکالا جو اگرچہ دیر تک جاری نہ رہ سکا لیکن قوم کے دلوں میں یہ جذبہ پیدا کر گیا کہ وہ اپنی اصلاح میں کوشش کریں۔

مسٹر ایس کے بلوچ: ڈیرہ کے قابل ترین بلوچ حضرات میں مسٹر سعد اللہ خان پوری قوم کا قیمتی سرمایہ تھے۔ یہ ایک غریب باپ کے بیٹے تھے۔ ذاتی کوشش اور محنت سے ایم اے کیا۔ ای اے سی کے مقابلے میں شامل ہوئے لیکن بے وسیلہ ہونے کے سبب رہ گئے۔ واپڈا میں کسی اچھے منصب پر فائز ہیں۔

ڈاکٹر میر عالم خان راقب: ڈیرہ کے بلوچوں میں ڈاکٹر میر عالم راقب امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔ جن دنوں مسلم لیگ اور کانگریس کے مابین رسہ کشی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کے بھائیوں نے مسلم لیگ کو کامیاب بنانے میں خون پسینہ ایک کر دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو اپنی قوم سے بے پناہ محبت تھی اور اس کی سربلندی کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہتے تھے۔ انہوں نے بلوچ تاریخ تصنیف کی۔

سردار مولاداد خان بلوچ: ڈیرہ کی محبوب ترین شخصیت تھے۔ اپنے بے پناہ خلوص،

قومی یکجہتی اور ہمدردی کے سبب ڈیرہ اور اس کے گردوپیش کے بلوچوں میں بڑے مقبول تھے۔ آپ نے ڈیرہ کی کہانی کے عنوان سے ڈیرہ اسماعیل خان کی سیاسی تاریخ لکھی۔اس شہر میں پچھلے پچاس سال میں جن سیاسی تحریکات نے جنم لیا۔اس کتاب میں آپ نے ان سب کی تفصیل لکھی۔

سردار عزیز الرحمن خان بلوچ: آپ ڈیرہ کے مشہور قانون دان اور کلاچی قبیلے کے سربراہ تھے۔قومی دلچسپی کے مسائل میں آپ نے عدیم الفرصتی اور کثرت کار کو کبھی حائل نہیں ہونے دیا۔ڈیرہ کے مضافاتی بلوچوں میں سردار خادم حسین خان گرسر اور جناب کرم علی خان بلوچ خاص طور پر قابل ذکر شخصیات گزری ہیں۔

شجرہ نسب مولانا اللہ وسایا خان کلاچی علیہ الرحمۃ

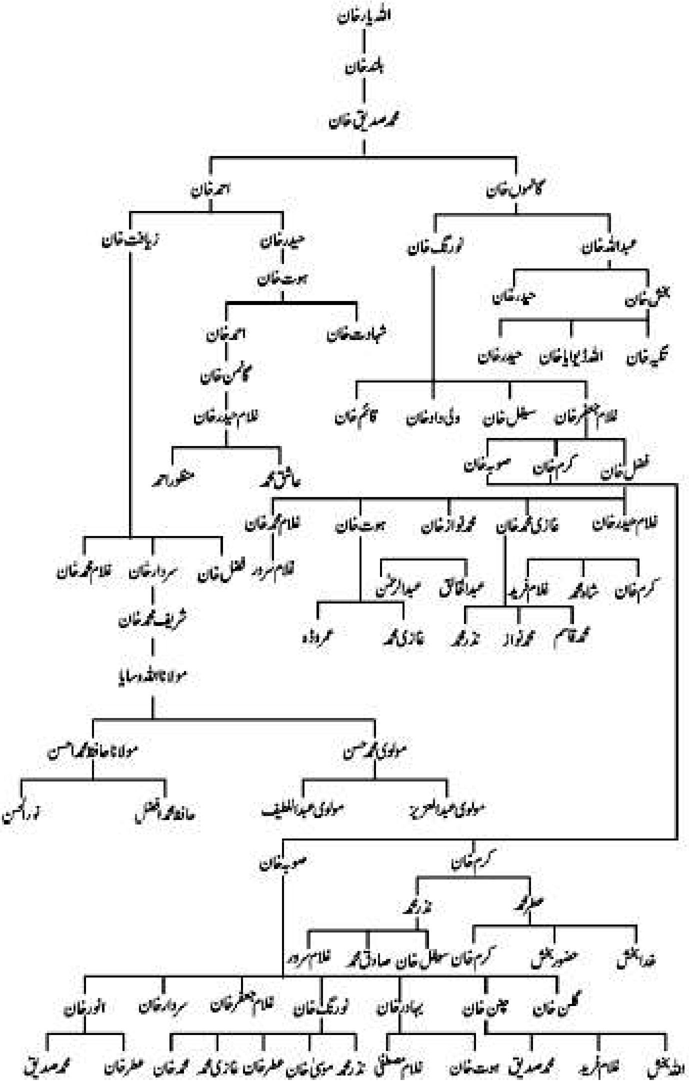

ڈیرہ فتح خان

مولانا اللہ وسایا کلاچی علیہ الرحمتہ دور آخر کے بہت بڑے عالم اور کامل صوفی تھے۔ قاضی محمد یاسین خطیب شاہی مسجد شجاع آباد اور خطیب پاکستان قاضی احسان احمد مرحوم جیسے ہزاروں مشاہیر آپ کی جوتیاں سیدھی کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ افغانستان، ایران اور پاک و ہند کے ہر گوشے سے منتہی علماء کالے کوسوں کا سفر طے کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور شرف تلمذ حاصل کرتے تھے!

جام اسماعیل خان اور سردار حاجی خان کے ہمراہ تیسرا سردار جو کیچ سے ملتان آیا تھا۔ وہ سردار فتح خان کلاچی تھا۔ اس نے ڈیرہ فتح خان کے نام سے ایک شہر کی بنیاد رکھی اور اپنی قوم کو اس میں لا کر آباد کیا۔ داخلی طور پر اگرچہ فتح خان اپنی ریاست کے سفید وسیاہ کا مختار رہا۔ مگر خارجہ پالیسی میں ہمیشہ ہوت حکومت کے زیر اثر رہا۔ کم وبیش دو اڑھائی سو سال فتح خان کی اولاد نے ہوت حکمرانوں کے زیر سایہ اپنی ریاست میں فرمانروائی کی اور جب نواب نصرت خان کے اقبال کا ستارہ غروب ہو گیا تو ڈیرہ فتح خان کے مطلع پر بھی ادبار چھا گئے۔ پٹھانوں نے ڈیرہ اسماعیل خان کے ساتھ اس علاقے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ حملہ آوروں کے تشدد سے تنگ آ کر نواب فتح خان کے متعلقین اپنے باپ دادا کی زمینیں چھوڑ کر دولت والا کی طرف منتقل ہو آئے۔ کئی گھرانے یہاں رہ پڑے اور کئی لیہ اور کوٹ ادو کی طرف چلے آئے۔

سردار احمد خان کلاچی: ان مہاجرین میں ممتاز خاندان سردار احمد خان کا تھا۔ وہ ملتان کے صوبیدار نواب شجاع خان کے ہاں ملازم ہو گیا تھا اور جب ملتان پر سکھوں نے حملہ کیا تو اس نے اس جنگ میں بڑی دلیری اور شجاعت کا ثبوت دیا۔ سکھوں کو شکست ہوئی اور بقیہ السیف کو سردار احمد خان گرفتار کر کے شجاع آباد لے گئے۔ نواب شجاع خان سردار احمد خان کے اس کارنامے پر بڑے خوش ہوئے اور انہوں نے اسے امور مملکت میں اپنا معتمد خصوصی بنا لیا۔ مگر تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ نواب شجاع خان اور ان کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے اور یہ مخالفت اتنی بڑھی کہ سردار احمد خان کو جان کے لالے پڑ گئے۔ وہ کوٹ شجاع آباد سے فرار ہو کر نواب پور پہنچے اور سادات گردیز کی پناہ میں زندگی کے بقیہ ایام بسر کر کے فوت ہو گئے۔ اس

خاندان کے کچھ افراد اب تک نواب پور کے مضافات میں آباد ہیں۔

سردار احمد خان کے ایک فرزند زیادت خان تھے اور وہ ضلع مظفر گڑھ میں ہی موضع شرتی ارائیں تحصیل کوٹ ادو میں آباد تھے۔انہیں قرآن وحدیث کے علاوہ فارسی نظم پر ''گلستان'' تک عبور حاصل تھا۔سردار زیادت خان کے پاس اونٹوں کا زبردست گلہ اور بھیڑوں کا بہت بڑا ریوڑ تھا۔ ان کے چرانے پر بے شمار نوکر مقرر تھے۔سردار زیادت خان اسی سال کی عمر پا کر راہگرائے عالم جاودانی ہوئے۔

مولانا اللہ وسایا کلاچی رحمۃ اللہ علیہ: سردار زیادت خان کا صاحبزادہ سردار خان تھا۔وہ بھی اپنا زمانہ اچھا گزار گیا۔ان کے فرزند ارجمند سردار شریف محمد خان تھے۔ ان کے مشکوے معلیٰ میں حضرت مولانا اللہ وسایا خان علیہ الرحمتہ پیدا ہوئے جنہوں نے اس خاندان کو علم وفضل کے لحاظ سے اوج ثریا تک پہنچا دیا۔

تعلیم وتربیت: اس وقت تک یہ خاندان حضرت مخدوم لعل عیسن رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد امجاد کا مرید چلا آتا تھا۔حضرت مولانا قرآن مجید کی تعلیم سے فارغ ہو کر تونسہ شریف حضرت خواجہ اللہ بخش صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہو کر مرید ہوئے اور دُعا کی درخواست کی۔

خواجہ صاحب نے جوش میں آکر فرمایا:

''اے اللہ وسایا تجھے اللہ ایسا ''وسائے گا'' (بسائے گا) کہ تمام ملک کے مخدوم، سید، نواب اور ان کے بیٹے تیرے دروازے سے فیض حاصل کریں گے''۔

چنانچہ آپ سات سال تک ضلع مظفر گڑھ کے مختلف دینی مدارس میں علوم دینیہ کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔زاں بعد آپ بھونگ تشریف لے گئے اور مولانا نذر محمد صاحب علیہ الرحمتہ کی خدمت میں زانوئے تلمذتہ کر کے درس نظامی کو مکمل کیا اور پھر دیو بند جا کر باقاعدہ تحصیل علوم کی اور سند حاصل کر کے واپس تشریف لے آئے۔

مسند تدریس: دیو بند سے واپسی پر آپ نے جلال پور پیر والا کے قریب چاہ پیر والہ پر دینی مدرسہ کی بنیاد رکھی اور کم وبیش ستائیس سال آپ نے یہاں درس دیا۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ اس کے بعد آپ نے اس مقام کو کیوں چھوڑ دیا۔ بہر حال یہاں سے آپ شجاع آباد کے قریب موضع جائی میں منتقل ہو گئے۔ اس جگہ کامل ۷ ۴ سال درس دیا اور ہزاروں تشنگان علوم کو علوم ظاہری وباطنی کی نعمت سے مالا مال کیا۔ آپ صرف عالم ہی نہیں تھے بلکہ خدا یاد درویش بھی تھے۔ جس کے حق میں کلمہ خیر نکل گیا وہ دین ودنیا کی سعادتوں کو لپیٹ گیا اور جس پر سے نظر شفقت ہٹی۔ وہ دین ودنیا دونوں سے گیا۔

حضرت مولانا اگر چہ دیو بند کے فارغ التحصیل تھے۔ مگر ان کی طبیعت میں دیو بندیت کم اور درویشی زیادہ تھی۔ اکثر مشائخ کے اعراس میں شرکت کرتے اور ان سے فیوض وبرکات حاصل کرتے تھے۔ آخری عمر میں آپ کو پیشاب کا عارضہ لاحق ہو گیا اور یہی مرض جان لیوا ثابت ہوا۔ تقریباً ۱۹۴۰ء میں آپ نے عالم فانی سے عالم باقی کو انتقال فرمایا اور خانقاہ حضرت خواجہ محمد عیسیٰ رحمتہ اللہ علیہ خان پوری کے زیر سایہ دفن کئے گئے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کا خاندان بہاولپور منتقل ہو آیا۔ چنانچہ آپ کی اولاد امجاد اب ریلوے اسٹیشن بہاولپور کے مغرب میں سکونت پذیر ہے۔

آپ کے دو صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں تھیں۔ جن میں سے مولانا محمد حسن فوت ہو چکے ہیں۔ علامہ حافظ محمد احسن صاحب زندہ موجود ہیں اور علم وعمل کے لحاظ سے اپنے والد بزرگوار کی صحیح تصویر ہیں۔ آپ جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں عربی کے اُستاد ہیں اور بقیہ وقت اپنے گھر کی مسجد میں درس دیتے ہیں۔

کلاچی قبائل منتشر حالت میں بکھرے پڑے ہیں۔ ایک خاندان ڈیرہ اسماعیل خان کے مضافات میں آباد ہے۔ جس کے سربراہ سردار عزیز الرحمن خان صاحب بھائی ایڈووکیٹ ہیں۔ دوسرا خاندان لیہ میں ڈاکٹر غلام محمد خان بلوچ مرحوم کا ہے۔ یہ لیہ میں آباد ہے۔

منکیرہ

رات کے وقت داؤد خان نواب غازی خان کے خیمے میں گھس گیا۔ اگرچہ یہ بڑی آسانی سے اسے قتل کر سکتا تھا، مگر اس نے نواب غازی خان دوم کو بیدار کر کے کہا کہ چونکہ آپ قوم کے نیل نام سردار ہیں اس لئے میں آپ کو قتل کرنا نہیں چاہتا۔آپ اپنے دارالحکومت کو واپس تشریف لے جائیں!

شجرۂ نسب سرداران منکیرہ

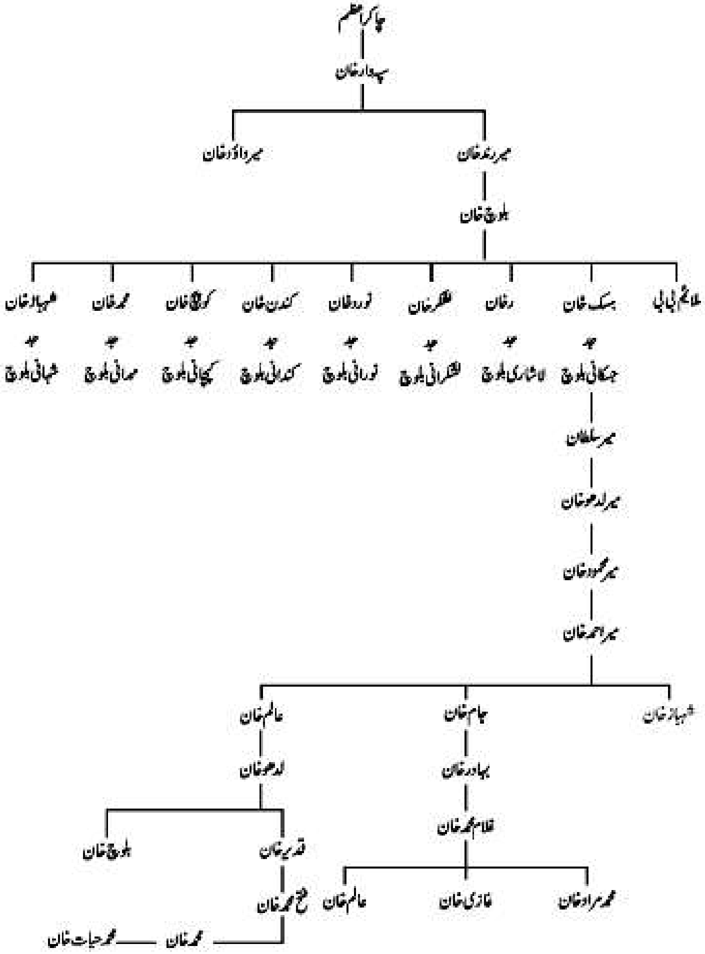

میر چاکر اعظم جب ہمایوں کی امداد کے لئے کوہ سلیمان کی تلہٹی سے دہلی کو روانہ ہونے لگے تو انہوں نے اپنے ایک فرزند میر سپہ دار خان کو اپنے اہل وعیال کی خبر گیری پر مقرر کیا تھا۔ چنانچہ دہلی فتح ہونے کے بعد بھی یہ اسی جگہ آباد رہے۔ ان کے صاحبزادے میر رند کو نواب غازی خان نے بھکر کی حکومت عطا کی جس پر ان کا پورا خاندان اس شہر میں منتقل ہو آیا۔ میر رند اپنی وفات تک بھکر کی حکومت پر فائز رہے۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے میر محمد داؤد خان نے بھکر کی حکومت کے لئے نواب غازی خان سے درخواست کی۔ مگر نواب صاحب نے امراء کے بہکانے پر انکار کر دیا۔ جس پر میر داؤد خان باغی ہو گیا۔ اس نے وارہ گشکوری کو اپنا مستقر بنایا اور میرانی اور ہوت مقبوضات پر حملے کرنے لگا۔

سردار محمد داؤد خان بلوچ

داؤد خان بڑا بہادر اور منچلا نوجوان تھا۔ ایک روایت کے بموجب پانچ سو سوار اس کے جلو میں چلتے تھے۔ اس نے بہت جلد ایک چھوٹی سی ریاست بنا لی اور بڑی عقل و دانش اور فہم و تدبر سے اسے آباد کرنے میں مصروف ہوا۔ ایک موقع پر جب نواب غازی خان دوم لاؤ لشکر لے کر اس پر چڑھ آیا تو اس نے اس پر نہایت کامیاب شب خون مارا۔ نواب ”محمد راجنؒ“ کے مقام پر خیمہ زن تھا۔ رات کے وقت داؤد خان اس کے خیمے میں گھس گیا۔ اگر چہ یہ بڑی آسانی سے نواب کو قتل کر سکتا تھا۔ مگر اس نے نواب کو بیدار کر کے کہا کہ چونکہ آپ قوم کے نیک نام سردار ہیں اس لئے میں آپ کو قتل کرنا نہیں چاہتا۔ آپ اپنے دارالحکومت کو واپس تشریف لے جائیں۔ نواب

غازی خان نے پہرہ والوں کو ان کی غفلت پر خوب سزا دی اور حریف کی اس مروت کے عوض محاصرہ اٹھا کر اپنے دارالحکومت کو لوٹ گیا۔اس واقعہ سے داؤد خان کا حوصلہ بڑھ گیا اور غازی خان کے جانے کے بعد اس نے بڑی شدت سے میرانیوں اور ہوتوں پر حملے شروع کر دیئے اور ان کی ناک میں دم کر دیا۔داؤد خان کی سینہ زوری اور بہادری کے گیت آج تک اس علاقے میں گائے جاتے ہیں۔ایک شعر درج ذیل ہے۔

داؤد میر دارہ اندر دیندا دنگے　　ہوتاں تے مرانیاں کولوں تت براتیں منگے

داؤد خان کا قتل

جب ہوت حکمران اور نواب غازی خان نے دیکھا کہ داؤد خان کو قابو میں لانا ان کے بس کی بات نہیں تو انہوں نے متفقہ طور پر مغل شہنشاہ سے امداد کیلئے درخواست کی۔اکبر کا زمانہ تھا۔اس نے داؤد خان کی سرکوبی کیلئے بارہ ہزار کا لشکر جرار روانہ کیا۔داؤد خان کے پاس صرف پانچ سو سوار تھے۔اتنی قلیل فوج کے ساتھ تین طاقتوں سے ٹکرانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔رفیقوں نے اسے کوہ سلیمان میں پناہ لینے کا مشورہ دیا اور اس میں قطعاً کوئی شبہ نہیں کہ اگر داؤد خان پہاڑ میں چلا جاتا تو یہ تینوں لشکر اس کا کچھ بگاڑ نہ سکتے۔مگر اس طرح چھپنا داؤد خان نے مردانگی کیخلاف جانا۔وہ ایک رات قضائے مبرم کی طرح شاہی لشکر پر ٹوٹ پڑا اور اس کے بے شمار سپاہی گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیئے لیکن شاہی لشکر نے بھی خوب مردانگی دکھائی۔اس غیر مساوی مقابلے میں داؤد خان انتہائی بہادری سے رفیقوں سمیت لڑتا ہوا مارا گیا اور اس کی لاش حضرت مخدوم محمد راجنؒ کے قبرستان میں دفن کر دی گئی۔داؤد خان کے قتل پر جسکانی کلیتہً کمزور ہو گئے اور انہوں نے نواب غازی خان کی اطاعت قبول کر لی۔

میر بلوچ خان اوّل

شاہجہانی دور میں میر داؤد خان کے نامور بھتیجے میر بلوچ خان نے غیر معمولی شہرت حاصل کرلی اور ہر طرف اس کی بہادری کے چرچے ہونے لگے۔ اتفاق سے ان ایام میں ایرانی لشکر ملتان فتح کرنے کے ارادہ سے دریائے سندھ کے غربی کنارے پر آ کر خیمہ زن ہوا۔ ادھر سے مغل شہزادے نے اپنے لشکر کو مشرقی کنارے پر جما دیا۔ ابھی مقابلے کی نوبت نہ آئی تھی کہ ایرانی سپہ سالار نے کہلا بھیجا کہ ایک ایرانی اور ایک ہندی سردار دریا کے وسط میں آ کر جنگ لڑیں۔ اگر مغل سوار غالب آئے تو ایرانی لشکر واپس چلا جائے گا اور اگر ایرانی سوار کامیاب ہو تو سندھ کے مشرقی ملک پر ہمارا قبضہ تسلیم کرلیا جائے۔ یہ صورت چونکہ خاصی مشکل تھی۔ اس لئے مغل شہزادہ سوچ میں پڑ گیا۔ اسی اثناء میں دفعتہ ایک نوجوان نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں ایرانی سردار سے دریا میں جنگ کروں گا۔ یہ نوجوان میر بلوچ خان تھا۔ مغل شہزادے کا چہرہ خوشی سے جگمگا اٹھا۔ اس نے بلوچ خان کی اس جرات وجسارت پر تحسین و آفرین کی اور اسے ایرانی سردار سے جنگ لڑنے کی اجازت دے دی۔

بلوچ خان نے اپنا گھوڑا منگوایا اور اس پر سوار ہو کر دریا کی طرف لپکا۔ گھوڑا تیر کی طرح دریا کو چیرتا ہوا ایرانی سردار کے قریب پہنچ گیا اور لڑائی شروع ہوگئی۔ ایرانی سردار نے خاصے وزنی وار کئے مگر وہ بلوچ خان کا بال بھی بیکا نہ کرسکا۔ جب بلوچ خان نے پوری قوت سے حملہ کیا تو ایرانی سردار بوکھلا گیا اور پسپا ہو کر بھاگ نکلا۔ ایرانی سردار کے بھاگتے ہی مغل لشکر میں فتح و نصرت کے شادیانے بجنے لگے۔ بلوچ خان فاتحانہ انداز میں گھوڑے کو دوڑاتا شہزادے کی خدمت میں حاضر ہوا۔ امرائے لشکر نے بڑھ کر تحسین وآفرین کے ڈونگرے برسائے۔ شہزادے نے لپک کر بلوچ خان کو گلے سے لگایا اور کہا: بلوچ خان کارے کردی مرداں چنیں کنند بگو چہ مے خواہی''۔

بلوچ خان نے دست بستہ عرض کی کہ کچھ اراضی عطا فرمائی جائے۔ جس میں بال بچوں کے لئے جھونپڑے بنا سکوں! مغل شہزادے نے کہا ایسا کرو کہ اپنی اونٹنی پر سوار ہو جاؤ اور دن بھر میں جس قدر اراضی اپنے قبضے میں لے سکتے ہو، لے لو! یہ سنتے ہی بلوچ خان اپنی اونٹی پر سوار ہوا اور اس نے شمالا جنوباً جال والا تا لیہ اور شرقاً غرباً موضع کھولی تا دریائے سندھ ایک وسیع رقبہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ جواب بھکر تحصیل پر مشتمل ہے، کہتے ہیں کہ جب بلوچ خان موضع کھولی پہنچا تو اس کی اونٹنی گر کر مر گئی۔ چنانچہ یہ مقام لاش بختی سے موسوم ہے۔ میر بلوچ خان نے بقیہ ایام اس علاقے میں بڑے سکون واطمینان سے حکومت کی۔ سال میں کچھ عرصہ منکیرہ میں اور کچھ عرصہ بھکر میں اجلاس کرتا تھا۔ یہ دونوں مضبوط قلعے تھے اور دونوں کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

میر بلوچ خان کی اولاد

میر بلوچ خان کے آٹھ صاحبزادے تھے۔ خدا نے ان کی اولاد میں بڑی برکت بخشی۔ یہاں تک کہ ہر شخص اپنے اپنے قبیلے کا مورث بن گیا۔ میر بلوچ خان کے صاحبزادوں اور ان سے منسوب قبائل کی تفصیل درج ذیل ہے۔

میر جسک خان ______ جسکانی	میر لاشار خان ________ لاشاری
میر لشکر خان ______ لشکرانی	میر نورا خان ______ نورانی
میر کندن خان ______ کندانی	میر کوچچ خان ________ کپچانی
میر محمد خان ______ ممدانی	میر شہباز خان ________ شہانی

ملائم بی بی

میر بلوچ خان کی ایک لڑکی ملائم بی بی تھی اور وہ سب سے بڑی تھی۔ باپ کی موجودگی میں وہ گھر کی مالک و مختار تھی اور میر صاحب اس کے مشورہ کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ بھائیوں کی اس بی بی نے بمثل اولاد کے پرورش کی تھی۔ جب میر بلوچ خان کا انتقال ہوا تو سب نے یہی فیصلہ کیا کہ چونکہ ملائم بی بی ہم سب کی مخدومہ ہے۔ اس لئے ریاست کا انتظام اس کے سپرد کیا جائے۔ چنانچہ ملائم بی بی کے شوہر عبداللہ خان کی دستار بندی کرائی گئی۔ جب تک بی بی زندہ رہی عبداللہ خان حکومت کرتا رہا۔

نواب جسک خان

ملائم بی بی کے انتقال پر بھائیوں نے میر جسک خان کو مسند نشین کیا۔ یہ بہادر اور اولعزم انسان تھا۔ اس نے اپنی ریاست کو وسعت دینے میں بڑی کوشش کی۔ کہتے ہیں کہ اس نے تخت نشین ہوتے ہی اپنی مختصر سی فوج سے کروڑ کا رخ کیا اور جاتے ہی اس عظیم شہر کا محاصرہ کر لیا اور ابھی مقابلے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ جسک خان کو پیغام اجل آ پہنچا اور لشکر بے نیل و مرام واپس لوٹ آیا۔

جسک خان کی وفات کا واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ نواب ایک دن علی الصبح اپنے بالوں کو کنگھی کر رہا تھا۔ سر کے تمام بال آنکھوں پر پڑے ہوئے تھے کہ دفعتہً ایک مینڈھا جو لڑائی دیکھنے کیلئے پرورش کیا ہوا تھا۔ رسی تڑوا کر نواب پر حملہ آور ہوا اور ایک دو ٹکریں ایسی لگائیں کہ مغز باہر نکل آیا اور نواب اسی وقت ٹھنڈا ہو گیا۔

بلوچ خان ثانی المتوفی ۱۷۶۸ء

میر جسک خان کے بعد اس کے بیٹے سلطان خان کی دستار بندی ہوئی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے لدھو خان، محمود خان، احمد خان، شہباز خان اس ریاست پر حکمران رہے۔ ان کے دور کا کوئی خاص واقعہ قابل ذکر نہیں۔ البتہ جب لدھو خان کا بلند اقبال صاحبزادہ میر بلوچ خان مسند نشین ہوا تو اس نے ایک دفعہ پھر داؤد خان کی یاد تازہ کردی۔ حسن اتفاق سے اس کے زمانے میں برخوردار خان گوجر صوبیدار ڈیرہ غازی خان مر گیا اور یہ ملک لاوارث ہو کر رہ گیا۔ میر بلوچ خان نے موقع کو غنیمت جان کر ۱۱۹۲ھ میں لیہ سے محمود کوٹ تک کا علاقہ اپنی حکومت میں شامل کرلیا۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ میر صاحب پیدائشی نابینا تھے یا مسند نشینی کے بعد نور بصارت سے محروم ہوئے تھے۔ مگر ان کے نابینا ہونے میں کلام نہیں۔ اس کے باوجود سب تسلیم کرتے ہیں کہ اس نے ریاست کا بہت اچھا انتظام کیا تھا لیکن اسے حکومت کرتے ابھی چند سال ہی گزرے تھے کہ کلور کوٹ کی طرف سے گڑھ مہاراجہ کے سکھ سردار جھنڈا سنگھ اور گنڈا سنگھ اس ملک پر حملہ آور ہوئے۔ بلوچ خان نابینا ہونے کے باوجود مقابلے پر نکلا۔ خوب داد مردانگی دی۔ مگر چونکہ سکھوں کی طاقت کئی گناہ زیادہ تھی۔ اس لئے شکست کھائی۔ کچھ عرصہ میر بلوچ خان نے حسرت و ناکامی میں گزارا اور ۱۷۶۸ء میں دار فنا سے عالم بقا کو رخصت ہو گیا۔ مورخین کا کہنا ہے کہ میر بلوچ خان نابینا نہ ہوتا تو سکھوں کو اس ملک پر حملہ کرنے کی جرآت ہی نہ ہوتی۔ گویا بصارت سے محرومی میر بلوچ خان کی بڑی کمزوری تھی۔ جس نے شکست کھانے کے بعد پھر اسے ابھرنے کا موقع نہ دیا۔ بھکر میں کھجوروں کے دو درخت جھنڈا سنگھ اور گنڈا سنگھ سے موسوم ہیں۔ اس سے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان دونوں سرداروں نے بھکر فتح کرنے کے بعد کافی وقت اس شہر میں گزارا ہوگا۔

(ڈسٹرکٹ گزیٹر، ڈیرہ اسماعیل خان)

نواب فتح خان (۱۷۶۸ء تا ۱۷۷۰ء)

نواب فتح خان کو ڈسٹرکٹ گزیٹر ڈیرہ اسماعیل خان میں نواب بلوچ خان کا بیٹا ظاہر کیا گیا ہے۔ لیکن شجرات سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب بلوچ خان لاولد تھے اور فتح خان اس کے بڑے بھائی سردار قدیر خان کا لڑکا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ نواب بلوچ خان نے بے اولاد ہونے کے سبب فتح خان کو متبنیٰ بنالیا ہو بہرحال فتح خان ہر لحاظ سے نواب مرحوم کا وارث اور ریاست کا صحیح حق دار تھا۔ مگر سردار غلام محمد خان کا بیٹا سردار محمد مراد خان، مدعی ریاست بن کر مقابلے میں نکل آیا لیکن فتح خان امیر تیمور خان دُرانی والی کابل کی مدد سے کامیاب ہو گیا اور اطمینان سے امور مملکت انجام دینے لگا۔ ان دنوں ڈیرہ اسماعیل خان کے ہوت فرمانروا جام نصرت خان کو گنڈہ پوروں نے تنگ کر رکھا تھا اور اس کی حکومت صرف ڈیرہ کے مضافات تک رہ گئی تھی۔ اس نے فتح خان کو کمزور پا کر اچانک قلعہ بھکر پر حملہ کر دیا۔ یہ شہر جسکانی ریاست کی حدود میں تھا اور سردار فتح خان فرمانروائے منکیرہ کا ولی عہد نصرت خان اس کا حاکم تھا۔ اگرچہ اس کی فوج تھوڑی تھی مگر شیر کی طرح گرج کر کچھار سے نکلا اور بڑی بہادری سے لڑتا ہوا گرفتار ہو گیا۔ میر نصرت خان ہوت بھکر کو فتح کر کے فتح ونصرت کے شادیانے بجاتا واپس لوٹ گیا۔ جب یہ وحشت ناک خبر فتح خان کو ملی تو اس نے بیٹے کی رہائی کے لئے ڈیرہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا مگر چونکہ اس کی فوج تھوڑی تھی۔ اس لئے اس نے اپنے وزیر حسن خان لشکرانی کے مشورے سے فیصلہ کیا کہ پہلے فوج کو بڑھا کر مقابلے کی اچھی طرح سے تیاری کرلے مگر ماں کی مامتا اس التوا کو کب برداشت کرسکتی تھی۔ وہ شدت غم سے بے تاب ہو کر خود ڈیرہ کو روانہ ہوگئی چونکہ بلوچوں کا شروع سے یہ دستور چلا آتا تھا وہ بلوچ خواتین کی معروضات کو نظرانداز نہیں کرتے تھے۔ بالعموم ملزموں کی رہائی کے سلسلے میں بلوچ بی بیوں کی درخواست بڑی مؤثر ثابت ہوتی تھی۔ نواب فتح خان کی بیگم کو بھی امید تھی کہ نواب

نصرت خان اس کی درخواست کورد نہیں کرے گا بلکہ دیکھتے ہی اس کا لعل لوٹا دے گا۔ چنانچہ اس قسم کی کئی امیدیں نواب سے وابستہ کئے دارالحکومت جا پہنچی لیکن نتیجہ اس کے خلاف نکلا کہ وہ اس بی بی کو بھی قید کرنے پر آمادہ ہو گیا سردار فتح خان کی اہلیہ نے جب دربار کا یہ رنگ دیکھا تو وہ کسی بہانے باہر کھسک آئی اور رات کو زہر کھا کر مر گئی۔ صبح کو نصرت خان نے جب یہ واقعہ سنا تو وہ دم بخود رہ گیا اور اس نے اسی وقت نوابزادہ نصرت خان کو رہا کر دیا۔ اسے والدہ کی خودکشی کی خبر ہوئی تو اس نے بھی شرم کے مارے زہر کھالی۔ اس حادثے سے سارے شہر میں نواب کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ بیوی اور بیٹے کی لاشیں جب منکیرہ پہنچیں تو وہاں کہرام برپا ہو گیا۔

نواب فتح خان نے بڑے صبر و سکون سے ان دونوں لاشوں کو ٹھکانے لگایا اعزاء و اقارب سے کہا سنا معاف کرا کر رات کو پلنگ پر ایسا سویا کہ پھر نہ اٹھا۔ یہ واقعہ ایسا نہ تھا کہ لوگ سنتے اور چپ رہ جاتے۔ منکیرہ کے چھوٹے بڑے سب پر جوش سے دیوانگی طاری ہو گئی۔ شہر کے در و دیوار سے انتقام انتقام کی صدا سنائی دینے لگی۔ میر حسن خان لشکرانی جو نواب کا وزیر تھا۔ اس نے انتقام کی قسم کھائی اور اپنے ایک قریبی رشتہ دار سردار جہان خان کو تحفے تحائف اور نذرانے دے کر ایک عرضداشت کے ہمراہ کابل روانہ کیا۔ وہاں سے نواب قمر الدین کے نام پروانہ آیا کہ نواب نصرت خان کو گرفتار کر کے کابل بھیج دو۔ چنانچہ ڈیرہ اسماعیل خان کا آخری ہوت فرمانروا انتہائی ذلت کے ساتھ گرفتار کر کے کابل بھیج دیا گیا۔

میر حسن خان لشکرانی (۱۷۷۰ء تا ۱۷۷۹ء)

نواب فتح خان کے صاحبزادے محمد حیات خان اور محمد خان صغیر سن تھے۔ اس لئے میر حسن خان، سردار محمد حیات خان کی دستار بندی کر کے اس کی طرف سے قائم مقام ہو کر حکومت کرنے لگا کچھ عرصہ تو اس نے اچھا کام کیا لیکن آخر میں ریاست کی ہوس اس کے دل میں سما گئی اور خود نوابی

کے خواب دیکھنے لگا۔ محمد حیات خان اب جوان ہو چکا تھا مگر اس کو میر حسن نے نظر بندوں کی طرح حراست میں رکھ لیا اور حکم دیا کہ اس کی اجازت کے بغیر اسے کہیں آنے جانے نہ دیا جائے۔

محمد حیات خان نے جب دیکھا کہ میر حسن مستقل طور پر اس کی راہ میں حائل ہو چکا ہے تو اس نے اپنے آپ کو دیوانہ بنا لیا تا کہ حسن خان کو اس سے تسلی ہو جائے اس نے در پردہ اہل برادری کو اس سے توڑ کر اپنے ساتھ ملانا شروع کیا اور یہ بات کچھ مشکل بھی نہیں تھی کیونکہ یہ فتح خان کا لڑکا اور ریاست کا حق دار تھا اور میر حسن کو ریاست پر قبضہ کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ جب محمد حیات خان نے اپنے حامیوں کی ایک جماعت تیار کر لی تو ایک روز اس نے میر حسن سے کروڑ جانے کی اجازت لی اور ظاہر کیا کہ وہ حضرت مخدوم لعل عیسن علیہ الرحمتہ کی زیارت کرنے جا رہا ہے لیکن بھکر سے بجائے کروڑ جانے کے منکیرہ جا پہنچا اور مع ساتھیوں کے قلعہ کے متصل جنگل میں دبک کر بیٹھ گیا۔ علی الصبح جونہی دروازہ کھلا حملہ کر کے قلعے پر قابض ہو گیا۔ اس خبر کے مشہور ہوتے ہی اس کے باپ کے بہت سے نمک حلال ملازم اس سے آملے۔ ادھر میر حسن کو علم ہوا تو وہ فوج لے کر مقابلے کو نکلا۔ قصبہ نوتک کے جنوب میں دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے۔ خوب جنگ ہوئی۔ انجام کار حسن خان کو شکست ہوئی اور وہ زندہ گرفتار کر لیا گیا۔ محمد حیات خان کے خیر خواہوں نے عرض کی کہ حضور اس کو قتل کر کے بے خلش حکومت کریں۔ مگر محمد حیات نے ازراہ دور اندیشی قتل میں بدنامی دیکھ کر اسے قلعہ بھکر میں قید کر دیا۔ جب کچھ عرصہ گزر گیا تو ایک دن محمد حیات خان، حضرت محمد راجن کی زیارت کے قصد سے روانہ ہوا اور پیچھے چند ملازمین کو سمجھا گیا کہ اسے زہر دے کر ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ محمد حیات خان محمد راجنؒ میں بیٹھا پل پل کی خبریں منگوا رہا تھا۔ مگر جونہی اس واقعہ کی اطلاع ملی تو ظاہراً ایسی غمناک صورت بنا کر بھکر کو روانہ ہوا۔ گویا یہ حادثہ اس کے حکم سے نہیں ہوا۔ بھکر پہنچتے ہی محمد حیات خان نے حسن خان کے قاتلوں کو قید کر دیا اور چند دنوں کے بعد جونہی بلوچوں کا دلی جوش ٹھنڈا ہوا ان لوگوں کو رہا کر دیا۔

نواب محمد حیات خان (۱۷۷۹ء تا ۱۷۸۷ء)

نواب محمد حیات خان اگرچہ نوجوان آدمی تھا۔ مگر بڑا سمجھدار ثابت ہوا اور بخت کی یاوری سے علی خان گشکوری وزیر بھی ایسا ملا جو دل و جان سے اس کا خیر خواہ تھا۔ اس کی دانائی اور عقلمندی کے کئی قصے زباں زد خواص و عام ہیں۔ محمد حیات خان کو حکومت کرتے ابھی چند سال ہی ہوئے تھے کہ ایک ایسا وقوعہ ظہور میں آیا۔ جس نے محمد حیات خان کی شمع حیات ہی گل کردی۔ بات یہ ہوئی کہ سید گل محمد نبیرہ سید عیسیٰ عبدالوہاب علیہ الرحمتہ نے دریائے چناب کے کنارے ایک بستی میں اپنی حکومت کا اعلان کردیا اور چند مواضعات اپنے قبضہ میں لے لئے۔ شاہ کابل کو خبر ملی تو اس نے نواب محمد حیات خان کے نام حکم نامہ بھیجا کہ گل محمد شاہ کو قید کر کے کابل بھیج دو!

نواب محمد حیات خان نے شہنشاہی حکم کے مطابق سید گل محمد شاہ پر چڑھائی کی۔ وہ بھی اپنے مریدوں کو جمع کر کے مقابلے پر نکل آئے۔ نواب محمد حیات خان کی فوج میں بہت سے سپاہی ایسے تھے جو حضرت گل محمد شاہ کے مرید تھے۔ لڑائی شروع نہیں ہوئی تھی کہ یہ لوگ فقیر صاحب کے لشکر سے مل گئے۔ یہ حال دیکھ کر نواب محمد حیات خان بلا مقابلہ بھکر کو واپس چلا آیا اور دوبارہ لڑائی کی تیاری کرنے لگا گولہ خان سرگانی نے جو محمد حیات خان کی فوج میں نامی گرامی سردار تھا۔ وہ فقیر صاحب کا مخلص مرید تھا۔ اس نے جب دوبارہ نواب کو شاہ صاحب سے جنگ کرنے کی تیاریوں میں مصروف پایا تو اس نے ارادہ کیا کہ محمد حیات خان کو قتل کردے۔ اس لئے ایک دن اس نے محمد حیات خان پر جبکہ وہ منکیرہ کو جارہا تھا حملہ کرنے کی کوشش بھی کی۔ مگر یہ وار کارگر نہ ہوا اور محمد حیات خان صحیح سلامت منکیرہ پہنچ گیا۔ نواب کے ایک خدمت گار بکھی نے جس پر سرگانیوں کی بدنیتی کا راز فاش ہو چکا تھا۔ اپنے آقا کو ان کے ارادہ فاسد سے آگاہ کیا مگر چونکہ اس کی اجل آپہنچی تھی۔ کچھ تدارک نہ کرسکا۔ آخر ۱۲۰۴ھ میں جبکہ نواب اپنے محل میں بے خبر پڑا سو

رہا تھا۔ گولہ خان سرگانی نے اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ داخل ہو کر اسے قتل کر دیا اور قلعے پر قابض ہو گیا۔

نواب محمد خان جسکانی

بھکر میں نواب کے قتل کی اطلاع پہنچی تو جسکانی بزرگوں نے جمع ہو کر مقتول کے چھوٹے بھائی سردار محمد خان کو مسند ریاست پر متمکن کیا۔ نواب محمد خان نے اختیارات سنبھالتے ہی دیوان لدھارام کو سرگانی قوم کی سرکوبی پر تعینات کیا۔ اس نے بلاتوقف اس جانب یلغار کی اور قلعہ منکیرہ کا محاصرہ کر لیا۔ سرگانی اس قلعہ سے نکل کر قلعہ نواں کوٹ میں جا چھپے اور جب اس قلعے کا محاصرہ ہوا تو قلعہ منڈہ میں منتقل ہو گئے اور جب فوج نے یہاں بھی نہ چھوڑا تو قلعے سے نکل کر اس پر ٹوٹ پڑے اور خوب جان توڑ کر لڑے۔ مگر شکست کھائی گولہ خان اپنے رفیقوں سمیت اسی جگہ مارا گیا اور باقی سرگانیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

سرگانیوں کی کلہوڑوں سے مراسلت

سرگانی امراء نے نصرت خان کو اپنے قبائل کا سربراہ مقرر کیا تھا چونکہ جسکانی، گولہ خان کے قاتل تھے اور پھر انہوں نے ان سے شیر گڑھ اور منڈا قلعے جو پہلے انہیں جاگیر کے طور پر دے رکھے تھے واپس لے لئے تھے۔ اس لئے نصرت خان سرگانی نے میاں نور محمد کلہوڑہ حاکم سندھ کے پاس اپنا وکیل بھیج کر اسے اس بات کی ترغیب دی کہ اگر وہ ریاست جسکانی پر چڑھائی کرے تو باآسانی فتح کر لے گا۔ میاں نور محمد ان دنوں ڈیرہ غازی خان آیا ہوا تھا۔ وہ بلاتوقف فوج لے کر جسکانیوں پر چڑھ آیا۔ چونکہ اس وقت جسکانی آپس میں دست بگریباں تھے۔ اس لئے نواب محمد خان نے اس کی اطاعت قبول کر لی اور چہارم بطور تاوان دینا منظور کیا۔ میاں نور محمد کلہوڑہ بعد وصولی نذرانہ محمد خان کو حکومت پر بحال رکھ کر اپنے ملک کو واپس چلا گیا چند سال بعد جب تالپوروں نے کلہوڑوں سے سندھ کا ملک چھین لیا تو معزول حکمران عبدالنبی سرائی کو اس ملک کا

خیال آیا چنانچہ اس نے کابل جا کر بعد ادائی نذرانہ لیہ کی سند اپنے نام حاصل کرلی۔ فوج لے کر لیہ پر چڑھ آیا اور معمولی جھڑپ کے بعد اس پر قبضہ کرلیا۔ محمد خان ٹوانوں کے ہاں منتقل ہو گیا اور چند دنوں کے بعد اس نے شاہ کابل سے لیہ کی دوبارہ سند حاصل کرلی۔ مگر چونکہ دخل لینے کے لئے اس کے پاس کافی فوج نہ تھی۔ اس لئے نواب بہاولپور سے طالب امداد ہوا۔ نواب صاحب بہاول پور اسے ریاست بھکر کا صحیح حقدار جانتے تھے۔ اس لئے امداد دینے پر رضا مند ہو گئے لیکن ابھی ایفائے وعدہ نہ ہوا تھا کہ دونوں کا آپس میں بگاڑ ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ نواب محمد خان کے پاس ایک کتاب ''بازنامہ'' تھی وہ اس سے نواب صادق محمد خان نے طلب کی۔ محمد خان نے اگرچہ کتاب دینے سے انکار نہ کیا لیکن اپنے مکان پر آ کر دوران گفتگو کہہ بیٹھا کہ ''بازنامہ'' داؤد پوترہ کے کس کام آئے گا۔ یہ بات کسی نے نواب بہاولپور تک پہنچا دی۔ اس سے نواب صاحب کا مزاج برہم ہو گیا اور اس نے امداد دینے سے انکار کردیا۔ محمد خان مایوس ہو کر منگروٹھہ (ڈیرہ غازی خان) میں سردار اسد خان نتکانی کے پاس چلا آیا اور بقیہ زندگی یہیں بسر کی۔

ڈسٹرکٹ گزیٹر ڈیرہ اسماعیل خان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۷۸ء میں اس خاندان کا آخری سربراہ سردار امام بخش خان تھا جو منگروٹھہ میں رہتا تھا اور اسے پنجاب گورنمنٹ سے ۳۶۰ روپے سالانہ امداد ملتی تھی۔ سردار صاحب کا ایک چچا زاد بھائی سردار محمد خان لیہ کے قریب بستی شادو خان میں رہتا تھا۔ اسے فوجی خدمات کے عوض ۶۰۰ روپے بصورت الاؤنس ملتے تھے۔ بھکر کے جسکانی امراء کی حالت ان دونوں گھرانوں کے مقابلہ میں زیادہ بہتر تھی۔

اگرچہ جسکانی خاندان سے حکومت کو گئے دوسو برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔ پھر بھی بھکر اور لیہ تحصیلات میں ان کا شمار چوٹی کے امراء میں ہوتا ہے۔

ڈیرہ غازی خان

” ملتان سے پانچ کوس کے فاصلے پر چناب سے پرے بلوچوں کا ملک ہے، وہاں دو سردار ہیں ایک دودائی جس کے پاس تیس ہزار گھڑسوار اور پچاس ہزار پیادہ فوج ہے۔ دوسرا ھوت، جس کے ماتحت بیس ہزار سوار اور تیس ہزار پیادہ فوج ہے۔ بلوچوں کی یہ ریاست آبادی اور ہر دو فصلات کی کثرت کے سبب مشہور ہے۔ یہاں دولت کی بڑی فراوانی ہے اور یہ علاقہ ڈاکوؤں اور چوروں سے پاک ہے‘

(خلاصتہ التواریخ)

شجرہ نسب نوابان ڈیرہ غازی خان

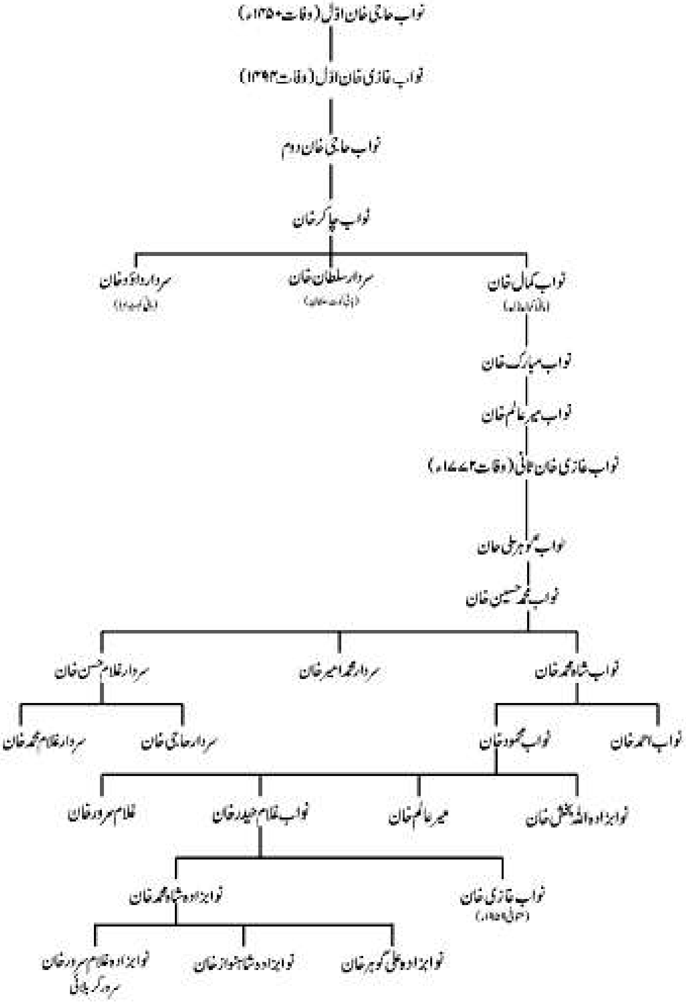

نواب حاجی خان اور ان کے بہادر فرزند نواب غازی خان کا اجمالی ذکر میر اسماعیل خان کے ضمن میں ہو چکا ہے۔نواب حاجی خان نے دریائے سندھ کے دائیں کنارے ایک شہر کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام اپنے بیٹے کے نام پر ڈیرہ غازی خان رکھا۔نواب نے اس شہر میں ایک عالی شان مسجد تعمیر کرائی اور ایک باغ لگوایا جو نولکھا کے نام سے موسوم ہوا۔اس کی وجہ تسمیہ معلوم نہیں ہو سکی ممکن ہے کہ اس پر نو لاکھ روپے خرچ آئے ہوں۔شہر کافی وسیع اور عریض تھا اور بلوچ سرداروں نے حسین کوشکوں،عمارتوں اور ہرے بھرے باغات سے اس کو رشک ارم بنا دیا تھا۔ یہ شہر میرانی ریاست کا دارالحکومت قرار پایا۔

مسٹر ایڈ ہراسن اپنی کتاب ''A year in the Punjab Frontior'' (پنجاب فرنٹیر میں ایک سال جلد دوم ص ۳) میں لکھتے ہیں کہ میں نے جو مقامات پنجاب میں دیکھے ہیں ڈیرہ غازی خان ان سب میں زیادہ خوبصورت ہے اس کے گرد و پیش کھجوروں کی اتنی کثرت ہے کہ اگر اسے کھجوروں کا شہر کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا۔اس ریاست میں گنا، نیل، کپاس اور گندم کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ایک روایت کے بموجب ۸۸۶ھ میں اس شہر کی بنیاد رکھی گئی۔

میر رحیم داد خان مولائی شیدائی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ انحطاط کے ایام میں جبکہ یہ ریاست شاہ کابل کی باجگذار بن کر رہ گئی تھی۔اس کا فرمانروا جنگ کے وقت تین ہزار سوار اور آٹھ ہزار پیادے میدان میں لا سکتا تھا۔اس ریاست کے ماتحت چودہ قلعے تھے۔جن میں سے ڈیرہ غازی خان، تونسہ، منگروٹھہ اور ہڑند خاصے مضبوط تھے۔ان کے علاوہ چھوٹے قلعے بھی تھے جو

کوٹلے کہلاتے تھے۔ سالانہ آمدنی ۱۰،۹۷،۰۰۰ روپے تھی۔ جن میں سے ۶،۷۰،۰۰۰ روپے کابل کو ادا کئے جاتے تھے اور ۵۴،۰۰۰ روپے خیرات کئے جاتے تھے۔

(بلوچی دنیا دسمبر ۱۹۵۷ء)

رائے بہادر ہیتو رام مزید لکھتے ہیں کہ سردار غازی خان اوّل بڑے نیک بخت اور عالی ہمت حکمران تھے۔ ان کے دور میں شہر ڈیرہ غازی خان کی تعمیر تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔ انہوں نے کئی اور شہر بھی آباد کئے اور اراضی کی سیرابی کے لئے نہریں نکالیں۔ نہر مانکہ جو ڈیرہ غازی خان کی سب سے بڑی نہر ہے۔ نواب کے حکم سے ان کے وزیر مال راجہ مانک رائے کی سرکردگی میں احداث کرائی گئی تھی۔ شہر کے باغات اور مضافات کی سیرابی کے لئے ایک اور نہر نکالی گئی۔ رسم افتتاح پر نواب نے خود اپنے ہاتھ سے پانی میں کستوری گرائی۔ جس سے اس کا نام کستوری واہ پڑ گیا۔

رائے بہادر ہیتو رام ''نو بہار'' میں لکھتے ہیں جن دنوں میں نواب شہر کے لئے نہر احداث کرا رہے تھے۔ ایک سوداگر چند بار مشک کستوری فروخت کے واسطے لایا۔ ڈیرہ میں کوئی ایسا شخص متمول نہیں تھا جو اسے خرید سکتا۔ سوداگر نے اس امر کا نواب کے آگے شکوہ کیا۔ نواب صاحب نے وہ تمام مشک خرید لیا اور رسم افتتاح کے وقت یہ تمام کستوری اس نہر میں پھینکوادی جس سے یہ نہر ''کستوری واہ'' سے مشہور ہوئی۔''

اس کے علاوہ سردار ہیبت خان نے نالہ ڈھوری اور بشارت واہ احداث کرائے۔ نواب غازی خان کے چار صاحبزادے تھے اور انہوں نے اپنے نام پر شہر آباد کئے۔ نواب کمال خان نے کمالیہ (جو بعد میں لیہ ہو کر رہ گیا) نواب ادو خان نے کوٹ ادو، نواب سلطان خان نے کوٹ سلطان اور نواب نوشیر خان نے نوشہرہ آباد کیا۔ میرانی حکمرانوں نے اپنے پھیلے ہوئے علاقوں پر براہ راست حکومت کرنا مناسب تصور نہ کیا، بلکہ ان علاقوں میں نیم خود مختار ناظم مقرر کئے جو اپنے اپنے تمنات کے سربراہ اور تمندار کہلاتے تھے۔ جنوب میں تمن مزاری نے نواب محمد قائم خان ناہڑ

سے مفاہمت کر کے روجھان اسٹیٹ قائم کرلی تھی۔اس دور میں کیچ مکران سے بے شمار بلوچ قبائل اس طرف منتقل ہو آئے تھے اور انہوں نے پرانے باشندوں کو نکال کر اس علاقے پر قبضہ کرلیا تھا۔مزاریوں نے ناہڑوں کے علاوہ چانڈیوں اور ماچھیوں کو بھی پے بہ پے شکستیں دے کر بھونگ تک کی اراضیات اپنے قبضے میں لے لی تھیں تمن دریشک نے تمن حسنی کو تمن لغاری نے احمدانیوں کو تمن نکرتانی نے قوم چچہ اور لنگاہ کے مسکن سے نکال دیا اور آہستہ آہستہ دامان کے تمام علاقوں میں بلوچ نظر آنے لگے۔

نواب غازی خان حضرت مخدوم لعل عیسن قریشی علیہ الرحمتہ سے ارادت رکھتے تھے۔حسن اتفاق سے نواب اسماعیل خان اور نواب فتح خان بھی اسی شہباز طریقت کے مرید تھے۔ جب حضرت مخدوم کا انتقال ہو گیا تو ان تینوں سرداروں نے حضرت کی قبر شریف پر عظیم الشان مقبرہ تعمیر کرایا۔جو قطب الاقطاب شاہ رکن عالم رحمتہ اللہ علیہ کے مقبرہ کے مشابہ تھا۔نیز مقبرے کے جنوب غربی گوشے میں مسجد اور دوسری مسجد نما عمارتیں تعمیر کیں۔جن میں اس زمانے کے بڑے بڑے جید علماء درس دیتے تھے۔جب ان سرداروں نے عالم قدس کا سفر اختیار کیا تو ان کے اجساد کو حضرت کی پائینتی میں دفن کیا گیا۔

مصنف نے حضرت مخدوم اور ان سرداروں کے مزارات کی زیارت کی ہے۔ان کی کتبوں پر صاف لکھا ہے:۔

”نواب اسماعیل خان بانیٔ ڈیرہ اسماعیل خان“

”نواب غازی خان بانیٔ ڈیرہ غازی خان“

”نواب فتح خان بانیٔ کوٹ فتح خان“

حضرت مخدوم کا مقبرہ کروڑ ضلع مظفر گڑھ میں واقع ہے۔جو حضرت کی نسبت سے کروڑ لعل عیسن کہلاتا ہے۔

نواب غازی خان دوم

نواب حاجی خان کے بعد اس کا بلند اقبال فرزند نواب غازی خان تخت نشین ہوا۔اس زمانے کا اہم واقعہ یہ ہے کہ سردار گامن خان کورائی وزیر اعظم نے بذلہ سنجی اور خداداد صلاحیتوں کے سبب ہوت اور میرانی حکومتوں کے درمیان صلح کرادی۔سردار گامن خان ضلع جھنگ کے موضع کل کورائی کے باشندے تھے۔ڈیرہ جات منظر عام پر آئے تو اس نوجوان کو بھی قسمت آزمائی کا شوق ہوا۔چنانچہ نقل مکانی کر کے ڈیرہ غازی خان تشریف لے آئے اور نواب کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔خداوند عزوجل نے انہیں غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔حق گوئی میں جواب نہیں رکھتے تھے۔اس لئے نواب نے انہیں راستباز خان کا خطاب مرحمت کیا۔عوام میں اب تک گامن سچار کے نام سے موسوم ہیں۔سردار گامن خان اپنی فطری ذہانت، لیاقت اور ظرافت طبع کے طفیل ترقی کرتے ہوئے وزارت عظمیٰ کے منصب عالیہ پر فائز ہو گئے۔میرانی اور ہوت سرداروں میں ۲۲ دفعہ شدید جھڑپیں ہو چکی تھیں۔جن میں دونوں قبائل کے رزم آزما بہادر کام آئے تھے۔سردار گامن خان نے اپنی ظرافت ولطافت سے دونوں سربراہوں میں صلح کرادی اور مور جھنگی دونوں ریاستوں کی حد فاصل مقرر ہوئی۔تعلقات میں مزید پختگی پیدا کرنے کی غرض سے دونوں سرداروں میں رشتہ داریاں بھی کرائیں۔ادھر سے اطمینان خاطر ہوا تو نواب نے ڈیرہ غازی خان کی آبادی اور سرسبزی کی طرف توجہ دی۔شہر میں مزید عالی شان کوشکیں تعمیر ہوئیں۔نہریں احداث کرائیں اور باغات کا لامتناہی سلسلہ شروع کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑے سے عرصہ میں ہی ڈیرہ غازی خان ''فردوس برروئے زمین'' نظر آنے لگا۔

نواب غازی خان دوم کو عمارات بنوانے کا بڑا شوق تھا۔حضرت سخی سرورؒ سے بلوچوں کو والہانہ عقیدت رہی ہے۔ہر سال آپ کے مزار نور بار پر بہت بڑا اجتماع ہوتا ہے۔جس میں

شرکت کے لئے مشرقی پنجاب تک سے وفود آتے ہیں۔ نواب صاحب نے سخی سرورؒ کے مزار پر نور بار پر عالیشان مقبرہ تعمیر کرایا اور زائرین و معتکفین کے لئے حجرے و مسافر خانے بھی بنوائے۔

نواب صاحب کے زمانے میں ایک شاہ صاحب زہد و ورع میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ ان کا عدل و انصاف خصوصی طور پر مشہور تھا۔ ایک دفعہ ان کے صاحبزادے پیر غیاث الدین شاہ نے ایک زمیندار کو قتل کر دیا۔ اس کے ورثاء نے نواب صاحب کے دربار میں حاضر ہو کر داد چاہی۔ نواب صاحب حضرت کا بے حد احترام کرتے تھے۔ انہوں نے یہ مقدمہ سماعت کے لئے شاہ صاحب کی خدمت میں بھیج دیا۔ شاہ صاحب نے اپنی ذمہ داری کو اچھی طرح محسوس کرتے ہوئے مقدمہ کو خوب غور سے سنا اور اپنے لڑکے کو مجرم پا کر تلوار طلب کی اور عوام کے سامنے اس کا سر بھٹے کی طرح اڑا دیا۔ اس واقعہ سے شاہ صاحب پیر عادل کے نام سے مشہور ہو گئے۔ جب حضرت کا انتقال ہوا تو نواب صاحب نے آپ کے مزار پر ایک لاکھ روپے سے عالی شان مقبرہ تعمیر کرایا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ڈیرہ غازی خان کے حالات میں صرف ان حکمرانوں کا ذکر آتا ہے جن کا نام غازی خان ہے۔ اگرچہ حاجی خان نام کے متعدد حکمران گزرے ہیں۔ مگر ان کا ذکر بہت کم آتا ہے۔ تاریخ ہند کے مطالعہ سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ جس حکمران نے دارشکوہ کو دریائے سندھ عبور کرنے کی اجازت دینے سے انکار کیا تھا۔ اس کا نام حاجی خان تھا اور غالباً اسی نواب نے ملتان میں اورنگزیب سے مل کر خلعت فاخرہ حاصل کی تھی۔ اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو سکا۔ ڈیرہ غازی خان کے دوسرے حکمران نے شہر سے دس میل مغرب کی جانب چورہٹہ میں اپنا مقبرہ تعمیر کرایا تھا جو اب تک اچھی حالت میں موجود ہے۔

بلوچوں کے رواج کے مطابق حاجی خان کے بعد غازی خان اور غازی خان کے بعد حاجی خان وارث ہوئے اور ان کی حکومت پندرہ پشتوں تک برقرار رہی۔ حاجی خان سات اور غازی خان نام کے آٹھ حکمران گزرے ہیں۔ اس لئے وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ کس نواب نے کتنے

برس تک حکومت کی۔ اس عملداری کی تفصیل کسی تاریخ میں بھی نہیں مل سکی۔ ماسوائے چند حوالہ جات کے جو بڑی مشکل سے بعض کتابوں سے حاصل کئے جا سکے ہیں۔ اس سے بلوچ فرمانرواؤں کی مکمل تاریخ تو ظاہر نہیں ہوتی ہاں البتہ اس کی چند چھلکیاں ضرور نظر آجاتی ہیں۔

بلوچ طبعاً آزاد واقع ہوئے ہیں۔ وہ دوسروں کی غلامی کو انتہائی مجبوری کے وقت قبول کرتے ہیں۔ لنگاہ ان کے مزاج شناس تھے۔ انہوں نے انہیں بلایا۔ ریاستیں اور جاگیریں عطا کیں۔ لیکن انہیں مطیع ومنقاد بنانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جس طرح سندھ میں ان کے حلیف تھے۔ ویسے ملتان میں ان کے دوست رہے۔ جب کبھی بیرونی حملہ آور ملتان کا رخ کرتے بلوچ اپنی جمعیت کے ساتھ سینہ سپر بن کر آگے بڑھتے اور دشمن کے دانت کھٹے کر دیتے۔ مگر جب وزارت عظمیٰ اور فوج کی قیادت بلوچوں سے لے لی گئی تو لنگاہ انحطاط اور انتشار کا شکار ہو گئے۔ تاہم لنگاہوں کے آخری دور تک میرانیوں کی ریاست ملتان کی حکومت کو عسکری امداد دیتی رہی۔ ان کے بعد شیر شاہ سوری کی زمانے میں بھی یہ ریاست داخلی طور پر آزاد تھی۔ اکبر اعظم نے تو سرکاری طور پر اس ریاست کی خودمختاری کو تسلیم کر لیا تھا۔

ڈیرہ غازی خان مغل دور میں

چنانچہ ''انڈیا آف اورنگزیب'' کا فاضل مؤلف ایم سی سرکار صفحہ ۲ پر لکھتا ہے کہ راجہ ٹوڈرمل نے عہد حاضر کی پالیسی کے مطابق ہندوستان اور خراسان کے درمیان ایک بفر سٹیٹ قائم کر دی تھی۔ جس کی بنا پر کوٹ کروڑ سے دین کوٹ کا علاقہ معمولی حقوق کے بدلے بلوچوں کے حوالے سے کر دیا تھا۔ اس کے طفیل خراسان اور ہند کے درمیان دوسوسال کیلئے ایک زبردست دیوار کھڑی کی گئی تھی۔

یہی مؤلف اسی کتاب میں خلاصۃ التواریخ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

''ملتان سے پانچ کوس کے فاصلے پر چناب سے پرے بلوچوں کا ملک ہے۔ وہاں دو

سردار ہیں۔ ایک دودائی جس کے پاس تیس ہزار گھڑ سوار اور پچاس ہزار پیادہ فوج ہے۔ یہ دونوں سردار سرحدات کی خاطر آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ شہنشاہ کا حلف اطاعت اٹھانے کے بعد یہ دونوں سردار اپنے اپنے ملک کے مالک رہتے ہیں۔ ان کے سفیر ملتان میں حاضر رہتے ہیں۔ شہنشاہ کے احکام بجالاتے ہیں اور صوبائی گورنر کی رہنمائی میں کام کرتے ہیں بلوچوں کی یہ ریاست آبادی اور ہر دو فصلات کی کثرت کے سبب مشہور ہے۔ یہاں دولت کی بڑی فراوانی ہے اور یہ علاقہ ڈاکوؤں اور چوروں سے پاک ہے''۔

(خلاصۃ التواریخ از سجان رائے بٹالوی ص ۷۸)

مندرجہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بلوچوں کا انتظام نہایت اعلیٰ تھا۔ جس کے سبب چور، ڈاکو اور بدمعاش دب گئے تھے۔ ۱۶۴۸ء میں جب اورنگزیب ملتان کا گورنر مقرر ہو کر آیا تو اسے ہوت نوحانی، نہمروی بلوچوں سے کئی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ مگر آخر کار اسے بلوچوں کو دشمن بنانے کی بجائے دوست بنانے میں ہی فائدہ نظر آیا۔ اس نے بلوچوں کی ریاستوں سے متعلق شاہجہان کو جو رپورٹ ارسال کی تھی۔ اس کے الفاظ یہ تھے۔

''پیر دستگیر سلامت! ولایت متعلقہ بلوچاں خیلے معمور و آباداں بنظر در آید، زراعت سیلابی و چاہی بسیار خوب مے شود۔ اکثر جا مرغزار ہائے دلکشا با، صفا۔۔۔''

(رقعات عالمگیری مطبوعہ اعظم گڑھ۔ خط نمبر ۶/۲۱ ص ۲۸۔ ۲۹۔ رقعات عالمگیری ص ۲، ۳)

سر الیگزینڈر برنس اپنی کتاب ''کابل'' میں لکھتا ہے کہ شکار پور اور ڈیرہ غازی کو خراساں کے دروازے سمجھنا چاہیے۔ شاہان خراسان سخی سرور کے راستے سے آم منگوایا کرتے تھے جو آٹھ دن میں قندھار پہنچ جاتے تھے''۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ حاجی خان اور جام جمعہ جنہوں نے عہد ترخانیہ سے اب تک کسی کی بھی اطاعت قبول نہ کی تھی۔ انہیں مطیع کیا گیا اور انگزیب کے الفاظ یہ ہیں:۔

''حاجی خان وجام جمعہ اعیان آں سرزمین کہ از عہد حکام ترخانیہ تا حال رجوع نداشتند سر انقیاد بہ خطہ فرمان نہادہ''۔

اس رپورٹ سے یہ امر یقینی ہو جاتا ہے کہ عہد ترخانیہ سے شاہ جہاں کے آخری دور تک بلوچ شہنشاہ دہلی سے آزاد رہے۔ ۱۱۱۱ء میں اورنگزیب کو اطلاع ملی کہ بلوچوں نے بارہ ہزار فوج اکٹھی کر لی ہے اور آمادہ فساد ہیں۔ شہزادہ معز الدین جو بعد میں جہاندار شاہ کے نام سے تخت پر بیٹھا تھا۔ اس بغاوت کو فرو کرنے پر مامور ہوا۔ یہ لڑائی دراصل بلوچوں کی جنگ آزادی تھی۔ وہ اس طوق غلامی کو جو سال رواں میں ان کے گلے میں ڈالا گیا تھا نکال پھینکنا چاہتے تھے۔ حفیظ اللہ خان صوبیدار ٹھٹھہ نے شہزادے کی مدد کی لیکن اس کے باوجود اتنی عظیم سلطنت کی فوجوں کو بلوچ نے سخت پریشان کیا۔ متعدد جھڑپیں ہوئیں۔ جن میں دہلی افواج کے نامور افسر کام آئے۔ ان میں لطف علی خان، سورج مل اور بہادر خان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شہزادے نے ایک ہزار بلوچ قتل کئے تب کہیں فتح پائی۔

(عالمگیر نامہ جلد دوم از مولانا عبد الرحمن)

غازی خان آخر

نواب حاجی خان آخر نے مرتے وقت اپنے کمسن صاحبزادے کو محمود خان گوجرہ کے سپرد کیا۔ اسے امید تھی کہ وزیر حق نمک ادا کرے گا۔ مگر محمود نے اپنے آقا سے جو سلوک کیا اس کے ذکر سے انسانیت شرماتی ہے۔ رائے بہادر ہیتو رام نے محمود خان کا تعارف اس طرح کرایا ہے، لکھتا ہے:

''محمود خان ایک غریب گوجر کا لڑکا تھا۔ ابھی یہ کمسن بچہ تھا کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس کی بیوہ ماں اس کی اور اس کے چھوٹے بھائی نور احمد کی پرورش کرتی اور تعلیم دلاتی رہی۔ محمود

خان جب پڑھ لکھ کر فارغ ہوا تو اس نے نواب حاجی خان کے پیر طریقت سے سفارشی خط حاصل کیا اور نواب کے دربار میں ملازمت کیلئے حاضر ہو گیا۔ نواب صاحب نے اسے اپنے دربار میں بطور منشی کے ملازم رکھ لیا اور پھر جوں جوں اس کی صلاحیت اور قابلیت اجاگر ہوتی گئی نواب صاحب اس کا اعزاز اور منصب بڑھاتے رہے۔ یہاں تک کہ اسے وزارت عظمٰی کا قلمدان دے کر اپنی ریاست کے سیاہ وسفید کا مالک بنا دیا۔

نواب حاجی خان جب اپنی طبعی عمر ختم کر چکے اور موت انہیں قریب نظر آنے لگی تو انہوں نے محمود خان کو بلایا اور اپنا کمسن بچہ اس کے سپرد کر کے فرمایا کہ ''محمود خان! میں نے تمہیں فرش سے اٹھا کر عرش تک پہنچایا ہے اور کبھی نوکر نہیں سمجھا ہمیشہ چھوٹا بھائی خیال کرتا رہا ہوں۔ اب میں رفیق اعلیٰ کے ہاں جا رہا ہوں۔ میرے احسانات کا خیال کرنا اور اس یتیم سے دھوکا نہ کرنا'' یہ کہہ کر نواب صاحب ملک عدم کو روانہ ہو گئے اور محمود خان نے ریاست کے تمام اختیارات سنبھال لئے کچھ عرصہ تو محمود خان نے اچھا کام کیا پھر اس کی نیت اپنے آقا سے بدل گئی اور وہ درپردہ اس کوشش میں رہنے لگا کہ کسی طرح غازی خان کو معزول کر کے خود حاکم بن جائے لیکن چونکہ غازی خان ایک عادل اور خداترس نوجوان تھا۔ رعایا اس سے بجان ودل راضی تھی۔ اس لئے محمود خان کو بظاہر ایسی کوئی صورت نظر نہ آئی جس سے یہ اپنا مقصد پورا کرتا آخر کار اس نے ایک سکیم بنائی اور اس پر عمل شروع کر دیا۔ بات یہ ہوئی کہ ڈیرہ میں ایک شیعہ فقیر نسیم شاہ رہتا تھا۔ اس نے سنی مسلمانوں کو بھڑکایا کہ اس رافضی کو قتل کر دو۔ نواب کو یہ امر سخت ناگوار گزرا اور اس نے تمام سنی نوجوانوں کو جو اس جرم میں ملوث تھے گرفتار کر کے قید کر دیا۔ اہل سنت نے اپنی رہائی کے لئے ایک سید سے جس پر نواب صاحب مہربانی فرماتے تھے۔ سفارش کرائی جو نامنظور ہوئی۔ اس ناعاقبت اندیش سید نے اس میں اپنی اہانت تصور کی اور نواب غازی خان کے دربار میں آ کر برملا اعلان کیا کہ نسیم شاہ کا قاتل میں ہوں۔ علمائے اہل سنت کا اس میں کوئی دخل

نہیں ہے۔نواب صاحب نے اس کیس کو خود سماعت فرمایا اور اس سید کو نسیم شاہ کے انتقام میں قتل کرا دیا۔علمائے اہل سنت جونہی قید خانہ سے آزاد ہوئے انہوں نے بسازش محمود خان، نواب صاحب پر سید صاحب کے قتل کا الزام لگا کر تمام رعایا کے دلوں کو اس سے پھیر دیا۔ساتھ ہی اس نے غلام شاہ کلہوڑہ، حاکم سندھ کو وکیل بھیج کر درخواست کی کہ غازی خان کو بے دخل کر کے باخذ چہارم آمدنی اس ریاست کا اسے حاکم بنا دے اس نے وزیر کی سفارش عوام کی ناراضی اور زر چہارم پر قناعت کر کے ڈیرہ کی حکومت محمود خان کو دے دی اور خود غازی خان کو گرفتار کر کے اپنے ملک سندھ کو چلا گیا۔غازی خان کا وہاں انتقال ہو گیا۔حیدر آباد میں نواب صاحب کا مقبرہ موجود ہے اور اس پر درج ذیل ابیات مرقوم ہیں۔

چوں غازی زد نیا رفت محروم — مسافر بے وطن مرد است مظلوم

خرد تاریخ وے گفت است بشنو — " ظفر جاہ "بشماری اے یار معصوم"

رائے بہادر ہیتو رام لکھتے ہیں کہ نواب غازی خان آخر کے بعد ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۴ء تک ڈیرہ کی سلطنت طوائف الملوکی کا شکار رہی۔تقریباً سولہ افراد اس ملک کے حاکم بنے مگر کسی کو ایک برس اور کسی کو بمشکل چھ ماہ کام کرنے کا موقع ملا۔اکثر مغل پٹھان کابل سے تعینات ہو کر آتے تھے جو اس ملک کے حالات سے بے خبر ہوتے تھے۔اس لئے ملک تباہ و برباد ہو گیا اور یہ ریاست جو کبھی محسود زمانہ تھی جس کا ذکر اورنگزیب جیسا شہنشاہ بھی بڑے فخر سے کرتا تھا۔بنجر اور بیابان بن کر رہ گئی اور امن مفقود ہو گیا۔

ڈیرہ غازی خان خالصہ دور میں

۱۲۳۰ھ میں اس ریاست پر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے قبضہ کیا چونکہ نواب بہاول پور نے یہ ملک فتح کرنے میں مہاراجہ کی امداد کی تھی۔اس لئے مہاراجہ نے نواب مذکور کو یہ ریاست بطور اجارہ کے دے دی اور نواب کی طرف سے غلام قادر خان ناظم مقرر ہو کر نو برس تک حکمرانی کرتا رہا۔

۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء نصیر خانی علاقہ بھی اس ریاست میں مدغم کر دیا گیا۔ ملک کا انتظام قدرے اچھا ہو چلا تھا کہ نواب صاحب سے ایسی حرکت سرزد ہوئی جس سے سارے ملک میں ایک دفعہ پھر سے بے چینی پیدا ہو گئی واقعہ یہ ہوا کہ نواب صاحب نے مندرجہ ذیل تمنداران سے اپنے بیٹے محمد بہاول خان کے لئے رشتہ طلب کیا۔

علی گوہر خان تمندار۔ کوڑا خان تمندار کھوسہ، جلال خان تمندار لغاری، جلب خان تمندار گورچانی، ان حضرات نے رشتہ دینا قبول کرلیا۔ مگر مزاری تمن نے انکار کر دیا۔ اس نے نہ رشتہ دیا اور نہ ہی اطاعت قبول کی۔ جس پر فضا مکدر ہو گئی اور مہاراجہ نے ملک کا انتظام واپس لے کر جرنل ونٹورہ کو ناظم مقرر کیا۔ یہ شخص بڑا ہوشیار تھا۔ فارسی میں شستہ تقریر کر لیتا تھا۔ اس نے ممکن حد تک ملک کی اصلاح کی جو نظام پہلے سے رائج تھا اسے قائم رکھا اور بگڑنے نہ دیا۔ اس کے بعد یہ ملک دیوان ساون مل کی تحویل میں دے دیا گیا۔ دیوان ساون مل بڑے زیرک اور معاملہ فہم حکمران تھے۔ انہوں نے بلوچوں کو مطیع کرنے کے لئے ہر قسم کے حربے استعمال کئے مگر سوائے معدودے چند کے اکثر تمنات باغی رہے۔ مزاریوں سے نبٹنے کے لئے تو مہاراجہ کو اپنا ولی عہد کنور کھڑک سنگھ بھیجنا پڑا۔ تھوڑی مدت میں ہی دیوان ساون مل، مہاراجہ رنجیت سنگھ، مہاراجہ کھڑک سنگھ، مہاراجہ نونہال سنگھ سب کا خاتمہ ہو گیا۔ مہاراجہ کا ایک لڑکا کنور دلیپ سنگھ تین سال کا تھا اس کی ماں رانی جنداں اس کے نام سے حکومت کرنے لگی۔ ملتان میں دیوان ساون مل کی جگہ اس کا لڑکا دیوان مولراج ناظم مقرر ہوا۔ ۱۸۴۷ء میں انگریزوں نے ملتان فتح کرلیا۔ ڈیرہ غازی خان بھی دوسرے اضلاع کی طرح یونین جیک کے نیچے آ گیا اور جنرل کورٹ لینڈ جو خالصہ دربار کے ملازم تھے پہلے ڈپٹی کمشنر مقرر ہوئے۔ برطانوی حکومت نے ملوکانہ حربے برتے اور غیور بلوچوں کے وطن کو کئی حصوں میں تقسیم کرنے کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے ڈیرہ غازی خان کو ضلع قرار دیا اور پہاڑی علاقہ کو الگ کر کے اس میں فوج اور بارڈر پولیس رکھی۔ یہ انتظام پاکستان معرض وجود میں آنے کے بعد بھی قائم رہا۔ مگر کچھ عرصہ بعد قبائلی علاقوں کو ڈیرہ غازی

خان میں مدغم کردیا گیا۔

میرانیوں کا مآلِ کار

میرانیوں کا عہد حکومت امن اور خوشحالی کا زمانہ تھا۔ ملک نے غیر معمولی ترقی کی۔ ان لوگوں نے کئی نہریں نکالیں۔ شہر آباد کئے۔ نواب حاجی خان نے حاجی پور، جہاں خان نے جہان پور، سنجر خان نے سنجر پور، عالم خان نے موضع عالم خان آباد کئے۔ کوٹ ادو کا بانی نواب داؤد خان تھا۔ اس شہر کا نام بھی کوٹ داؤد خان تھا۔ مرور زمانہ سے مسخ ہو گیا۔ لیہ کا اصلی نام کمالیہ تھا جسے نواب کمال خان نے آباد کیا تھا یہ نام بھی زمانے کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر لیہ بن گیا۔ ڈیرہ کے نواب رعایا پرور اور عادل تھے۔ ان کی انصاف پروری نے دور دور سے تاجروں کو کھچ کھچا کر ڈیرہ میں جمع کر لیا تھا۔ چنانچہ شکار پور کے مہاجن خصوصی شہرت کے مالک تھے۔

ڈیرہ کی مسجد جو ”خان والی مسجد“ کے نام سے مشہور تھی۔ نواب غازی خان اوّل نے پچاس ہزار روپے کی لاگت سے تیار کرائی تھی۔ یہ مسجد نواب موصوف کی بہترین یادگار تھی۔ محمود خان گوجر نے آخری نواب غازی خان پر نااہلی کے الزامات لگا کر ریاست چھین لی۔ آخری نواب قید کر کے حیدر آباد بھیج دیئے گئے۔ ان کے اعزا و اقارب ڈیرہ اسماعیل خان اور جھنگ کی طرف منتقل ہو گئے۔ ابھی نوابوں کے پر شکوہ قلعے اور شاہی محلات موجود تھے جن سے بلوچوں کی عظمت رفتہ کا اندازہ ہوتا تھا۔ قضا و قدر کو یہ بھی گوارا نہ ہوا۔ ۱۶۱۰ء میں سندھ کا افعی پھنکارتا ہوا آگے بڑھا اس نے ڈیرہ غازی خان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور تمام محلات، مساجد اور مقابر بہا لے گیا۔

تا سحر تو نے نہ چھوڑی اے باد صبا　　　یادگار رونق محفل تھی پروانے کی خاک

سردار غلام رسول خان کورائی بصد حسرت و یاس لکھتے ہیں کہ:۔

”میرانی خاندان املاک و جائیداد اور اثر و اقتدار کے لحاظ سے اب گمنام سا ہو چکا ہے۔ نوابوں کی آخری یادگار حاجی خان میرانی نے ملتان کے محاصرہ میں ایڈورڈس کے ہمراہ داد شجاعت

دی تھی۔ محمود خان اس کا فرزند شہر ڈیرہ غازی خان میں طبابت کرتا تھا''۔

خاندانی غیرت

بقول سردار غلام رسول خان اس میں کچھ شک نہیں کہ املاک و جائیداد کے اعتبار سے یہ خاندان ہمیشہ کیلئے ختم ہو گیا تھا۔ مگر اس پر بھی آفرین ہے کہ اس خانوادے نے خاندانی حمیت اور خودداری کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

نواب محمود خان اسی شہر میں جوان کے آباء کرام کا پایہ تخت تھا۔ جہاں اب بھی سینکڑوں شاہی عمارتیں ان کے عروج و اقبال کی داستانیں سنانے کو زندہ کھڑی تھیں۔ فقر و فاقہ کا بری طرح شکار ہو رہے تھے۔ بایں ہمہ کسی رئیس کے آگے ہاتھ پھیلانا، ان کیلئے ناممکن تھا۔ مسند شاہی کی بجائے انہوں نے طبابت کی مسند کو اختیار کیا۔ اب وحد قیام امن میں کوشاں رہے۔ انہوں نے عوام کو جسمانی عوارض سے نجات دلانے کا کام پسند کیا۔ دن بھر لوگوں کا تانتا لگا رہتا۔ تشخیص کے بعد نسخے تجویز ہوتے۔ اگر کوئی ادب سے مسند کے نیچے کچھ رکھ دیتا تو نذر کے طور پر قبول کر لیا جاتا مگر مدت العمر نہ آپ نے معاوضہ طلب کیا اور نہ کسی کو کچھ پیش کرنے کی جرات ہوئی۔ نوابوں کی نوابی ختم ہو چکی تھی مگر سرداروں کی سرداری قائم تھی۔ اپنے اپنے تمنات میں ہر سردار با اختیار حاکم تھا۔ جب یہ لوگ کسی اجلاس میں جمع ہوتے تو نواب محمود خان کی مالی مشکلات کا ذکر کر کے افسوس کرتے تھے۔ ایک دفعہ نواب بہرام خان مزاری کو خیال آیا کہ اگر نواب محمود خان جرگہ میں تشریف لے آئیں تو ان کی گزر اوقات کا کوئی نہ کوئی انتظام ضرور ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ اس پروگرام کے تحت نواب صاحب کے مکان پر آئے اور اصرار کیا کہ وہ ان کے ساتھ سرداروں کے اجلاس میں تشریف لے چلیں۔ نواب محمود خان معاملہ کو بھانپ گئے مزاری سردار کی طرف سے شعلہ بار نگاہوں سے دیکھا اور کہا تم میری ناک میں خاندانیت کی نتھ ڈالنے آئے ہو۔ خودداری

بنتے ہو اور مجھے ریچھ بنا کر سرداروں کی کچہری میں نچانا چاہتے ہو تا کہ بال بچوں کے لئے روٹی کی بھیک مانگ سکوں! بہرام خان! میری غیرت کا اور امتحان نہ لو!'' (چنانچہ پھر کسی رئیس یا سردار کو نواب محمود خان کے قریب آنے کی جرات نہ ہوئی)

مسٹر ڈیمز کی قدر شناسی

مسٹر ایل ڈیمز جب ڈیرہ غازی خان کے ڈپٹی کمشنر بن کر آئے تو اس نے مقامی سرداروں اور رؤسا کے اطاعت گزار طبقے کو حسب دستور قرب سلطانی کے لئے ہمہ تن سرگرم عمل پایا۔ چند دنوں کے بعد اسے خیال آیا کہ ڈیرہ غازی خان کے فرمانرواؤں کے خاندان کا کوئی شخص اسے خوش آمدید کہنے نہیں آیا۔ چنانچہ اس نے اپنے مقربین سے دریافت کیا۔ کیا ڈیرہ غازی خان کے شاہی خاندان سے کوئی باقی نہیں رہا؟

جواب میں بتایا گیا کیوں نہیں۔ فرمانروایان ڈیرہ غازی خان کی آخری نشانی نواب محمود خان زندہ موجود ہیں۔ مگر ان کا کنبہ مفلسی کا شکار ہے اور وہ خوددار لوگ کسی کے زیر بار احسان ہونا بھی پسند نہیں کرتے۔

ڈیمز ایک خاندانی انگریز تھا اور خاندانوں کے عروج وزوال کی ہزاروں داستانیں اسے ازبر تھیں۔ برصغیر میں کئی شاہی خاندانوں کو اپنی قوم کے اقتدار کی بھینٹ چڑھتے اور انہیں صبر آزما مراحل سے دوچار ہوتے بھی دیکھ چکا تھا۔ نجیب واصل شخص بے حد متاثر ہوا۔ بصورت خاص محمود خان سے ملا اور حتی المقدور ان کے لئے آبرومندانہ ماحول پیدا کیا۔ انہیں پراونشل درباری کا خطاب دلوایا۔ ایک وسیع وعریض جاگیر عنایت کی اور تقریباً ۱۸۰۰ روپے سالانہ گزارہ الاؤنس مقرر کر دیا۔ نواب محمود خان کے ڈیمز کے ساتھ گہرے تعلقات قائم ہو گئے۔ وہ ایک دوسرے کے ہاں بے تکلفی سے آتے جاتے تھے فیاض ازل نے مسٹر ڈیمز کو تاریخ وادب کا غیر

معمولی ملکہ عطا کیا تھا۔اس نے ڈیرہ غازی خان میں قیام کے دوران بلوچ قبائل کی تہذیب و تمدن اور رسم و رواج پر گہری تحقیق کی اور متعدد کتابیں تصنیف کیں ''دی پاپولر پوئٹری آف بلوچیز'' کے بعد ڈیمز نے ''دی بلوچ ریس'' "The Baloch Race" نامی شہرہ آفاق کتاب مدون کی۔اس کی ترتیب و تدوین میں نواب محمود خان نے خاصا حصہ لیا۔

خاندانی اور غیر خاندانی کا فرق

مسٹر ڈیمز کا جب ڈیرہ غازی خان سے تبادلہ ہوا تو روانگی سے پہلے سرداروں کے ایک اجتماع میں نواب محمود خان سے مخاطب ہو کر کہا۔

''نواب صاحب! میں نے اپنے دور ملازمت حتی المقدور آپ کی خدمت کی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں آپ کو حالات کی تاریکی اور گمنامی سے نجات دلانے میں کامیاب ہوا ہوں۔مگر آپ کے شایان شان حیثیت اب بھی نہیں ملی لیکن میں مطمئن ہوں کہ میں نے اپنے اختیارات سے فائدہ اٹھا کر ایک بڑا فرض ادا کیا ہے۔اب اگر کوئی میرے بعد شریف اور خاندانی انگریز آیا تو وہ بھی آپ کی بزرگی اور عظمت کا احترام کرے گا''۔

نواب محمود خان نے بڑی سادگی سے سوال کیا کہ

''کیا انگریزوں میں بھی خاندانی اور غیر خاندانی ہوتے ہیں؟''

ڈیمز نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:۔

''ہاں نواب صاحب! جس طرح آپ ایک عظیم خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن آپ کے مقابلے میں ادنیٰ اقوام کے کئی افراد امیر کبیر بن گئے ہیں۔اسی طرح ہمارے ہاں کے معمولی خاندان کے لوگ بھی پڑھ لکھ کر یہاں افسر بن کر آجاتے ہیں۔انہیں خاندانی یا غیر خاندانی میں کیا تمیز ہو سکتی ہے!''

ایل ڈیمز رخصت ہو گیا۔مسٹر ڈیمز کی قبر فورٹ منرو میں واقع ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ وہ

دوبارہ ڈیرہ غازی خان میں تبدیل ہو کر آئے ہوں گے اور پھر فوت ہو کر یہیں دفن ہوئے۔ انہیں بلوچوں سے بے پناہ محبت تھی۔ زندگی بھر ان کے لئے لکھتے رہے مرے تو ان کے جرگہ ہال کے سامنے جگہ ملی۔ اور اس کے کچھ عرصہ بعد نواب محمود خان کا بھی انتقال ہو گیا۔ نواب صاحب کے ساتھ ان کے اعزازات بھی ختم ہو گئے۔ سرکاری وظیفہ بند ہو گیا اور جاگیر تتر بتر ہونے لگی۔ مسٹر ڈیمز جیسا کوئی خاندانی افسر پھر ڈیرہ غازی خان میں نہ آیا۔ جو اس کی طرح نواب محمود خان کی اولاد کی معاشی مشکلات کا احساس کرتا۔ نواب محمود خان کے دو چچا زاد بھائی تھے۔ سردار مولاداد خان اور سردار احمد خان، سردار مولاداد خان کی اولاد جھنگ میں مقیم ہے اور سردار محمد نواز خان اس کے سربراہ ہیں۔ سردار احمد خان کی اولاد ضلع مظفر گڑھ کے کل کنول میں رہائش رکھتی ہے۔ اس خاندان کے حکیم محمد حسین خان سربراہ ہیں۔

نواب محمود خان کی اولاد

نواب محمود خان کے چار فرزند تھے۔ نوابزادہ غلام حیدر خان، نوابزادہ غلام سرور خان، نوابزادہ میر عالم خان اور نوابزادہ اللہ بخش خان۔ اللہ بخش خان نے پولیس کی ملازمت کی اور خان گڑھ میں عین عالم شباب میں وفات پائی۔ میر عالم خان خاندان سے منقطع ہو کر عالم گمنامی میں وفات پا گیا اور غلام سرور خان نے ۱۹۳۸ء میں جھنگ میں انتقال کیا۔

نواب صاحب کے بڑے صاحبزادے نواب زادہ غلام حیدر خان کو گردش روزگار نے وطن چھوڑنے پر مجبور کیا اور وہ فکر معاش میں جھنگ منتقل ہو گئے۔ نوابزادہ غلام حیدر خان کو واہب العطایا نے دو صاحبزادوں سے نوازا تھا۔ نوابزادہ غازی خان اور نوابزادہ شاہ محمد خان، اوّل الذکر لاولد فوت ہوئے۔ آخر الذکر نوابزادہ شاہ محمد خان آج کل ڈیرہ غازی خان سے پندرہ میل دور ریکڑہ کے مقام پر مقیم ہیں۔ آپ کے تین فرزند ہیں نوابزادہ غلام سرور خان (سرور کربلائی) علی گوہر خان

اور شاہ نواز خان۔ اوّل الذکر سرائیکی کے قادر الکلام شاعر ہیں اور انہیں اس حلقے میں خاص مقام حاصل ہے۔ یہ خاندان انتہائی عسرت اور تنگدستی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ خاندانی جاگیر اور املاک ۳۶/۳۵ سال سے ضبط چلی آتی ہیں۔ خاندانی خودداری کے سبب یہ خاندان اپنی قومی حکومت اور حکام سے ضبط شدہ اراضی حاصل نہیں کر سکا۔ ان کی مایوس نگاہیں کسی دوسرے ڈیمز کے انتظار میں ہیں

بایدکہ مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

○

شجرہ نسب بلیدی قبائل

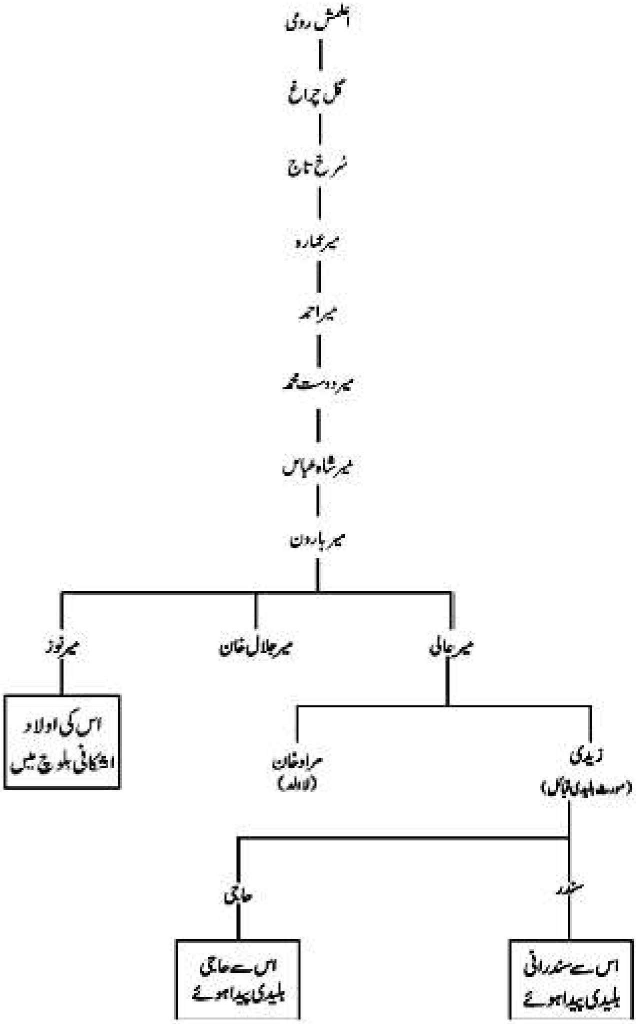

میر ہوت

فرماں روائے کیچ مکران

رند و لاشار کی جنگ و جدل چاکر اعظم کی فاتحانہ یلغار اور اس کی اولاد کی فرماں روائی کے تفصیلی حالات ناظرین کرام ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ مزاری، لغاری، کھوسہ، دریشک، قیصرانی، تکانی اور پتافی جیسے بے شمار قبائل جو چاکر اعظم کے ہمراہ سبی چھوڑ کر پنجاب کی وادی میں چلے آئے تھے۔ اب ہم پھر کیچ چلتے ہیں تاکہ میر ہوت اور اس کی اولاد کے حالات کا جائزہ لے سکیں۔

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ میر ہوت، جلال خان کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ اکثر مؤرخین کا یہی بیان ہے الحاج میر محمد بخش خان تالپور اس رائے سے اتفاق نہیں فرماتے۔ان کے نزدیک میر ہوت۔ میر جلال خان کے سب سے بڑے فرزند تھےاور والد ماجد کی وصیت کے مطابق کیچ کے حاکم بنے تھے۔ بہرحال اس میں کسی کو اختلاف نہیں کہ باپ کے انتقال کے بعد میر ہوت ہی اس مملکت کے فرمانروا بنے تھے۔

میر ہوت کے یقیناً کئی صاحبزادے ہوں گے مگر شجروں میں صرف میر عبدو معروف ہیں۔ یہ باپ کے بعد کیچ مکران کے بادشاہ بنے۔ان کے بعد میر عالی تخت نشین ہوئے کھوسخ میر عالی کے چھوٹے بھائی تھے جو کھوسہ قبائل کے مورث اعلیٰ ہیں۔

میر عالی کے کئی صاحبزادے تھے۔جن میں میر اسماعیل خان اور میر اسحاق زیادہ مشہور ہیں۔ میر ہوت خان اور خان پنل میر عالی کی چھوٹی بیگم کے بطن سے تھے اور میر صاحب کو بڑے پیارے تھے۔ان کے علاوہ ببن، چنسیر، نوت خان، کیانی خان، عمر خان، سمرا خان اور تمر خان کے نام بھی آپ کے صاحبزادوں میں ملتے ہیں۔

سسی پنوں کا معاشقہ

میر عالی کے زمانے میں کیچ بڑی رونق پر تھا۔ دنیا کے بڑے بڑے شہروں سے تجارتی قافلے آتے اور اپنا سامان فروخت کر کے ضرورت کی چیزیں خرید لے جاتے تھے۔ میر عالی کے یوں تو تمام صاحبزادے مہر و ماہ کو شرماتے تھے۔مگر پنوں خان ان سب سے زیادہ خوبصورت تھا۔ اسی زمانے میں بھنبور کی ایک حسینہ سسی کا بڑا چرچہ ہو رہا تھا۔ اگرچہ وہ ایک دھوبی کی بیٹی

تھی۔مگر حسن و جمال میں شہزادیوں کو بھی مات کرتی تھی۔جب یہ بھنک شہزادے کے کانوں تک پہنچی تو وہ اس کا غائبانہ عاشق ہو گیا۔والد کی مرضی کیخلاف تاجروں کے بھیس میں بھنبور پہنچا اور اس حسینہ سے شادی کر لی۔جب میر عالی کو اطلاع ہوئی تو وہ سخت برہم ہوئے۔انہوں نے اپنے بیٹوں کو حکم دیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو بھنبور جا کر پنوںؔ کو لے آئیں۔

پنوں کے بھائی بھنبور پہنچے اور ایک رات جبکہ وہ بے خبر پڑا سویا تھا اسے رسیوں سے جکڑ کر اونٹ پر لادا اور راتوں رات کیچ روانہ ہوئے۔سسی بیدار ہوئی تو وہ آہ و فغاں کرتی پنوں کے تعاقب میں چل پڑی۔تقریباً ایک سو میل پا پیادہ چل کر حب ندی پہنچی۔اسے عبور کر کے ریگستان میں داخل ہوئی اور پیاسی مر گئی۔ایک چرواہے نے اسے دفن کر دیا۔

ادھر پنوں جب کیچ پہنچا تو سسی کے فراق میں اس کی حالت بے حد مخدوش ہو گئی۔میر عالی نے بیٹوں سے کہا بھائی! یہ تو ہاتھ سے جاتا ہے۔فوراً واپس لے جاؤ۔چنانچہ شہزادے پنوں کو اونٹ پر سوار کر کے پھر بھنبور کو روانہ ہوئے۔جب سسی کی قبر پر سے گزرے تو پنوں چیخ کر اونٹ سے گر پڑا اور جاں بحق ہو گیا۔اسے بھی سسی کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔

کم و بیش دنیا کی ہر زبان نے حسن و عشق کے اس درخشاں باب کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔جہاں تک ہمیں معلوم ہے میر معصوم بھکری نے اسے فارسی میں ''حسن و ناز'' کے نام سے نظم کیا۔محمد شاہ شہنشاہ ہند کے زمانے میں قاضی مرتضی سورہٹی نے خاص طرز میں اس داستان عشق پر طبع آزمائی کی۔اردو زبان میں بطور مثنوی ۱۱۲۷ھ میں نواب مجیب خان نے اسے نظم کیا اور ایسے پر درد مضامین اور الفاظ پیدا کئے کہ کوئی شخص کتنا ہی سنگدل کیوں نہ ہو۔اسے سن کر زار زار رو دیتا ہے۔نواب محبوب علی خان فرمانروائے دکن کی فرمائش پر سلامیؔ نے اس واقعہ کو ''طور عشق'' کے نام سے فارسی نظم کا جامہ پہنایا۔نواب محبت خان روہیلہ نے اس معاشقے کو ''اسرار محبت'' کے نام سے اردو میں نظم کیا۔سندھ کے مشہور شاعر خلیفہ نبی بخش لغاری نے اسے

جامی کی بحر میں سرائیکی زبان میں لکھا۔ شاہ لطیف بھٹائی، شاہ عنایت نصر پوری، بھلے شاہ قصوری اور دوسرے مشائخ کے کلام میں ایسی بے شمار تلمیحات ملتی ہیں جو اس واقعہ سے متعلق عجیب معنی پیدا کرتی ہیں۔ حضرت خواجہ فرید نے تو اپنے دیوان میں جگہ جگہ آسمان عشق و محبت کے ان مہر وماہ کا ذکر کیا ہے "سسی کرہوں قطار کیچ ڈہوں ہن ہن وے" ان کا خاص شاہکار ہے۔

میر عالی اس صدمے کی تاب نہ لا سکا اور وہ جلد فوت ہو گیا۔ اس سال شدید قحط پڑا۔ خشک سالی نے کیچ کے لوگوں کو مہاجرت پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ میر عالی کا ایک لڑکا میر اسماعیل خان ملک سہراب کے ہمراہ ملتان روانہ ہو گیا۔ جہاں اسے دریائے سندھ کے کنارے جاگیر مل گئی اور اس نے وہاں ہوت ریاست کی بنیاد ڈالی۔ میر اسحاق سولہویں صدی کی شروعات میں کشمور آکر مقیم ہوا۔ اس وقت مزاری قوم کے افراد کوہ بھنبھور کے قریب پہاڑی علاقے میں آباد تھے۔ تجارتی کاروبار کے سلسلے میں وہ اکثر کشمور آیا کرتے تھے۔ مزاری قوم کا سردار بیزن اولاد نرینہ سے محروم تھا۔ جب مزاریوں نے ان کے سامنے میر اسحاق کے اخلاق کریمانہ کی تعریف کی تو انہوں نے میر اسحاق کو بلایا۔ اسے اپنے قبیلہ کا سردار مقرر کیا۔ اپنے ہاتھ سے اس کے سر پر سرداری کی دستار باندھی اور اپنی بیٹی کی اس سے شادی کر دی۔ چنانچہ موجودہ مزاری میر اسحاق ہوت کی ہی اولاد ہیں۔

میر عالی کے کئی صاحبزادے جنوبی ایران کو منتقل ہو گئے۔ چنانچہ باہو کلات میں زیادہ تر ہوت آباد ہیں۔ میر عمر خان کیچ کا حاکم قرار پایا مگر اس کی اولاد کو چار پانچ پشتوں سے زیادہ کیچ پر حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس وقت میر عمر خان کی اولاد تمپ (تربت) میں آباد ہے۔ جس کے سردار داد کریم خان ہیں۔ میر رحیم داد مولائی شیدائی دور جدید کے مکرانی ہوتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس وقت ہوت بلوچوں کا صدر مقام مکران میں تمپ ہے۔ جہاں ان کے ۴۷ خاندان

رہتے ہیں۔ تمپ کے علاوہ دشت، پلاتو، گشتا نگ اور شاہی تمپ میں بھی ہوت آباد ہیں۔ جام عالی کے قلعہ کے آثار تربت کے متصل کیچ کور (ندی) کے دائیں کنارے پر نظر آتے ہیں۔ ہوت مکران میں زرخیز زمینوں کے مالک ہیں!'' (بلوچی دنیا ستمبر ۱۹۶۰ء)

میری کے آثار

وہ قلعہ جس میں میر جلال خان اور اس کی اولاد نے کئی پشتوں تک حکومت کی ہے۔ اب ایک کھنڈر کی صورت میں زبان حال سے شوکت رفتہ کی داستانیں سناتا دکھائی دیتا ہے۔ مسٹر محمد حنیف مہر کا چیلوی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ قلعہ اندازاً ۸۰ فٹ دریا کی سطح سے اوپر چار منزلوں پر بٹا ہوا تھا۔ سب سے نچلے حصے کو ''جمار خانہ'' (لشکر کی رہائش گاہ) کہتے تھے۔ دوسری منزل میں مہمان خانہ، حکومت کے دفاتر اور عدالتیں تھیں۔ تیسری منزل انبار خانہ سے موسوم تھی۔ اس حصے میں اناج اور ہتھیار وغیرہ رکھے جاتے تھے۔ یہیں ایک بڑا تالاب بھی تھا۔ جسے بارش کے پانی سے بھرا جاتا تھا۔ نیز شاہی مسجد، جس میں میر صاحب اپنے امراء اور مہمانوں کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے۔ وہ بھی اسی منزل میں واقع تھی۔ چوتھی منزل ''حرم سرا'' پر مشتمل تھی۔ جس میں سیڑھیوں کے ذریعے پہنچتے تھے۔ (بلوچی دنیا۔ اپریل ۱۹۶۲ء)

مکران پر بلیدیوں کی حکومت

اخوند محمد صدیق کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوتوں کے زوال پر ایسا خاندان مکران پر قابض و متصرف ہوا جو ملک کہلاتا تھا۔ اس خاندان سے بلیدیوں نے تاج و تخت حاصل کیا۔

بلوچوں کا جو شجرہ رائے بہادر ہیتو رام نے تاریخ بلوچستان میں درج کیا ہے۔ اس میں میر عالی کو بلیدیوں کا مورث اعلیٰ دکھایا گیا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ میر عالی، میر جلال خان کے ہمراہ مکران نہیں آیا بلکہ سیستان سے عمان کو منتقل ہو گیا۔ میر رحیم داد مولائی شیدائی کے بیان کے

مطابق بلیدیوں کا سالار اوّل میر ابوسعید مکران کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے بلیدہ نام سے ایک ریاست قائم کی۔

بلیدہ

بلیدہ مکران میں کیچ کے شمال کی طرف دو پہاڑوں زاعمران اور کیچ بند کے درمیان سرسبز اور گلریز وادی ہے۔ جس کے بیچ دشت ندی، نازوانداز سے انگڑائیاں لیتے ہوئے گزرتی ہے۔ یہاں کی کھجوریں دنیا بھر میں مشہور ہیں اور مواضعات ذیل اس علاقے میں شامل ہیں۔ قلعہ کوشک (اقوام نوشیروانی) قلعہ بٹ، قلعہ بلیدی، قلعہ چب مزارزائی، میناز بلوچ دشت درادغ، سامی شارگ وغیرہ۔

جب اس ریاست میں بلیدیوں نے قدم جمالئے تو پھر ایک موقع پر حملہ کر کے ملکوں سے کیچ کا قلعہ بھی چھین لیا۔ اس طرح انہوں نے پورے مکران میں اپنی سلطنت قائم کرلی۔

بلیدیوں کے ۹ حکمران گزرے ہیں۔ شاہ ابوسعید، شاہ شکر اللہ، شیخ قاسم، شیخ زہری، شیخ حسین، شیخ احمد، شیخ عبداللہ اور شیخ قاسم ثانی۔

شیخ قاسم ثانی بلیدیوں کے آخری حکمران تھے اور شیخ بلار بلیدی گوادر کے امیر تھے۔ اٹھارہویں صدی یعنی ۱۷۴۰ء میں گچکی امراء نے بلیدیوں کو شکست دے کر مکران پر قبضہ کرلیا۔ مولائی شیدائی لکھتے ہیں کہ چونکہ بلار بلیدی ذکری فرقہ کے مخالف تھے۔ اس لئے مکران کے ذکریوں نے بلیدیوں کی بجائے ملک دینار خان گچکی کی حمایت کی۔ نتیجتاً ایک خونی معرکہ ہوا اور بلار بلیدی اسی جنگ میں مارے گئے۔ شیخ قاسم ثانی نے نادر شاہ سے امداد طلب کی تاکہ وہ اپنے چچا کے قتل اور بلیدیوں کی شکست کا بدلہ لے سکے۔ چنانچہ نادر شاہ نے ۱۷۳۹ء میں فوج کا ایک

دستہ شیخ قاسم کی امداد کے لئے روانہ کیا۔ مگر اس وقت ملک دینار خاصی طاقت کا مالک بن چکا تھا۔ اس نے بلیدی لشکر کو پے در پے شکستیں دیں اور ان کی کمر ہمت توڑ کر رکھ دی۔ شیخ قاسم گرفتار ہو گئے اور انہیں گوادر میں نظر بند کر دیا گیا۔ بلیدیوں نے غلامی کی زندگی پر مہاجرت کو ترجیح دی اور وہ کیچھ اور ایرانی مکران کے بلیدی قصر قند کو منتقل ہو گئے۔ مکران کے بلیدیوں کی شاہان مسقط سے رشتہ داریاں تھیں۔ چنانچہ بلیدی حکمران خاندان کی ایک بلوچ خاتون بی بی مریم کو بیسویں صدی تک مسقط سے برابر وظیفہ ملتا رہا۔ ۱۹۲۳ء میں عمان اور اس کے پایہ تخت مسقط میں بلوچوں کی آبادی بیس ہزار کے قریب تھی اور اب وہ یقیناً لاکھوں تک پہنچ چکی ہو گی۔

بلیدیوں کے عروج و اقبال کی صحیح تاریخ کا معلوم کرنا بے حد مشکل ہے۔ آثار قدیمہ کے ماہروں نے سامی سے جو کتبے برآمد کئے ہیں ان میں شیخ عمر اور باہو کے نام کندہ ملے ہیں۔ انہی کتبوں میں شیخ زہری کا بھی ذکر ہے۔ جن کی تربت گوادر میں ہے۔ کرنل راس کے بیان کے بموجب ان کتبوں پر ۱۱۴۲ھ درج ہے۔

بلیدیوں کی نشاۃ ثانیہ

جب میر چاکر خان اپنے قبائل کو جلو میں لئے ہرے بھرے میدانوں کی تلاش میں سبی کی طرف روانہ ہوئے تو بلیدی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ رند لاشار کی مشہور عالم جنگ میں میر ہیبتان بلیدی نے اپنے رزم آزما جوانوں کے ہمراہ میر چاکر خان کے پہلو بہ پہلو داد شجاعت دی۔ میر چاکر نے خوش ہو کر انہیں بالاناڑی کی جاگیر عنایت کی جس کی حدود تلی، بارکھان اور بگٹی پہاڑوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔

شجرۂ نسب سرداران گچکی

(فرمانروایانِ مکران)

ملک دینار

(مکران کا پہلا فرمانروا)

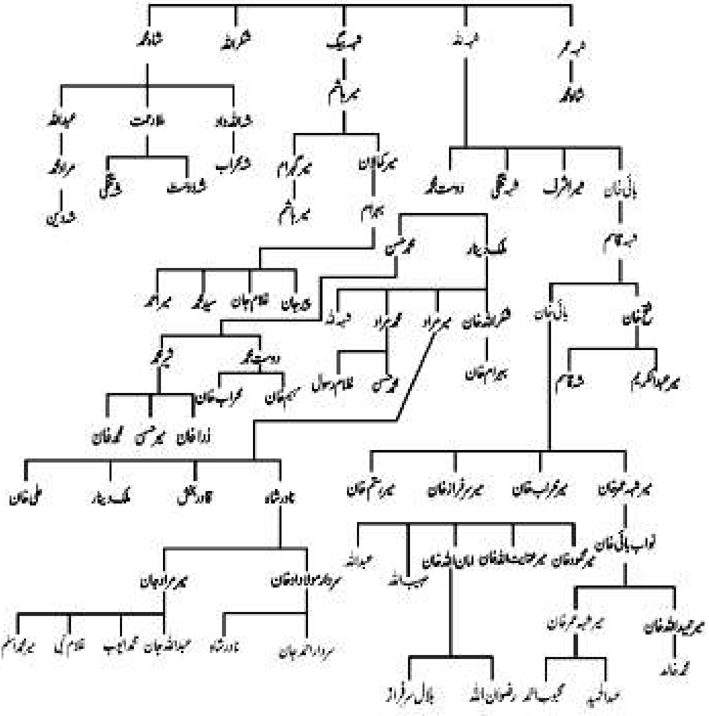

مکران پر گچکی سرداروں کا قبضہ

گچکی سردار گچک پنجگور کے رہنے والے تھے۔ ان کے سربراہ ملک دینار خان نے شہ بلار بلیدی کو شکست دے کر گوادر اور کیچ پر قبضہ کرلیا۔ شہ بلار کے بھتیجے شیخ قاسم ثانی نے نادر شاہ سے امداد طلب کی۔ بادشاہ نے تکی بیگ کے زیر کمان ایک لشکر جرار ملک دینار پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ دشت میں خونریز جنگ ہوئی۔ ملک دینار نے جب دیکھا کہ نادری فوجوں سے بزور شمشیر عہدہ برآ ہونا مشکل ہے تو وہ جنگی چال کے تحت رجعت قہقری کرتا ہوا میری میں قلعہ بند ہو گیا اور خندق کو پانی سے بھروا کر اوپر بھوسہ بچھوا دیا۔ اس طرح دیکھنے والوں کو خندق کا وہم وگمان بھی نہ ہوا اور اپنی فوج کے ایک دستہ کو حکم دیا کہ ایرانی لشکر سے برائے نام ٹکر لے کر جلد واپس بھاگ آئیں۔ تا کہ دشمن کا لشکر تعاقب کرتا ہوا خندق میں پھنس جائے۔ ملک دینار کا یہ منصوبہ ایسا کامیاب ہوا کہ بہت سے ایرانی اس دھوکے میں آ کر مارے گئے۔ تاہم ایرانی فوج نے محاصرہ نہ چھوڑا۔ انجام کار ملک دینار نے بادشاہ سے صلح کرلی اور ایرانی فوجیں تحفے تحائف لے کر رخصت ہوگئیں۔ ملک دینار کے بعد ان کا صاحبزادہ شیخ عمر مکران کا حکمران ہوا۔ بلیدیوں نے ایک دفعہ پھر پوری شدت سے حملہ کیا۔ جس پر شیخ عمر نے خان اعظم میر نصیر خان سے امداد طلب کی اور ملک کا نصف محصول دینے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ خان اعظم کی مدد سے بلیدیوں کو شکست ہوئی اور اس دن سے مکران کا نصف حصہ خان اعظم کے تصرف میں آ گیا۔

گچکی شجرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر عیسیٰ، ملک دینار کے بھتیجے تھے۔ وہ پنجگور پر قابض رہے چنانچہ اب تک پنجگور، سامی اور شاہرک پر ان کی اولاد کا تصرف چلا آتا ہے۔

ملک دینار کی اولاد علاقہ کیچ پر حکمران رہی۔ اس ملک میں جو بلوچ تمنات آباد تھے۔ ان

سب نے گچکی سرداروں کی اطاعت قبول کرلی۔ میر خداداد خان والی قلات نے گچکی خاندانوں میں دو شادیاں کیں۔ ایک سردار اعظم خاں کی دختر سے جس کے شکم سے میر اعظم جان پیدا ہوئے۔ دوسری شادی سردار عیسیٰ خان کی صاحبزادی بی بی مریم سے کی۔ اسی طرح خوانین قلات نے سرداران گچکی کو رشتے دے کر رابطہ اتحاد کو زیادہ پختہ کرلیا اور گچکی و خوانین قلات یک جان دو قالب ہو گئے۔ انگریزی دور میں کچھ عرصہ تک سر رابرٹ سنڈیمن نے مکران پر حاکمانہ اقتدار قائم رکھا۔ زاں بعد اسے خان اعظم کی سرداری میں دے دیا۔

اخوند محمد صدیق لکھتا ہے کہ میر خداداد خان خان اعظم کے وقت سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ نواب گچکی مکران کا ناظم اعلیٰ تصور ہوتا اور نائب ناظم کا تقرر خان اعظم کرتے تھے۔ چنانچہ خداداد خان نے سردار فقیر محمد بزنجو کو جو اپنی قوم کا سردار تھا اور کافی طاقتور تھا کیچ کی نیابت پر مقرر کیا تھا۔ اس کے بعد میر شہداد گچکی کو یہ منصب تفویض ہوا۔ جب پاکستان معرض وجود میں آیا۔ اس وقت نواب بائی خان ناظم مکران تھے اور خان معظم میر احمد یار خان کی طرف سے میر عبدالکریم خان نائب ناظم تھے۔

کتابیات

اس کتاب کی تدوین میں درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

کتاب کا نام	مصنف	کتاب کا نام	مصنف
انساب الاشراف	البلاذری	فتوح البلدان	البلاذری
تاریخ بغداد	الخطیب البغدادی	مروج الذہب	المسعودی
البرامکہ	مولانا عبدالرزاق	تاریخ سندھ	مولانا عبدالحلیم شرر
مجموعۃ التواریخ	نورالدین عوفی	مقدمہ تاریخ ہند	مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی
تاریخ عالم اسلام	محمد صادق حسین صدیق (حالات بویہ سلاطین)	ازمنۂ بلوچ	میر خدابخش بجارانی
قدیم بلوچی شاعری (ترجمہ)	میر خدابخش خان بجارانی مری	پاپولر پوئٹری آف بلوچیز	مسٹر ایل ڈیمز
دی بلوچ ریس	مسٹر ایل ڈیمز	بلوچ قبائل (ترجمہ)	سید کامل القادری
تاریخ ہند	مولوی ذکاء اللہ	منتخب اللباب	خافی خان
طبقات اکبری	ملا نظام الدین	آئین اکبری	ابوالفضل
تذکرہ رؤسائے پنجاب	مسٹر گریفن	تاریخ بلوچاں	سردار غلام رسول خان کورائی
تاریخ بلوچستان	رائے بہادر ہیتو رام	گل بہار	رائے بہادر ہیتو رام

آثرعالمگیری	محمد ساقی مستعد خان	رقعات عالمگیری	اورنگزیب عالمگیر مطبوعہ اعظم گڑھ
سیر المتاخرین	غلام حسین طباطبائی	تاریخ سندھ	محمد معصوم بکھری
ماثر الکرام	غلام علی آزاد بلگرامی	تاریخ بلوچستان	میر گل خان نصیر
تاریخ بلوچستان	ملک صالح محمد لہڑی	تاریخ بلوچستان	اخوند محمد صدیق
ٹاڈ راجستھان	مسٹر ٹاڈ	شجرات فرمانروایان اسلام	مسٹر لین پول (ترجمہ مرزا علی حسین)
ہمارا کاروان	عبدالرحمن کرد	تاریخ شیر شاہی	عباس خان سروانی
ترخان نامہ	سید میر محمد ٹھٹھوی	ارض القرآن (وادی سبا)	سید سلیمان ندوی
سوانح بلقیس	محمد سرور خان نشاط	سفر نامہ خسروؒ	ناصر خسروؒ (متوفی ۱۰۵۷ھ)
سیاحت نامہ بلوچستان	سرہنری پوٹنگر	مختصر تاریخ بلوچستان	میر رحیم داد خان مولائی شیدائی
شاہ نامہ ایران	ملک الشعراء بہار	شاہ نامہ عجم	فردوسی
آئینہ بلوچ	پروفیسر انور رومان	تذکرہ حمیدیہ	شیخ شہر اللہ لنگاہؒ
تاریخ جلیلہ	پیر غلام دستگیر نامی	تاریخ مبارک شاہی	یحییٰ بن احمد
محاصرہ عذر دہلی کے خطوط	خواجہ حسن نظامیؒ	دہلی کی سزا	خواجہ حسن نظامیؒ
داستان عذر	ظہیر دہلوی	غالب کا روزنامچہ	خواجہ حسن نظامیؒ

تاریخ روضۃ الصفا	میرخواند، تہران ۱۳۳۹ھ	بابرنامہ	ترجمہ خانخاناں۔ بمبئی ۱۳۰۸ھ
ہمایوں نامہ	گلبدن بیگم	تحفۃ الکرام	میر علی شیر قانع
روضۃ السلاطین	فخری ہروی	تاریخ طاہری	طاہر ٹھٹوی
واقعات دارالحکومت دہلی	بشیر الدین احمد	احسن البیان	سردار محمد حیات خان بیدار
اسلامی ہند	نیاز فتح پوری	عجائب الاسفار	ابن بطوطہ
وقائع راجستھان	حکیم نجم الغنی	تاریخ ہند	ملا نظام الدین احمد چشتی
تاریخ ڈیرہ اسماعیل خان	منشی چرنجیت لعل	کتاب الاغانی	ابوالفرج اصفہانی
ڈیرہ اسماعیل خان گزیٹر	--------	بریف ہسٹری آف ڈسٹرکٹ میانوالی	--------
مکران گزیٹر	--------	ہسٹری آف بلوچ ریس اینڈ بلوچستان	محمد سردار خان گشکوری
--------	--------	ہسٹری آف سندھ	مسٹر ایلیٹ
دی کنٹری بلوچستان لسبیلہ	اے ڈبلیو ہیوجز	امپیریل گزیٹر آف انڈیا	آر۔ ہیوجز۔ بُلر
گزیٹر آف خاران	سی۔ ایف منچن	گزیٹر صوبہ سندھ	اے ڈبلیو ہیوجز

محمڈن ڈائنسٹیز	لین پول	ہسٹری آف دی منگولز	مطبوعہ لندن ۱۸۷۶ء
دی منگولز اینڈ رشیا	مطبوعہ لندن ۱۹۵۳ء	فورسٹڈیز آن دی ہسٹری آف سنٹرا یشیاء	مطبوعہ لندن (۶۲_۱۹۵۶ء)
دی مغل ایمپائر	مسٹر پراوڈین مطبوعہ لندن ۱۹۶۱ء	دی رائیز آف چنگیز خان اینڈ ہز کنکوئسٹ آف نارتھ چائنا	ایچ ڈی مارٹن بالئی مور ۱۹۵۰ء
بابر	ایچ لیمب مطبوعہ لندن ۱۹۶۲ء	نوٹس آن دی سٹی آف ہرات	مسٹر ییٹ ۱۸۸۷ء
رنجیت سنگھ	گرفن	ایڈ منسٹریشن آف سندھ	سر چارلس نیپئر مطبوعہ لندن ۱۸۵۱ء
انسائیکلو پیڈیا برٹینکا ایڈیشن	XI	جان جیکب	مسٹر الیگزنڈر مطبوعہ ۱۹۰۱ء
سیاحت نامہ گرتھن گیری	مطبوعہ لندن ۱۸۷۸ء	دی انڈین بارڈ رلینڈ	کرنل تھامسن بنگرفورڈ ہالڈچ
دی ورلڈ آف ٹوڈے	ہوپ اے آر منچیف	طبقات کبیر	محمد بن سعد کاتب الواقدی
تاریخ طبری	محمد بن جریر الطبری	ابن اثیر	--------
ابن کثیر	--------	اصطخری	--------

الادریسی	---------	یاقوتی	---------
المقدسی	---------	ابن حوقل	---------
علامہ بشاری	---------	ابن خلکان	---------

ممتاز اہل قلم

جنہوں نے ''بلوچی دنیا'' میں بلوچ تاریخ پر مضامین لکھے:۔

مولانا عبداللہ دیر مانی، مولانا عبدالصمد سر بازی، میر محمد بخش خان تالپور، میر رحیم داد خان مولائی شیدائی، بلوچ عبدالغفار خان ایڈووکیٹ، سید کامل القادری، عبدالصمد امیری، عبدالقادر خان لغاری، میر محمد حسین عنقا، ڈاکٹر میر عالم راقب، پروفیسر انعام الحق کوثر، ملک محمد رمضان بلوچ، محمد حنیف مہر کا چیلوی، غلام حسین خان جتوئی، فیض محمد واڈیلہ، میر مٹھا خان مری، عبدالرحمن غور، صاحبداد رند، محمد اسماعیل احمدانی۔

تالپور امراء

سندھ کے بلوچ فرمانروا

تالپور، ہوت بلوچوں کا وہ ممتاز قبیلہ ہے جس نے ۶۳ سال تک سندھ پر بڑے جاہ وجلال سے حکومت کی اور اپنے دور اقتدار میں وادئ سندھ کو رشک فردوس بنا دیا۔ انگریزوں نے اگرچہ دھوکہ اور فریب سے اس خاندان کو تخت وتاج سے محروم کر دیا لیکن سیاسی معاشی اور اخلاقی اعتبار سے آج بھی یہ خاندان پورے سندھ پر حکومت کر رہا ہے۔ چند عنوانات درج ذیل ہیں:۔

شجرہ ۔تالپوروں کی ڈیرہ سے مہاجرت، میر شہداد (شہداد پور) میر بہرام خان تالپور، میر فتح خان تالپور کا حملہ، میر بجار خان تالپور، میر عبداللہ خان تالپور، تالپوروں کی حکومت، ریاست حیدرآباد۔

میر فتح علی خان تالپور، پہلی چویاری، میر غلام علی خان تالپور، میر کرم علی خان تالپور، میر مراد علی خان تالپور، میر نور محمد خان تالپور، دوسری چار یاری، میر نصیر خان تالپور، گدو بندر پر حملہ، انگریزوں کی وحشیانہ حرکتیں، حیدر آبادی میروں کی نظر بندی، ایام اسیری، وفات، حیدر آباد کے موجودہ تالپور امراء۔

ریاست میرپور خاص کے تالپور حکمران۔سقوط حیدر آباد کا ردعمل، معرکۂ شہداد پور، ایک اور جنگ، سکھوں کی بربریت سے تنفر، سر ہنری لارنس کا مشورہ، شیر سندھ کے لمحات آخر۔

ریاست خیر پور۔میرس کے تالپور امراء، میران سندھ کے عہد پر ایک نظر، تالپوری دربار کی ایک جھلک۔